

UrduPhoto.com

ناولٹ

پہلا حصہ

کچی گاڑوٹ گئی

میمونہ خورشید علی

نماز فجر کے بعد وہ باڑے میں آگئی جہاں چندو اور رانی جگالی کر رہی تھیں۔ میتو ابھی اونگھ رہا تھا۔ اس نے چندو کی رسی کھول دی پھر میتو کی کمر پر دھپ لگائی وہ چاروں ناگوں پر کھڑا ہو گیا..... وہ تینوں جانوروں کو

باڑے سے باہر لے آئی۔
 بڑے سے صحن میں ایک طرف پانی کا موٹا سا ٹل لگا ہوا تھا۔ جب کھیتوں کے لیے پانی کھلتا تو اس ٹل میں بھی بھل بھل پانی آ جاتا۔ جس سے وہ سارے ہی کا

روحا، ماں بیٹے کا ڈراما بہ آسانی سن رہی تھی پھر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی جب اس سے کسی مسئلے کا حل نہیں نکل پاتا تو وہ رونے بیٹھ جاتی تھی تب ڈیڈی اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر اس کے قریب ہو جاتے۔ اسے سمجھاتے، دلاسا دیتے۔ اب بھی اسے ایسی ہی دلجوئی کی ضرورت تھی جو اسے ہمہ وقت دستیاب رہتی تھی۔ اسے ڈیڈی یاد آ رہے تھے۔ کمال حیرت کی بات تھی اسی وقت سیٹھ عماد الدین کا فون نمبر اس کے سیل فون پر چپکنے لگا۔ روحا کا دل بھرا آیا۔

”ڈیڈی کو ضرور پتا چل گیا ہو گا کہ ان کی بیٹی اس وقت کس تکلیف سے دوچار ہے۔“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے فون اٹینڈ کیا۔

”روحا بیٹی..... کیا کر رہی ہو تم..... کچھ کھایا پیا ہے یا بھوکی، پیاسی بیٹھی ہو۔ اتنی سخت گرمی ہو رہی ہے تمہارے کمرے میں اے سی آن ہے اگر نہیں ہے تو آن کر لو اور یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی، تمہارے لیے کیا بھیجوں.....؟“ عماد الدین کی یہ روز کی روٹین تھی۔ وہ بیٹی کے حال احوال، کھانے پینے، لینے، سونے تک کے معمول کی خبر گیری رکھتے جب تک روحا کے لیے کے ایف سی سے کچھ نہ کچھ بھیج نہ دیتے خود کھانا نہ کھاتے۔ روحا کا موڈ ہوتا تو فاسٹ فوڈ منگوا لیتی ورنہ رائس چکن کی فرمائش تو اس کی روز ہی ہوا کرتی تھی اسے ارشاد بیگم کے گھر کا کھانا بالکل پسند نہیں آتا تھا۔ ایک تو یہ کہ یہ لوگ ابھی تک گھی کا استعمال کرتے تھے۔ دوسرے گائے کا گوشت اور لال مریچ جو روحا نے اپنے باپ کے گھر میں کبھی نہیں کھائی تھی۔ آلو گوشت یہاں معمول کے کھانے میں شامل تھا جب کہ سرخ شوربے میں تیرتے آلو اور بوٹیاں دیکھ کر اسے قے آنے لگتی تھی اور اسی وجہ سے عماد الدین بیٹی کو دونوں وقت کا کھانا معمول سے بھیجا کرتے تھے۔ جس پر ارشاد بیگم کو تاؤ تو بہت آتا تھا لیکن..... ارشاد بیگم کچھ نہیں کہتی تھیں کیونکہ ارشاد بیگم اپنے گھر کا کھانا پینا فقط روحا کی وجہ سے تو تبدیل نہیں کر سکتی تھیں اور ویسے بھی ارشاد بیگم کا خیال تھا سیٹھ عماد

سے نہیں دینا چاہیے تھا۔ میری خاموشی کا آپ سب نے فائدہ اٹھایا اور ایک، ایک کر کے سب مجھ پر حاوی ہوتے چلے گئے۔“

”خاموش اور تم..... وہ کس زمانے کی بات ہے، تم نے تو گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی علیحدگی کا مطالبہ کر دیا تھا کیونکہ تمہارے باپ نے جہیز ہی بہت دے دیا تھا تمہیں..... اور ہماری اس کٹیا میں وہ لاکھوں کا قیمتی سامان کہاں سما سکتا تھا۔ کہہ دینا اپنے باپ سے تمہیں لے کر جائے تو ساتھ اپنا پھٹا پھٹا سا سامان بھی یہاں سے اٹھاتا دکھائی دے..... میرا گھر اس کا ٹھکباڑ کے لیے نہیں ہے۔“

”ہونہ..... کبھی دیکھا تھا ایسا کچھ..... اتنی قیمت تو اس گھر کی نہیں ہوگی جتنی میرے سامان کی ہے۔“ یہ بات ارشاد بیگم کے کلیجے میں تیر کی طرح لگی اور وہ غصے سے سر تاپا کانپ گئیں۔

”تو جس باپ کی دولت پر گھمنڈ کر رہی ہے ناں۔ اب وہی تجھے اس سامان کے شان شان مکان لے کر دے گا۔ میرے جیتے جی نہ تو اس گھر میں گھسے گی اور نہ ہی تیرا یہ کاٹھ کباڑ کیونکہ یہ گھر ارشاد بیگم کا ہے اور ارشاد بیگم جو کہتی ہے وہ کر کے دکھاتی ہے۔ تم باپ بیٹی کا غرور مٹی میں نہ ملایا ہو تو میرا نام بھی ارشاد بیگم نہیں۔“ ارشاد بیگم بری طرح چلا رہی تھی۔ فرزان کو ماں کی طبیعت کی فکر لاحق ہوئی تو وہ تیزی سے ماں کی طرف بڑھا۔

”ماما..... آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی پلیر خود کو سنبھالیں۔“

”میں کہتی ہوں فرزان..... اسے میری نظروں کے سامنے سے غائب کر دو ورنہ میں اسے جان سے مار ڈالوں گی..... جس روز سے یہ گھر میں داخل ہوئی ہے اس نے گھر کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے نہ جانے اس کے کیا عزائم ہیں۔“ فرزان ماں کو ان کے کمرے میں لے گیا۔ ارشاد بیگم کی آوازیں روحا کو بہت دیر تک آتی رہیں۔ فرزان ماں کی دلجوئی کرتا رہا۔ وہ روحا کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

”بھائی کہہ رہے تھے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ارشاد بیگم بستر سے اتریں اور جوتیاں کھینچتی ہوئی فرزان کے کمرے میں پہنچ گئیں جہاں فرزان صوفے پر نیم دراز آنکھوں پر بازو رکھے ہوئے عم تہائی منار ہاتھا۔ بیٹے کو یوں گم صم پا کر ارشاد بیگم کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ زبردستی آنکھوں میں آنسو بھر کر بیٹے کے سر ہانے جا پہنچیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”یہ تیری عمر یوں عم و فکر اٹھانے کی نہیں ہے، اس عورت نے تجھے روگ لگا دیا ہے۔ نہ جانے یہ چاہتی کیا ہے؟“ یہ کہہ کر ارشاد بیگم بھبک، بھبک کر رونے لگیں۔ فرزان فکر مندی سے بیٹھ گیا۔ ارشاد بیگم اس کے پہلو میں آ بیٹھیں اور بیٹے سے ہمدردی بھرتے ہوئے بولیں۔

”میں دن رات اس کی سوکوتا ہاں برداشت کرتی ہوں..... صرف تیری خاطر کہ تیرا گھر بسا رہے لیکن اس کا گھمنڈ ہے کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اپنے باپ کی دولت کے سامنے وہ ہمیں کیڑا ٹکڑا سمجھتی ہے، ہمارے گھر کا کھانا نہیں کھاتی۔ کھانا تو کھانا یہاں کا پانی بھی نہیں پیتی۔ باپ منزل وائر کی بوتلیں بھیجتا ہے۔ اسی کا پانی پیتی ہے۔ ہر وقت موبائل فون اس کے کان سے لگا رہتا ہے۔ آخر ہم نے بھی اپنے میٹھیوں کو جہیز میں موبائل فون دے رکھے ہیں۔ یوں پل، پل کی خبر تو کوئی نہیں رکھتا اور تم نے دیکھا نہیں ہر وقت اپنی جہیز کی چیزوں پر نندیدوں کی طرح پہرہ جمائے رکھتی ہے۔ کراکری میں کوئی ایسا برتن نہیں جو پاکستانی ہو۔ سب انگلینڈ اور جاپان سے آئے ہوئے ہیں۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں کرنے کی ہیں۔ ایک پانی کے سیٹ کی اوقات ہی کیا ہے۔ سمیرا کی دوستیں آئی تھیں۔ وہ الماری سے برتن نکالنے لگی تو اسے اچھا خاصا لے کر سنا دیا کہ اس کی کراکری کتنی قیمتی ہے۔ سمیرا اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔ میں تو یہ معمولی، معمولی سی باتیں تم سے کرتی بھی نہیں خواہ مخواہ تمہیں ذہنی دباؤ ہو گا۔ میرے بچے ہی کتنے ہیں۔“ ارشاد بیگم نے پھر سے رونا شروع کر دیا۔

فرزان، ماں کی باتوں پر بیوی سے بدظن ہونے لگا۔ ”کیوں..... کیوں کیا تھا اتنے بڑے گھرانے

آخر کتنے دن بیٹی کے چونچلے اٹھائیں گے بلا آخر سے کسی کچھ کھانا پڑے گا جو یہاں پکتا ہے۔“ ”روحا بیٹی، چپ کیوں ہو، بولتی کیوں نہیں؟“ ”میں بیٹی کی خاموش سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ روحا نے خود پر ضبط کیا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

”میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں کس تکلیف سے بیمار ہوں لیکن میں آپ کو نہیں بتاؤں گی تو کسے بتاؤں گی۔ آپ کے سوا دنیا میں میرا ہے ہی کون.....؟“ ”روحا نے سسکاری بھری تو عماد الدین کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔“ ”روحا کیا بات ہے بیٹا..... رو کیوں رہی ہو.....“ ”کیا بات ہے؟“

”بس آپ مجھے فوراً گھر بلا لیں۔ میں وہیں آ کر کچھ بتا سکتی ہوں۔ اب میں اس گھر میں مزید نہیں رہتی۔“

بیٹی کے یہ الفاظ عماد الدین کے لیے کسی بھالے سے کم نہیں تھے۔ وہ روحا کو بلانے کے لیے بے چین ہو گئے اور انہیں چین بھی کہاں تھا جس روز سے بیٹی کی زندگی کی تھی بے اطمینانی نے ان کی روح کو گھائل کر رکھا تھا۔ بار بار انہیں ایسا لگتا جیسے انہوں نے اپنی لخت جگر کو جان بوجھ کر کنویں میں ڈھکیل دیا ہے پھر مشیت ایزدی کے سامنے سر خم کر لیتے اور خود کو تسلی دینے لگتے مگر تسلی بھی یہ چیز تھی ہونے ہی نہیں پاتی تھی۔ روز بروز روحا کے گرد حالات بگڑ رہے تھے اور آج روحا نے کیا کہہ دیا کہ وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے فوراً یہ روکو بھیجا کہ وہ روحا کو پل بھر میں لے آئے۔

”چلی گئی منحوس.....؟“ ارشاد بیگم نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”جی ماما، بھابی چلی گئیں۔“ ”خبردار جو اسے بھابی کہا۔“

”اما ذرا آہستہ بولیں..... بھائی اپنے کمرے میں ہیں۔“ ”بائیں..... فرزان اپنے کمرے میں ہے، کیا وہ آفس نہیں گیا؟“

میں میرا رشتہ.....؟“ وہ تھک ہار کر ماں سے شکوہ کر بیٹھا۔ ارشاد بیگم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ غصہ تو انہیں بہت آیا لیکن فی الوقت ضبط سے کام لیا۔

”کتنا بڑا گھرانہ ہے..... کیا برصغیر کے وائسرائے کے ہاں کر دیا تھا میں نے تمہارا رشتہ؟“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا ماما.....“ فرزان گڑبڑا سا گیا۔

”مطلب وطلب چھوڑو..... ہمارے سامنے تو ان کی ایک کوڑی کی بھی حیثیت نہیں ہے۔ بس تم ہی خواہ مخواہ دبتے رہتے ہو..... مجال ہے جو تمہارے منہ سے کوئی لفظ نکل جائے۔ ایسی بھی وہ کوئی حور پری نہیں مگر نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے..... ڈیڑھ سال میں اسے دبا ہی نہیں سکے مجھے تو ایسا لگتا ہے تمہارے اوپر کوئی علم کروا رکھا ہے اس نے۔ جیسی تو تم ہر وقت چپ سادھے رکھتے ہو ورنہ عورت کی کیا مجال کہ شوہر کی اجازت کے بغیر دہلیز بھی پار کر لے ضرور کچھ نہ کچھ ہے..... آج میں تمہیں اپنے سرکار کے ہاں لے کر جاؤں گی۔ بہت دن ہو گئے اس گاڑی کو گھینٹے گھینٹے۔ شاہ صاحب کی کچہری میں اپنا مقدمہ پیش کروں گی۔ ان کی دعا دنیا کے ہر طبیب سے بہتر ہے۔ چلو اٹھو کھانا کھا لو پھر چلتے ہیں، فرزان کا دل سخت مایوسی میں گھرا ہوا تھا وہ ماں کے حکم پر چپ چاپ ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ شاید شاہ صاحب ایسا کوئی حل بتا دیں کہ اس کا گھر بس جائے اپنی طرف سے تو اس نے لاکھ کوشش کر ڈالی تھی کہ روحا اس گھر میں رہے اور اس کی ماں کی پسندیدہ ہستی بن جائے مگر ارشاد بیگم کی پسندیدہ ہستی بننا معمولی نہیں تھا۔ اس کے لیے روحا کو اپنی ہستی مٹانا بھی مگر روحا کیسے اپنی ہستی مٹا سکتی تھی۔ وہ کوئی معمولی گھرانے کی بیٹی نہیں تھی، وہ سینٹھ عماد الدین کی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی تھی۔ جس نے نہ صرف آسائشوں میں آنکھ کھولی تھی بلکہ باپ کی خصوصی توجہ اور محبت بھی ہمہ وقت پائی تھی۔ روحا کی ماں اس کی پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی گلے کے کینسر میں گرفتار ہونے کی وجہ سے جلد ہی خالق حقیقی سے جا ملی تھیں حالانکہ عماد الدین نے علاج کرانے میں کوئی کسر

نہیں چھوڑی تھی لیکن کینسر جیسا جان لیوا مرض شبانہ کی جان لے کر ہی نکلا۔

دوست احباب سبھی نے عماد الدین کو دوسری شادی کرنے پر رضامند کرنا چاہا تھا لیکن روحا کی خاطر وہ انکار کرتے رہے۔ حالانکہ مسئلہ روحا کا ہی تھا۔ عماد بیٹی کو کتنا ناگم دے سکتے تھے کیونکہ وقت کے ساتھ، ساتھ بیٹیوں کو ماں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے لیکن عماد الدین نے ثابت کر دیا کہ ماں اور باپ دونوں کی توجہ اپنی بیٹی کی دی اور دوسری شادی نہیں کی جس کی وجہ سے باپ، بیٹی ایک دوسرے کے عادی ہو گئے۔ روحا کو بھی باپ سے اتنی ہی محبت تھی۔ عماد الدین نے بیٹی کو ہر آسائش، ہر آرام دیا۔ ہر خواہش پوری کی لیکن اس کی شخصیت کی مکمل تعمیر نہ کر سکے۔

جب شادی کا مرحلہ آیا تو ارد گرد ایسا جوڑ کا رش نہیں تھا جو عماد الدین مطمئن ہو جاتے۔ وقت گزر رہا تھا اور وہ بے چین تھے۔ ایسے میں فرزان کا رشتہ انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ یہ رشتہ ان کے کسی دوست کے توسط سے آ تھا۔ فرزان بظاہر اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا مالی اعتبار سے بھی ان کی صحیح پوزیشن تھی۔ فرزان کا اپنا ذاتی سی این جی پپ تھا۔ جس کی اچھی خام آہنی تھی۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی رہائش تھی ان کے علاقے میں تھی۔ بے شک گھر اتنا جدید نہ تھا لیکن مال اور رقبے کے لحاظ سے قیمتی تھا۔ اس کے علاوہ حیات جو کہ فرزان کے والد مرحوم تھے انہیں جو اپنے باپ کی طرف سے وراثت ملی تھی وہ ایک بھی ایک وسیع و عریض جگہ تھی۔ جس پر حیات محمد نے اپنی زندگی میں ہی اس کی تعمیر کروایا تھا۔ جس کی آدھی فیصد آمدنی کرایے صورت میں گھر میں آ رہی تھی جو اچھی خاصی معقول تھی جس سے ارشاد بیگم گھر کا کھلا خرچ اٹھاتی تھیں۔ عماد الدین نے بیٹی کا رشتہ طے کرتے ہوئے رشتے کو دولت کے پیمانے میں تو لایا تھا جو ان کے برابر سہی لگ بھگ ضرور تھا مگر وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ ارشاد کس خصلت اور فطرت کی عورت ہیں۔ وہ ارشاد کو جانچ بھی کیسے سکتے تھے کیونکہ ان کے گھر میں تو خواہ

موت نہیں تھی جو ارشاد بیگم سے میل جول بڑھا کر یہ ہاں پاتی کہ ان کے گھر کا ماحول کیسا ہے۔ ارشاد بیگم کا اپنے بچوں کے ساتھ رہن سہن اور پرہیزگیا ہے۔ انہیں ارشاد بیگم بلند حوصلہ عورت ہی لگی تھیں جنہوں نے خاوند کے بغیر بچوں کی تربیت اور پرورش کی تھی۔ عماد الدین کو لگتا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہے ارشاد بیگم کی ملکیت اور نام

ارشاد بیگم کا سب سے بڑا بیٹا غیور احمد جو اپنے ہی بچوں کے ساتھ علیحدہ زندگی گزار رہا تھا۔ غیور احمد کا لگا تھا یا ارشاد بیگم نے نکالا تھا۔ یہ کبھی وہ نہیں جان سکتے تھے کہ وہ کس کس قسم کی حالات میں زندگی گزار رہا تھا۔ ارشاد بیگم کو خود جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو لوگوں کو یہی کہتی تھی کہ اس کی بیوی غریب تھی۔ غیور نے اس کے بہکاوے میں آ کر ماں کی نافرمانی کی ہے اس لیے وہ اپنے بیٹے کو قیامت تک معاف نہیں کریں گی۔ وہ اس کی اور کشائش کا شکار ہے ارشاد بیگم اچھی طرح جانتی تھیں کہ غیور ان کے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ دور کے بعد ارشاد بیگم کی دو بیٹیاں تھیں جو اپنے گھر میں خوشحال رہ رہی تھیں۔ بقول ارشاد بیگم ان کی سرکار کی دعا سے وہ خوش تھیں۔ بیٹیوں کے بعد ان کا ہر پھر سمیرا اور ظہور تھے جو ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔



کرے میں بیٹھے، بیٹھے فرزان اوب گیا تھا لیکن ان کی ماں بولی اور نظریں بچھائے شاہ صاحب کے گھر میں بیٹھی تھی اور وہ اسی انتظار میں ابھی اور بھی بیٹھ رہی تھیں لیکن شکر تھا کہ شاہ صاحب تشریف لے آئے ان کا بھاری بھر کم وجود اور بارعب چہرہ..... ایک ال ال فرزان نے نگاہیں جھکا لیں جب کہ ارشاد بیگم نے ہی نظریں جھکائے بیٹھی تھیں۔

انہیں انتظار کرنا پڑا لیکن میں ذرا مصروف تھا کہ منہ اٹھا کر تو چلے آتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ انسان ہیں۔ ہمیں بھی محنت کرتے ہوئے خون کا پڑنا ہے۔ سب کو اپنے مطلب کی غرض ہوتی

ہے کوئی ہمارا بھلا نہیں سوچتا۔“ شاہ صاحب غصے میں تھے۔

”بد بخت لوگ سمجھتے نہیں شاہ صاحب.....!“

ارشاد بیگم بڑے دھیمے اور عاجزانہ لہجے میں بولی تھیں۔ شاہ صاحب نے اچھتی سی نگاہ ارشاد بیگم اور ان کے بیٹے پر ڈالی پھر اپنی سیاہ چادر درست کرتے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔

”کیا مسئلہ ہے کیوں آئی ہو.....؟“ ارشاد بیگم نے عاجزی سے شاہ صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور سر جھکا کر بولیں۔

”شاہ صاحب میں بہت پریشان ہوں..... میری پریشانی کو دور کر دیجیے۔“ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولیں تو شاہ صاحب یکدم طیش میں آ گئے۔

”سب پریشانیوں کا حل اس کے پاس ہے..... ہم تو اس کی بارگاہ میں صرف درخواست پیش کرتے ہیں۔“ ارشاد بیگم سنبھل گئیں اور خوشامدی انداز میں بولیں۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی شاہ صاحب میں دراصل ذہنی طور پر اس قدر دباؤ میں ہوں کہ بولنا کچھ چاہتی ہوں اور بول کچھ جاتی ہوں۔“

”یہاں کیا لینے آئی ہے؟“ شاہ صاحب لن ترانیاں سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔

”صرف دعائیں لینے آئی ہوں۔“

”بیٹا ہے یہ تیرا.....؟“

”جی شاہ صاحب..... ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے اس کی شادی کو..... لیکن ایک دن بھی اس نے اپنے گھر میں خوشی سے نہیں گزارا۔“ ارشاد بیگم بھبھک بھبھک کرنے لگیں۔ ”میں نے غیور احمد کو بھی کھو دیا ہے شاہ صاحب..... آپ نے کہا تھا اس کی بیوی اگر میرے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی تو اسے علیحدہ کر دوں تب سے میں نے اسے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میرے تو تین ہی بیٹے ہیں شاہ صاحب اب اگر فرزان بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں مرجاؤں گی شاہ صاحب..... میرے حق میں دعا کیجیے کہ میرا بیٹا مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جائے۔“

”اور اس کی بیوی کہاں ہے؟“ شاہ صاحب نے سوال کیا۔

”وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے۔ اس کا ہمارے یہاں دل ہی نہیں لگتا۔“

”دل نہیں لگتا یا تم بسانا نہیں چاہتیں.....؟“ ارشاد بیگم تو ارشاد بیگم، فرزان بھی پہلو بدل کر رہ گیا۔

”نہیں، نہیں شاہ صاحب..... میں تو جی جان سے رکھنا چاہتی ہوں لیکن اسے یہاں اپنے باپ کے گھر جیسی آسائش اور آزادی مہیا نہیں ہے۔“

”پھر ایسے گھر کی بیٹی کیوں لائی تھیں جس سے تمہارا جوڑ نہیں ملتا تھا۔“ اب ارشاد بیگم کیا کہتیں وہ تو

منگنی کے بعد یہاں آئی تھیں یہ بتانے کہ فلاں، فلاں جگہ پر انہوں نے اپنے بیٹے کا رشتہ کر دیا ہے اور شاہ

صاحب نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔

”میں جانتا ہوں تو کیا سوچ رہی ہے۔ یہی کہ تو نے مجھے بتا دیا تھا کہ تو نے فلاں جگہ پر رشتہ کر لیا ہے۔“

شاہ صاحب کے لفظوں پر ارشاد بیگم کی پیشانی سے پسینے کے قطرے گر رہے تھے۔ ”مگر بیاہ کرنا تو حیران کام تھا۔“

بیٹے بیاہ کر سکتے نہیں ملتا تو ان کی شادیاں کرنی ہی کیوں ہے.....؟“

”اس لیے کرتی ہوں شاہ صاحب کہ میری نسل چلے..... میرے گھر میں خوشیاں بھیلیں۔ میرے بیٹے

برے راستے پہ نہ چلیں۔ بیٹیاں پرانی ہوتی ہیں، بہوئیں بیٹیاں بن کر آتی ہیں۔“ ارشاد بیگم کے اس قدر

اطمینان بخش جواب پر شاہ صاحب تھوڑا سا مسکرائے پھر ہاتھ اٹھا کر فرزان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور آنکھیں

بند کر کے کچھ پڑھا پھر کہنے لگے۔

”لڑکے پر کچھ نہیں ہے۔“

”مجھے بھی دیکھ لیجیے شاہ صاحب۔ یہ آپ کا تعویذ ڈالا ہوا ہے اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔“

”اس تعویذ کو اتار دے۔“ شاہ صاحب کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا تھا۔ ”پیر کامل نہیں ہوتا۔ یقین کامل ہوتا ہے جب تیری نیت ہی درست نہیں تو تیرا ارادہ کیا درست ہوگا۔“

”میرا مطلب تھا شاہ صاحب۔“ ارشاد بیگم کا ایک گڑبڑا کنکین۔

”بس.....!“ شاہ صاحب نے تخلیہ کر دیا دومت تک خاموشی چھائی رہی پھر انہوں نے ایک تعویذ دیا۔

”عرق گلاب میں اس تعویذ کو بھگو دینا جب اس طرح یہ تحلیل ہو جائے تو بہو، بیٹے کے کمرے میں اس

خوشبو بکھرا دینا۔ تین دن اسی طرح کرنا ہوگا۔ دونوں میاں، بیوی کے دل میں باہم محبت پیدا ہو جائے گی۔“

ارشاد بیگم اس بات پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر گئیں۔ وہ تو چاہتی تھیں کہ کسی طرح سے بہو سے جان

چھوٹ جائے جب کہ شاہ صاحب اس بلا کو مزید چھوٹ رہے تھے۔ ارشاد بیگم نے ہاتھ بڑھا کر بڑی عقیدت

سے وہ تعویذ لے لیا اور بیٹے کو اشارہ کیا کہ وہ باہر جا کر ان کا انتظار کرے۔ فرزان، شاہ صاحب سے مصافحہ

کرتے ہوئے عقیدت سے باہر نکل گیا۔ ارشاد بیگم شاہ صاحب کے مزید قریب ہو گئیں۔

”آپ نے جو پچھلا تعویذ دیا تھا اسے میں نے مسی کے دیے میں جلا دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر

میرے بیٹے کے لیے مخلص نہ ہوئی تو گھر چھوڑ کر چلے جائے گی اگر ایسا ہی ہو، وہ تیسرے ہی دن چلی گئی۔ مجھے

پریشانی اپنے بیٹے کی ہے۔ جو ان لڑکا ہے کہیں کوئی روگ ہی نہ لگا لے خود کو۔“ یہ کہہ کر ارشاد بیگم رونے لگیں۔

”تو اب کیا چاہتی ہو تم؟“

”شاہ صاحب میں چاہتی ہوں بہو میرے میں ضرور رہے مگر میرے بیٹے سے اس کا تعلق رہی

رہے۔ اگر وہ میرے بیٹے کے دل پر چھا گئی تو اس آنکھوں پر پٹی بندھ جائے گی پھر ہم ماں بیٹیوں کا کو

سہارا بنے گا.....؟“ ارشاد بیگم بری طرح رو رہی تھیں

”مجھ بھکارن پر رحم کیجیے شاہ صاحب..... میں لاوارث ہوں..... بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی نہ با

ہے سر پر اور نہ بھائی..... یہ بیٹے ہی میرا سہارا ہیں۔ بیٹا بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ بس کچھ ایسا عمل بتا دیں

بہو کا دل اپنے میکے جانے کو نہ کرے، ہمارے ساتھ انکساری اور عاجزی سے رہے۔ مم..... میرا مطلب

ہمارے ماحول میں ڈھل کر رہے۔“ آخری جملے ارشاد بیگم نے دبے دبے انداز میں کہے اور کچھ رقم شاہ صاحب کے پاؤں کے نیچے رکھ دی۔ شاہ صاحب کچھ دیر چپ رہے پھر توقف سے بولے۔

”کل ایک مچھلی لے آنا۔ زندہ مچھلی..... ہو بھی مادہ..... میں پڑھائی کر کے مچھلی کا منہ بند کر دوں گا اسے دریا میں بہا دینا۔ تمہاری بہو کا منہ بند ہو جائے گا۔ یہ الو کی ہڈی کا سفوف ہے۔ جس کو بھی کھانے میں ملا کر دو گی وہ تمہارا تالچ ہو جائے گا۔“

”بس شاہ جی..... بس..... میں یہی چاہتی تھی۔“ ارشاد بیگم کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے عاجزی سے وہاں سے نکل آئیں۔

۵۵۵۵

آڈیٹوریم ہال کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے قدم وہیں رک گئے۔

”حیرت ہے یار، اس سائنسی دور میں بھی تم ایسی باتیں کرتے ہو..... یقین نہیں آتا۔“

”یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لو۔“ بتانے والے کا وثوق عروج پر تھا۔

”چھوڑو یار..... کس پاگل کی باتوں میں آرہے ہو۔ اگر ایسا ہونے لگے تو یہ جادوگر خود کیوں نہ امیر ہو جائیں۔ پرائز بانڈ کے نمبر وہ دوسروں کو کیوں بتائیں، خود کیوں نہ قریب اندازی میں حصہ لے لیں۔ اس طرح تو بینکوں کے لاکر بھی غیر محفوظ ہو جائیں۔ تم اگر موٹکوں پر اتنا یقین رکھتے ہو۔“

”ہاں یار..... موٹکل تو بینکوں کا صفایا کر دیں پھر چوروں کو چوری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کبھی نہ یہ علم سکھ لیں۔“

”یار قسم سے وہ کوئی جادوگر نہیں بڑا پہنچا ہوا درویش ہے۔ صوفی بابا کے نام سے مشہور ہے وہ آنے والے وقت کا پہلے سے بتا دیتے ہیں۔“

”او..... چل یار چل..... کس پاگل کی باتوں میں آرہا ہے۔ کلاس شروع ہونے والی ہے۔ کینٹین کا سارا ٹائم یہیں ضائع کر دیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ منچلوں کی ٹولی

کینٹین کی طرف بڑھ گئی اور اس کی سوئی ایک ہی لفظ پر انگ گئی۔

”صوفی درویش بابا۔“ وائے رے غربت اور مایوسی..... کیسے، کیسے چور راستے کھولتی ہے۔“ کیا حرج ہے اگر ایک پرائز بانڈ لے کر اسے ٹرائی کر لیا جائے۔ کیا معلوم قسمت اسی طرح مہربان ہو جائے گھر کی غربت

..... ماں، باپ اور بہن، بھائیوں کے مسائل..... یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر وہ اخبار اٹھا لیا جس پر صوفی درویش بابا کی عاملانہ ویلیس رقم تھیں۔

”مایوسی کفر ہے۔ ہمارے پاس آئیں جہاں پر غم کا شرطیہ علاج موجود ہے۔ محبوب قدموں میں.....

امتحان میں کامیابی، روزگار میں ترقی، دولت مند بننے کی تمنا پوری، بے اولادی کا علاج، اولاد زینہ کی خواہش، شادی میں جلدی، بیرون ملک جانے کی تمنا، حج کی سعادت حاصل کرنے کا شوق، میاں بیوی کے درمیان

اتحادی تعلقات اور بھی ایسا بہت کچھ جو آپ چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ہم پرائز بانڈ کا نمبر سو فیصد بتاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھیں۔“ اس کے ساتھ

لگے چوڑے وعدے اور مختلف فون نمبرز رقم تھے۔ ساتھ یہ بھی لکھا تھا۔ ”دیر نہ کیجیے قسمت کی دیوی آپ پر مہربان ہونے والی ہے۔“ علی زمان نے وہ نمبر پھاڑ لیا اور اپنی

جیب میں رکھ لیا اس کا خیال تھا وہ نمبر ملائے گا تو اسے کوئی رسپانس نہیں ملے گا لیکن دوسری ہی نیل پر فون ریسیو کر لیا گیا۔ اب اسے بھائی نہ دیا کہ وہ کیا کہے۔

دوسری طرف مردانہ بھاری بھر کم لہجہ تھا۔

”ہیلو.....“ شاید یہی صوفی درویش بابا ہوں۔

”السلام علیکم، آپ صوفی درویش بابا بول رہے ہیں؟“

”نہیں..... ان سے ملنے کے لیے پہلے ٹائم لینا پڑتا ہے۔ آپ اپنا مسئلہ بتا دیں۔ ہم آپ کو ٹائم دے دیں گے۔“

”میں درویش بابا سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے ان سے پرائز بانڈ کا نمبر لینا تھا۔“

”اس کے لیے آپ کو دو ہزار روپے فیس جمع کرانا ہوگی۔ اس کے بعد درویش بابا آپ کو نمبر بتا دیں گے۔“

”دو ہزار روپے..... یہاں تو زہر کھانے کو بھی ہے نہیں ہیں دو ہزار کہاں سے لاؤں گا.....؟“ علی زمان نے دل ہی دل میں سوچا پھر ذرا تھوک نکل کر

بولے۔

”کیا آپ نمبر شرطیہ بتائیں گے۔ ہو سکتا ہے آپ جو نمبر بتائیں وہ نہ لگے تب کیا آپ دو ہزار روپے واپس دے دیں گے.....؟“

”بچہ..... یہاں یقین چلتا ہے اگر آپ کو ہمارے عملیات پر یقین نہیں تو کوئی بات نہیں۔“ ویسے بھی

درویش بابا ہر ایک کو نمبر نہیں بتاتے۔ بتاتے اسے ہی ہیں جس کا نمبر لگتا ہو۔ یہ تو آپ کو تب بتا چلتا جب آپ ان کے آستانے پر حاضری دیتے ورنہ اکثر تو وہ لوگوں کو خالی

ہی بھگا دیتے ہیں۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ جو امید پال کر جاتے ہیں۔“ کہنے والے نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

علی زمان بہت دیر تک سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا اگر قسمت کی دیوی یوں مہربان ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ تب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک بھی

جاسکتا ہے اپنے روم میٹ لڑکوں کی طرح عیاشیاں بھی کر سکتا ہے، اپنے گھر والوں کو آسائشیں بھی دے

سکتا ہے۔ عالیشان گھر، عالیشان کار..... بہن بھائیوں کے گھروں میں خوشحالی۔

”اوہ..... اگر میرا ایک کروڑ کا انعام لگ جائے تو میرے تو قدم شاید زمین پر نہ ٹکیں۔ پچیس لاکھ میں شنو

آپا کو دے دوں گا ان کے گھر میں بڑے مسائل ہیں لیکن صدیق بھائی بھی تو ہیں جن کے سات بیٹیاں ہی بیٹیاں

ہیں۔ پچیس لاکھ تو انہیں دوں گا باقی پچاس لاکھ بچیں گے۔ اپنے بوڑھے ماں، باپ اور چار بہن بھائیوں کے

مستقبل میں صرف کروڑ گا مگر سیکہ خالہ بھی تو ہیں اور اسماعیل چاچا اور اسی طرح کے بہت سے لوگ جن سے

غربت نسل در نسل موروثی بیماری کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ میں سب کے غم دور کر دوں گا لیکن اتنے سارے لوگوں میں ایک کروڑ تو بہت تھوڑے ہوں گے۔ دو کروڑ

کا انعام لگنا چاہیے میرا..... اُف دو کروڑ اتنے ڈھیر سارے پیسے..... کیا میں اتنی رقم پا کر زندہ رہ پاؤں گا

میں تو خوشی سے مر جاؤں گا۔ زندگی میں ترقی کرنے کا یہ شارٹ کٹ کتنا آسان ہے۔ ابھی تو تعلیم کا نصف حصہ

پڑا ہے پر یہ بھی نہیں پتا کہ نوکری ملے گی یا نہیں یہ سب لڑکے جو یہاں پڑھنے آتے ہیں وہ صرف پڑھنے ہی تو

نہیں آتے۔ زندگی بھی تو انجوائے کر رہے ہیں۔ ان کے باپ امیر اور بااثر لوگ ہیں۔ یہ لوگ اپنی، اپنی زندگیاں کتنے مزے میں گزار رہے ہیں۔ کیا یہ

آسانیاں مجھے میسر نہیں آسکتیں۔“

”ہاں بھی..... پڑھا کو..... کیا کر رہے ہو کبھی اس دڑبے سے نکل بھی جایا کرو۔ کالج کا لان تمہاری

آس میں دیدہ و دل بچھائے رکھتا ہے مگر تم اسے گھاس بھی نہیں ڈالتے۔“ رضوان نے اسے گم صم پا کر ہمیشہ کی

طرح چھیڑا اور پنگھا تیز کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ علی نے اس کی طرف دیکھا اور بظاہر جو کتاب آنکھوں سے لگا

رکھی تھی وہ بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

”رضوان..... تم کسی عامل کو جانتے ہو؟“ علی کے اتنے سنجیدہ سوال پر رضوان بستر سے اچھل پڑا اور اسے

حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کہیں تمہیں بھی عشق و شوق تو نہیں ہو گیا۔ محبوب کو قدموں میں کرنے کی ضرورت تو نہیں ہو رہی ہے

تجھے.....؟“

”نہیں یار..... کبھی سنجیدہ بھی ہو جایا کرو۔“

”تو پھر کیا امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لیے عامل کا پتا مانگ رہے ہو؟“ رضوان نے جل کر

کہا تو علی نے صوفی درویش بابا کا ذکر چھیڑ دیا۔ رضوان اس کی ساری بات سن کر ہنس پڑا۔

”آج سے سال بھر پہلے مجھے ایک لڑکی سے عشق

ہوا تھا تب میں نے بڑے بڑے عاملوں کو دیکھا لیکن کسی عامل کے عمل سے میرا محبوب میرے قدموں میں نہیں گرا

اور تب مجھے یقین ہو گیا یہ سب ڈھونگی ہوتے ہیں۔“

”اگر یار..... یہ سب ڈھونگ ہوتا ہے تو لوگ

کیوں جاتے ہیں ان کے پاس۔“

”بے چارے ٹوٹے دل کے لوگ جو ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں وہ اپنی قسمت آزمانے نکل پڑتے ہیں اور یہ عملیات کا چکر تو بہت برا ہے جو اس میں پھنستا ہے پھر نکل نہیں پاتا۔ عمل کرنے والوں کے دعوے اور مایوس آدمی کی زندگی آگے پیچھے دوڑنے لگتی ہے تمہیں کیونکر عامل کی ضرورت پیش آئی۔“ علی زمان، رضوان کی بات پر کچھ کھسیا سا گیا۔

”بس ایسے ہی میں نے سوچا چلو کسی بانڈ شانڈ کا نمبر ہی پوچھ لیتے ہیں۔“ اس کا اتنا کہنا تھا کہ رضوان ہنسنے لگا۔

”یار..... تو تو..... اپنے ہی جیسا نکلا چل پھر آتھے ایک نئی دنیا کی سیر کراتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے رضوان نے علی کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا اور اپنے گروپ کے لڑکوں کے پاس جا کر بولا۔

”یہ سب اپنے ہی یار ہیں۔“ یہ کہہ کر رضوان نے علی کا تعارف ان لڑکوں سے کروایا پھر علی سے مخاطب ہو کر بولا۔

”ہم لوگوں کا جب عیاشی کرنے کو دل کرتا ہے تو ہم پیسہ کیسے اکٹھا کرتے ہیں یہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ فون ہے ناں بڑا جادو ہے اس میں..... اس سے بڑا جادو گر شاید ہی آج کے دور میں کوئی ہو اس سے ہم لوگوں کے ہاں فون کا لڑ ملاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں اکثر کالز دوسرے شہروں کی ہوں..... اس کے لیے ہم ٹیلی فون ڈائری کا استعمال کرتے ہیں پھر لوگوں کا نام لے کر پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص کا گھر ہے۔ جواب ملتا ہے جی ہاں ہم انہیں بتاتے ہیں کہ آپ کا انعام نکلا ہے..... غربت اور مہنگائی نے لوگوں کو مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے وہ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ ہم نے تو کسی قرعہ اندازی میں حصہ بھی نہیں لیا تھا۔ بھلا انعام کس چیز کا۔ ایک لاکھ، دو لاکھ تین لاکھ کاسن کر لوگ ہواؤں میں اڑنے لگتے ہیں۔ لوگ خوشی خوشی لاکھوں کے پیچھے ہزار پانچ سو جمع کروادیتے ہیں پھر اس بیلنس کو ہم فروخت کر دیتے ہیں ساتھ ہی وہ نمبر بھی جس پر بیلنس اکٹھا کیا تھا اور پھر اس سے عیاشیاں کرتے ہیں۔“ علی زمان کو ان کے فراڈ پر

بڑا تعجب ہوا حالانکہ یہ لڑکے اچھے خاصے گھروں کے تھے۔

”ایسا تم نے کتنی بار کیا ہے اور کیا تم لوگ پکڑے نہیں جاتے.....؟“

”تم سے رضوان ہم نے کہا بھی تھا..... اس ٹیم میں مزید لوگوں کو جمع نہ کرنا۔ یہ تم کس ”بیبے“ کو اٹھا لائے ہو جو ہمارے کسی کام بھی نہیں آ سکتا۔“ ان میں سے ایک لڑکے نے ناگواری سے کہا تو رضوان انہیں قائل کرنے والے انداز میں بولا۔

”یار اس کی آواز اچھی خاصی بھاری ہے۔ جب یہ بولتا ہے تو کسی ادارے کا آفیسر لگتا ہے اب کی بار اس کی آواز سے فائدہ اٹھالیں گے۔“ لیکن علی زمان کو ان کی ٹیم کا حصہ نہیں بننا تھا کیونکہ اسے چند ہزار کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے تو لاکھوں کی ضرورت تھی لاکھوں بھی کیا اسے ایک کروڑ کم پڑ گئے تھے۔ وہ بے دلی سے ان کی محفل میں بیٹھا رہا اس کا تو جیک لگانے کا ارادہ تھا اور اس کا دل کہہ رہا تھا یہ جیک ضرور درویش بابا کے پاس جا کر کامیابی حاصل کر لے گا۔ اس کے خواب تشنہ نہیں ہوں گے۔ انہیں تعبیر ضرور ملے گی۔

ۛۛۛۛۛ

داوی زمین کے رشتے کے لیے بہت بے چین تھیں لیکن ان کی چوکھٹ پر ابھی تک کوئی بھی سوالی بن کر نہیں آیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ روز کریموں دائی کے ہاں چکر لگاری تھیں۔

”مجھے تو لگتا ہے زمین کے رشتے میں رکاوٹ اس کے باپ کے کرتوت ہیں جس نے شہر میں پہلے سے ہی پیار چار رکھا تھا، زمین کی ماں بھی اسی صدمے میں چلی گئی۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پہ ”چوکی“ چلوائی گئی تھی ورنہ وہ جوان جہان عورت جو گھوڑے کی طرح بھاگتی پھرتی تھی یوں بستر پر نہ پڑتی، اب حیات محمد تو رہا نہیں مگر اس کی بیوہ تو زندہ ہے۔ سنا ہے بہت ہی ہوشیار عورت ہے وہ کیسے چاہے گی کہ زمین شادی ہو کر کہیں جائے اور اس کے حصے کی جائیداد اس کے ہاتھ سے نکلے۔“ کریموں دائی کی یہ بات داوی کے دل کو

لگی۔

”کریموں اس عورت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، حیات محمد کے مرنے کے بعد ہم نے تو شہر کا رخ بھی نہیں کیا اور پھر حیات محمد ہمیں دے بھی کیا گیا ہے یہ جھونپڑا اور دو چار جانور باقی سب کچھ تو وہ اس شہری عورت کے نام کر گیا ہے کچھ زیور ہے جو میرا اپنا ہے۔ زمین کے نام پر رکھا ہوا ہے اور میرے پاس ہے ہی کیا۔؟“

”یہ تو، تو کہتی ہے ناں..... نہ جانے اس عورت نے تمہارے بارے میں کیا بھید پتا نکلوا رکھا ہو۔ لالچ بہت بری چیز ہوتی ہے اور وہ عورت بہت لالچی ہے۔ جسے تو جھونپڑا کہہ رہی ہے ذرا بیچنے نکل تو تجھے دام معلوم ہوں اور زیور تیرا ہلکا ہے۔“ ڈلے کا ڈلا ہے۔ توڑے میں تول لے آدھ سیر سے کم نہ ہوگا۔ وہ کیسے چاہے گی یہ سب اس کے ہاتھ سے نکلے۔“ کریموں دائی کی دلیلوں نے داوی کو فکر مندی میں ڈال دیا۔

”میں تو کہتی ہوں اب بھی اگر تو چپ ہو کر بیٹھی تو تجھے جیسا جھلا مارا کوئی نہ ہوگا۔ میرے ساتھ ”جھارو مائی“ کے پاس چل وہ تجھے اس مسئلے کا حل بتا دے گی۔“ داوی نے اس پنڈ میں عمر گزاری تھی اور ”جھارو مائی“ کا بہت نام سنا تھا لیکن واسطہ اس سے آج تک نہیں پڑا تھا۔ داوی کریموں کے ساتھ ”جھارو مائی“ کے پاس چلنے کو تیار ہو گئیں۔

ۛۛۛۛۛ

وہاں پنڈ کی اور بھی بہت سی عورتیں تھیں جو اپنے مسئلے لیے بیٹھی تھیں ”جھارو مائی“ نے ایک نوجوان لڑکی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ قریب ہی گول دائرے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ جس میں جھارو مائی مٹھی بھر کر کچھ ڈالتی اور تیز تیز آواز میں کچھ پڑھتی تو لڑکی چیخیں مارنے لگتی پھر جھارو مائی لڑکی کے بال پکڑ کر اسے زمین پر پٹختے ہوئے کرخت لہجے میں بولی۔

”جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جا..... ورنہ تیرا وہ شتر ہوگا کہ یہاں بیٹھے سب تیرا تماشا دیکھیں گے۔“ جھارو مائی کا اتنا کہنا تھا کہ لڑکی کی چیخیں سسکیوں میں

بدل گئیں۔ جھارو مائی نے مٹھی بھر کر پھر آگ میں کچھ ڈالا اور لڑکی کو ایک بار پھر پختی دی۔ لڑکی زمین پر اوندھے منہ گر گئی۔ جھارو مائی بلند آواز میں منتر پڑھنے لگی پھر دو عورتیں اندر کمرے سے برآمد ہوئیں اور اس لڑکی کو اٹھا کر لے گئیں۔ دادی کے بوڑھے وجود میں لرزہ طاری ہو گیا وہ جھارو مائی کی جاہ و حشمت سے خوفزدہ ہو چکی تھیں اس کے بعد گاؤں کی عورتیں باری باری اپنے مسئلے لے کر جھارو مائی کے پاس عقیدت سے بیٹھتیں اور اپنی پریشانیاں بیان کرتیں زیادہ تر عورتیں اپنے گھریلو حالات سے پریشان تھیں۔ کچھ اپنے شوہروں سے..... کچھ شوہروں کا روزگار نہ ہونے سے اور اکثریت ساس نندوں سے پریشان تھی۔ وہیں ساسیں بھی موجود تھیں جو بہوؤں سے تنگ آ چکی تھیں۔ جھارو مائی بیک وقت سبھی کو تعویذ بنا، بنا کر دے رہی تھی۔ دادی حیرت سے اس چھو منتر کا کھیل دیکھ رہی تھیں کہ اچانک ایک عورت آگے بڑھی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

”میری سات بیٹیاں ہیں مائی اس بار حمل ٹھہرا ہے ایسا تعویذ بنا دیں کہ مجھے اس بار بیٹا ہی پیدا ہو.....؟“ اس کم عقل عورت کی فریاد پر دادی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”کیا مائی بیٹا دے گی..... تو بہ..... تو بہ۔“ دادی نے دل ہی دل میں استغفار پڑھی..... مائی کہہ رہی تھی۔

”مجھے حمل سے پہلے آتا تھا تیرے مرد کا اور تیرا علاج کرنا ہو گا تب جا کر تیرے بیٹا پیدا ہو گا۔“

”وہ نہیں آتا مائی، بہت متیں گئیں میں نے اس کی..... مجھے بھی نہیں آنے دیتا، اب بھی اس سے چھپ کر آئی ہوں۔“

”کون سے پنڈ سے آئی ہے؟“

”علی پور سے آئے ہیں مائی، بڑا نام سنا ہے آپ کا ہم نے آپ کو خدا رسول کا واسطہ..... مجھے بیٹے کی امید دے دیں۔“

”دینا تو رب نے ہے..... ہم تو بس اس کے بندے ہیں لیکن میں کوشش کروں گی کہ تیرے بیٹا ہی ہو۔ یہ لے تعویذ اسے پیٹ پر باندھ لے اور یہ پانی نو ماہ

تک پینا ہے ہر مہینے کی چاند رات کو چاند کی طرف منہ کر کے نو ماہ تک یہ پانی پیے گی تو تجھے بیٹا ہی ہو گا۔“ جھارو مائی نے پانی کی بوتل اس عورت کی طرف بڑھائی تو وہ اس طرح کھل گئی جیسے اسے آج ہی بیٹے کی نوید مل گئی ہو۔ اس نے نذرانہ اپنی اوڑھنی کے پلو میں سے کھولا اور جھارو مائی کی طرف بڑھا دیا اور خوشی خوشی اٹھ گئی۔ اب کریموں اور دادی کی باری تھی۔

”بچی کے رشتے کے لیے پریشان ہیں، تسلی چاہتے ہیں کہ رشتے میں کسی نے بندش تو نہیں کی ہوگی۔“ کریموں نے عاجزی سے کہا تو جھارو مائی نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ پڑھنا شروع کر دیا پھر آنکھیں کھولیں۔

”کیا نام ہے بچی کا؟“ کریموں نے نام بتا دیا۔

”افروز.....؟“

”اور اس کی ماں کا نام.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

”افروز.....؟“

بجائے کریموں دائی کہہ رہی تھی۔

”اگلی بار آتا ہو تو کالا بکرا لے کر آنا پہلے اس کا خون ہے گا پھر پڑھائی شروع ہوگی۔“

”نذرانہ.....“ دادی نے جھجکتے ہوئے چند نوٹ جھارو مائی کی طرف بڑھائے تو وہ تیزی سے بولی۔

”ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے.....! کیونکہ مائی جان گئی تھی کہ بڑھیا ابھی متذبذب ہے جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا نذرانے کا فائدہ نہیں ہے۔

کریموں اور دادی دونوں آگے پیچھے نکل گئیں۔

”بہت پختی ہوئی ہستی ہے جھارو مائی، میرے تو کمر میں جو مسئلہ بھی ہوا ہے اسے جھارو مائی نے ہی درست کیا ہے۔“

”جگہ کا ایک ٹکے کا کام نہیں تھا۔ مائی نے چالیس دن میں ایسا بندوبست کیا کہ بندش کرانے والے کا کاروبار ٹھپ ہو گیا اور بکے کا ہول چلنے لگا..... تو بھی اگر دل کو پکا کر لے تو جھارو مائی کے لیے یہ مسئلہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

دادی کریموں کی باتیں سنتی رہیں اور سوچتی رہیں۔

”دائی، کریموں ٹھیک کہہ رہی ہے کچھ تو سچائی ہو گی جو مائی کے پاس اتنا رش تھا.....“

دادی کی سچی سوچ یہیں تک پہنچ سکی اگر دادی کی سوچ کا زاویہ بلند ہوتا تو وہ کریموں دائی کے ساتھ جھارو مائی کے پاس ہرگز نہ جاتیں۔ وہ یہ سوچ کر چپ رہتیں کہ ہر چیز کا خالق و مالک رب ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے جس نے پیدا کیا، رزق اور جوڑے کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔

”بہنیں کی ابھی عمر ہی کتنی ہے رشتہ آ جائے گا۔ وہ اپنے رب سے لو لگائے لیکن دادی کا دل بجائے یہ سب سوچنے کے دلیل دے رہا تھا۔

”جادو برحق ہے۔ جب ہمارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو ہو سکتا ہے تو ہم گناہ گاروں پر کیوں نہیں؟“

یہی دلیلیں ہر عام آدمی کے لیے کافی ہیں جب وہ اس سچ پر آ جاتا ہے تو دانستہ کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا اور اپنی ناکامیوں، نامراد خواہشوں کا ذمہ دار جادو کو ٹھہراتا ہے۔

دادی نے زمین کا علاج کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دادی نے زمین کا علاج کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دادی نے زمین کا علاج کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دادی نے زمین کا علاج کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دادی نے زمین کا علاج کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دادی نے زمین کا علاج کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دادی نے زمین کا علاج کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دادی نماز ظہر ادا کر چکی تھیں لیکن زمین ابھی گھر نہیں آئی تھی۔ دادی کو زمین کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی کہ وہ اپنی ہم جویوں کے گھر جایا کرتی تھی۔ ابھی دادی، زمین پر بیچ و تاب کھا ہی رہی تھیں کہ زمین گھر میں داخل ہوئی۔

”کہاں گئی تھی تو..... یہ وقت تھا تیرے گھر سے نکلنے کا..... کتے بھونک رہے ہیں گلیوں میں..... سورج سوائیزے پر کھڑا ہے۔“

”میں فاطمی (فاطمہ) کے گھر گئی تھی۔“ زمین نے جھوٹ بولا۔

”کیوں..... تجھے اپنے گھر سے فرصت ہو گئی تھی؟“

”تجھ سے ہزار بار کہا ہے میرے پیٹھ پیچھے گھر سے نہ نکلا کر مگر تیری عقل میں نہیں آتا۔ یہاں چوری چکاری ہو گئی تو کون ذمہ دار ہو گا اس کا۔“

زمین دیکھ رہی اور کان دبا کر باورچی خانے میں آ گئی..... دادی بکتی جھکتی رہیں۔

سالن گرم کیا، چپاتیاں ڈالیں، مکھن کا پیڑا رکھا۔ لسی، بالٹی میں بھری اور تابعداری سے دادی کے سامنے کھانا رکھ دیا۔

”اچھا غصہ نہ کریں، کھانا کھالیں۔“ کل کا سالن دیکھ کر دادی کا ماتھا ٹھنک گیا۔

”آج تازی ہنڈیا نہیں بنائی تو نے؟“ زمین کیا کہتی کہ وہ تو ان کے پیچھے ہی گھر سے نکل پڑی تھی۔

”اتنا، اتنا سالن بیچ جاتا ہے۔ دو ہی توجی ہیں پھر ادھر ادھر باٹنا پڑتا ہے۔ شام کو بنا لوں گی۔“ زمین نے دادی کو مطمئن کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گئی۔

کھانے سے فراغت کے بعد دادی کو نیند آنے لگی۔ وہ جھککن سے نڈھال اندر کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ زمین برتن سمیٹنے لگی۔ اسے بھی نیند آرہی تھی۔

باورچی خانہ بند کر کے وہ بھی کمرے میں آ گئی اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ دادی سوچتی تھیں۔ ان کے خرائے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔ زمین نے کوفت سے دادی کی طرف دیکھا اور کروٹ بدل لی۔ لیٹی تو وہ بھی سونے کے ارادے سے تھی لیکن ماسٹر امام علی کا چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔

”ماسٹر امام علی.....“ زمین نے زیر لب دہرایا اور

”ماسٹر امام علی.....“ زمین نے زیر لب دہرایا اور

”ماسٹر امام علی.....“ زمین نے زیر لب دہرایا اور

”ماسٹر امام علی.....“ زمین نے زیر لب دہرایا اور

”ماسٹر امام علی.....“ زمین نے زیر لب دہرایا اور

”ماسٹر امام علی.....“ زمین نے زیر لب دہرایا اور

میشی سی مسکان اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

ماسٹر امام علی نے جب سے پنڈ کے مڈل اسکول کا چارج سنبھالا تھا بچوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی اور اسکول کی پوزیشن بھی اچھی جا رہی تھی۔ ویسے تو اس اسکول میں نت نئے استاد آتے رہتے تھے لیکن کوئی ڈھنگ کا استاد اس اسکول کو نہیں مل سکا تھا۔ یہ گورنمنٹ کا گاؤں میں واحد اسکول تھا جہاں کوئی کبھی شہری بابو سال چھ ماہ سے زیادہ نہیں نکلتا تھا۔ وہی پرانے بوڑھے استاد درس و تدریس کا سلسلہ چلائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اسکول بد نظمی کا شکار نظر آتا تھا۔

ماسٹر امام علی کے آنے کے بعد اسکول کی رونق بہت بڑھ گئی تھی۔ استادوں کا بھی وقت پر آنے کو دل کرتا تھا اور بچوں کو بھی یونیفارم سمیت معمول سے آنا اچھا لگنے لگا تھا۔ زمین کا چونکہ کوئی چھوٹا بہن بھائی نہیں تھا اس لیے وہ اسکول کی خبروں سے بے خبر رہا کرتی تھی لیکن زمین کی سہیلیوں کے چھوٹے بہن بھائی اسی اسکول میں جاتے تھے۔ اس لیے زمین کی سہیلیوں میں ماسٹر امام علی کی خاصی دھوم مچ گئی تھی۔ اس شور سے متاثر ہو کر جب زمین نے ماسٹر امام علی کو دیکھا تو وہ بھی امام علی کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی پھر روز کا یہی معمول بن گیا۔ وہ بہانے بہانے سے اسکول جانے لگی اور چپکے چپکے امام علی کو دیکھا کرتی۔

وہ سمجھتی تھی شاید وہ اکیلی ہی امام علی کو دیکھتی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ امام علی نے اس کی چوری پکڑ لی ہے اور جان گیا ہے ایک نٹ کھٹ سی لڑکی روز اسے چپکے چپکے دیکھتی اور مسکراتی ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہے صرف اسے دیکھ کر بھاگ جاتی ہے..... اس سے باتیں کیوں نہیں کرتی..... اس کے پاس کیوں نہیں بیٹھتی، اس کا نام کیا ہے..... امام علی خود بھی یہ جاننا چاہتا تھا لیکن وہ خود سے کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا جس سے اس کے یازمین کے کردار پر حرف آتا۔

وہ بھی اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا، پلا بڑھا تھا پھر وہ لوگ شہر چلے گئے تھے۔ اس کا باپ ایک معمولی کلرک تھا اور ماں کشیدہ کاری میں ماہر تھی۔ امام علی نے دلجمعی

سے تعلیم حاصل کی..... وہ ماں باپ کی محنت کا ثمر بنا چاہتا تھا۔ لی اے کرنے کے بعد اسے گورنمنٹ کی نوکری بھی مل گئی تھی۔ میچر کی حیثیت سے اسے قریبی اسکولوں میں بھیجا گیا پھر اس کا تبادلہ گاؤں میں ہو گیا۔ یہ گاؤں اس کا آبائی گاؤں تھا۔ اس لیے اس کا دل لگا رہا اور اس نے تبادلہ کرانے کی بھاگ دوڑ نہیں کی۔ اچھی کارکردگی دیکھتے ہوئے اسے اسکول کا انچارج بنا دیا گیا تھا جس پر وہ بہت خوش تھا۔ زمین کا اسے دیکھنا اور نظریں ملنے پر شرما کر بھاگ جانا اسے اتنا بھاگ گیا تھا کہ وہ اس نٹ کھٹ سی لڑکی پر دل ہار گیا تھا۔

زمین، امام علی کے خیالات و احساسات سے نابلد ہونے کے باوجود من ہی من میں اسے چاہے جا رہی تھی۔ وہ یہ تو جانتی تھی گاؤں کی لڑکیوں میں ماسٹر امام علی کا ذکر بڑے جوش و خروش سے ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ سب لڑکیوں میں امام علی کو وہ بھاگتی ہے اور جیسے چپکے، چپکے وہ امام علی کو سوچتی ہے وہ بھی اس کے بارے میں سوچنے لگا ہے اور جس روز وہ نہیں آتی جس روز دیوالی کی اوث سے چوڑیوں کی چھن چھن سنائی نہیں دیتی امام علی کو کتنا خالی پن لگتا ہے۔ کاجل بھری شریر آنکھیں جو اسے دیکھتی ہیں اور نظر ملنے پر رنگیں آنچل اڑاتی بھاگ جاتی ہیں اس کے دل کے تاروں کو یوں چھو کر بھاگ جانا امام علی کو کتنا بے چین کر دیتا ہے۔ وہ خود ان بے چینیوں کو ختم کرنا چاہتا تھا اس سے ملنا چاہتا تھا۔

آخر کار آج یہ آنکھ بھولی کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ آج جب وہ امام علی کو دیکھ کر بھاگنے لگی تو امام علی اس کے بالکل سامنے آ گیا۔ زمین نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس طرح امام علی سے اس کا سامنا ہو جائے گا اور وہ اس کا راستہ روک کر بھاری گھبیر لہجے میں اس سے پوچھے گا۔

”اتنے دن سے مجھے کیوں چوری چوری دیکھنے آتی ہو؟“ وہ سامنے ڈٹ گیا تھا۔ زمین کے رنگ اڑ گئے۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ وہ فرط جذبات سے مخمور اس کا بانگپن اپنے اندر اتار رہا تھا۔ زمین اپنی چوری

پکڑے جانے پر ڈر گئی۔ پہلا خیال یہی آیا اگر اس نے دادی کو بتا دیا..... یا گاؤں میں کسی اور کو پتا چل گیا تو دادی تو اسے جان سے مار ڈالے گی۔ دادی جو اس پر اتنا بھروسہ کرتی ہے۔ صرف اس لیے کہ آج تک اس نے کسی کو سیدھے منہ جواب نہیں دیا۔ فیکے پر تو وہ گور کی بنی بنائی تھاپی بھی مار دیا کرتی تھی۔

یہ ماسٹر بھی تو اسے غلط سمجھ رہا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر سے کوئی پکارا۔ ”ماسٹر غلط سمجھا ہے تو پھر تو روز اسے کیوں دیکھنے آتی ہے جب سکھوں میں امام علی کا ذکر ہوتا ہے تو تیرے لب کیوں سل جاتے ہیں۔ کیوں چٹکیوں میں نہیں اڑا دیتی۔ اس ذکر کو کیوں من ہی من میں سوچا کرتی ہے کہ سکھیاں بس امام علی کا ذکر کرتی رہیں اور تو سنتی رہے۔“ اسے ہراساں و تنگ یا کر امام علی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ زمین نے چونک کر امام علی کی طرف دیکھا۔

”بس یہی جرأت ہے تمہاری، اب میری جرأت دیکھنا۔ تمہارے گھر تک آؤں گا.....!“ امام علی نے اتنے جذب سے کہا کہ زمین کے چہرے پر سارا خون نچڑ آیا۔ امام علی کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی اور چاہت کا رنگ نمایاں تھا۔ زمین دیہاتی ماحول کی پروردہ تھی، ان پڑھ تھی، کم عمر بھی لیکن پھر بھی بھانپ گئی تھی کہ امام علی بھی اسے پسند کرتا ہے۔ وہ امام علی کے سامنے اب کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے قریب سے دوڑی تو امام علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اب تو نام بتا دو..... کسی اور سے پوچھوں گا تو تمہاری بدنامی کا ڈر ہے۔“ زمین نے امام علی کی آنکھوں میں دیکھا پھر گھبرا کر اس ہاتھ کی طرف دیکھا جو امام علی کے ہاتھ میں تھا۔

”زے..... زے..... بن“ زمین نے اٹکتے اٹکتے کہا تو امام علی نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ زمین دوڑتی چلی گئی جیسے پتنگ کٹ گئی ہو اور وہ ہوا کی لہروں سے اڑتی جا رہی ہو۔ ایسے ہی وہ بہت دور جا کر ایک گچی پگڈنڈی پر بیٹھ گئی۔ آج یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی سانسیں بحال کرنے لگی اس کا دل بری طرح دھڑک رہا

تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ دیکھا جسے امام علی نے پکڑا تھا پھر اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور سینے سے لگا لیا۔ سینے میں دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ سب کچھ اپنی سکھوں کو بتائے گی تو وہ اس کا جینا حرام کر دیں گی۔ چاروں طرف شور مچ جائے گا۔ زمین کو امام علی سے محبت ہو گئی ہے اور دادی..... دادی کو پتا چل گیا تو وہ اسے جان سے مار دیں گی۔ لکھتے زمین نے اپنا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نہیں..... نہیں..... یہ سب میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“ اس نے اپنے چہرے سے پسینہ صاف کیا اور لرزتی ٹانگوں کو سنبھالتی اٹھی تو دھک سے رہ گئی۔ ملکوں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کالا کرتہ اور کالا تہبند گلے میں اونٹ کی ہڈی بندھی تھی۔ ایک ہاتھ اور پاؤں میں چاندی کا کڑا تھا۔ ایک کان میں چاندی کی بالی پہن رکھی تھی اس کا بھاری بھر کم وجود زمین کے سامنے استادہ تھا۔

”کس سے مل کر آ رہی ہے جو اتنی لالوں لال ہو رہی ہے؟“ ملکوں نے اپنی گہری مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو زمین نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی اوڑھنی سر پر نکاتے ہوئے بولی۔

”تو کون ہوتا ہے مجھ سے یہ پوچھنے والا؟“ ملکوں زمین کے غصے پر دل کھول کر ہنسا۔

”چل نہیں بتاتی تو نہ بتا جب سارے پنڈ کو پتا چلے گا تو ملکوں کو بھی پتا چل جائے گا۔“

”مجھ سے اٹنی سیدھی بکواس مت کر ملکوں..... پنڈ کی لڑکیوں کو ستاتے، ستاتے تو مجھے بھی بدنام کرنے پر تل آیا ہے۔“

”تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ کیا تو اسکول کے پچھواڑے سے بھاگی نہیں آ رہی۔ بتا کیا کرتی ہے تو روز اسکول کے پچھواڑے میں.....“ اپنی چوری پکڑے جانے پر زمین کے رنگ اڑ گئے۔ اگر اس نے یہ بات سارے پنڈ میں پھیلا دی تو اس کی عزت نیلام ہو جائے گی۔ وہ بزدل بھی تھی اور واردات بھی پہلی ہی تھی اس لیے ملکوں کے ہاتھ اس کی کمزوری خود بخود آ گئی۔

”میرا راستہ چھوڑ..... مجھے گھر جانے دے۔“

رہا اور اسے حیران نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ جو شہری بابو ہے مجھ سے زیادہ کبرو ہے کیا جو روز اس سے ملنے جاتی ہے۔“ زمین دھک سے رہ گئی اس کا مطلب ہے یہ ملکوں سے روز اسکول کے پچھواڑے جاتا دیکھتا تھا مگر وہ اس سے ملنے تو نہیں جاتی تھی صرف دیکھتی ہی تھی اور وہ اس پر خواتواہ الزام لگا رہا تھا۔

”اپنی زبان سنبھال کر بات کر ملکوں..... میں تیرے منہ لگنا نہیں چاہتی۔ راستہ چھوڑ میرا.....!“

”زبان میری سنبھل جائے بھی تو کیا..... کل کو پنڈ میں زبان، زبان پر تیری اور اس کی کہانی ہوگی تب کیا کرے گی تو.....؟“ زمین نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ملکوں کو جواب تو دے سکتی تھی مگر اس کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھی سو اس کے سامنے سے گزرنے لگی تو ملکوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور غرا کر بولا۔

”غیروں کے مزے کراتی ہے اور اپنوں کو آنکھیں دکھاتی ہے۔“ ملکوں کی دیدہ دلیری پر زمین سرتاپا کانپ گئی اور غصے سے چلا کر بولی۔

”شرم کر..... تجھے جوان کو گاؤں کی دبی بیٹی کی عزت کا احساس نہیں..... تو اپنی ماں، بہنوں سے جا کر سیکھ..... ملکوں نے اس کی کھائی مروڑ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

”بڑی غیرت ہے تیرے اندر تو، تو ہی سکھا دے شرم۔“

”ملکوں میں کہتی ہوں میرا ہاتھ چھوڑ دے ورنہ ایسا شور مچاؤں گی کہ سارا پنڈ اکٹھا ہو جائے گا۔“ ملکوں نے زمین کی دھمکی پر قہقہہ لگایا۔

”چچا شور..... پھر کیوں شور نہیں مچاتی..... پہلی بات تو یہ کہ ادھر اس وقت کوئی نہیں آئے گا اور اگر کوئی تیرا ہمدرد آ بھی گیا تو میں اسے بتا دوں گا کہ میں تو اپنی زمینوں پر کام کر رہا تھا یہ خود بھاگ کر میرے رقبے میں آئی تھی۔“ ملکوں کی بات پر زمین کے دماغ کو جھٹکا لگا یہ سارا علاقہ ملکوں کے باپ دادا کا تھا ان کی جاہ و حشمت کی وجہ سے پورے گاؤں کے عام لوگ کم ہی ادھر آتے تھے۔ زمین کو یکدم خوف اور خطرے نے آن گھیرا لیکن

اس نے ہمت نہیں چھوڑی اور غصے سے بولی۔

”ملکو میرا ہاتھ چھوڑ دے ورنہ تیرے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔“ اس کی دھمکیوں پر خباثت سے ہنستے ہوئے ملکوں نے اسے مکمل اپنی گرفت میں لے لیا۔ ملکوں کا دیوہیکل وجود اور زمین کا دھان پان سا سراپا..... زمین کی مزاحمت ناکام ہوتی چلی گئی۔ وہ چلا بھی رہی تھی اور اس کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی کوشش بھی کر رہی تھی لیکن اس کی دونوں ہاتھ کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ ملکوں، زمین کو اٹھا کر اپنی چکی کوٹھری میں لے گیا جہاں جانوروں کے لیے بھوسا اور چوکر رکھی جاتی تھی کیونکہ اس وقت ملکوں پر حیوانیت سوار تھی۔

۵۵۵۵

”سمجھ میں نہیں آتا کیسے لوگ ہیں جب بیٹوں سے اتنی محبت ہوتی ہے تو پھر ان کی شادیاں ہی کیوں کرتے ہیں، سنبھال کر کیوں نہیں رکھ لیتے اپنی بیٹیوں کو لالچول ولا..... بھلا یہ بھی کیا سوچ ہوئی کہ بہو، بیٹے کو بھاگ کر لے جائے گی اگر اس کے پہلے بیٹے نے ایسا کیا ہے تو وہ ماں کے کروتوں کی بدولت کیا ہوگا۔ نہ جانے میری عقل پر پتی کیوں بندھ گئی تھی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ آخر بڑا بیٹا علیحدہ رہ رہا ہے تو ان کے اندرونی مسائل کیا ہیں۔ اگر میں فرزان کے بڑے بھائی سے مل لیتا تو ہرگز ان لوگوں میں نہ پھنستا.....!“ وہ اپنے فیصلے پر بری طرح پکھتا رہے تھے روحانے ٹھنڈی آہ بھری۔

”ڈیڈی، آپ نے میری شادی کا فیصلہ بہت جلد بازی میں کیا ہے اگر میں کم تعلیم یافتہ بھی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ آپ اپنا معیار بھی فراموش کر دیتے۔ کس قدر جاہل اور اجڈ لوگ ہیں وہ۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔“ عماد الدین نہایت افسردگی سے بیٹی کے قریب بیٹھ گئے۔

”میں نے واقعی دھوکا کھایا بیٹا۔ زندگی میں شاید میں نے کبھی اتنا خسارے کا سودا کیا ہو جتنا.....“ عماد الدین نے بات ادھوری چھوڑ دی اور بے چینی سے بیٹی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”لیکن ان کے رہن بہن، بول

چال سے بالکل بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ اندر سے اس قدر پسماندہ ہوں گے یہ لوگ۔“

”کسی کے رہن بہن کا تب تک اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے گھر میں جا کر نہ دیکھا جائے، ہمارے یہاں تھا ہی کون جو ان کے گھر کیلئے حالات کی خبر ہوتی..... اپنے تئیں تو وہ بہت ماڈرن لوگ ہیں..... بے ہودہ ماڈرن۔“ روحا جلتے کلمے انداز میں بولی۔

”جوان بیٹا ماں کے کمرے میں سوتا ہے۔ بیوی کے کمرے میں جائے گا تو بے شرمی ہوگی۔ ماں کو دل کے دورے پڑنے لگیں گے، فرزان کی بہنیں کیسا لباس پہنتی ہیں آپ کو بس میں کیا، کیا بتاؤں۔ یہ سب ان کے نزدیک روشن خیالی ہے۔ داماد حضرات آئیں گے تو انہیں میرے ہی کمرے میں بٹھایا جاتا ہے گھر میں ڈرائنگ روم تو ہے ہی نہیں وہیں ان کی خاطر میں ہوں گی۔ وہیں کیبل چل رہا ہوگا اور واہیات پروگرام داماد، ساس کے ہمراہ دیکھ رہے ہوں گے۔ میں ایسے حالات میں کمرے میں کہاں بیٹھ سکتی ہوں۔ نہ جاؤں تو یہ الزام کے آنے والے مہمانوں سے ناک منہ چڑھاتی ہوں۔ چلی جاؤں تو یہ الزام کہ ہر وقت سر پر سوار رہتی ہوں۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کروں، کیا نہ کروں۔“ عماد الدین فکر و پریشانی سے بیٹی کی طرف دیکھتے رہے پھر توقف سے بولے۔

”میرا خیال ہے..... اس مسئلے کا حل مجھے فرزان میاں سے ہی لینا ہوگا آخر وہ خود چاہتا کیا ہے۔ وہ تمہیں..... بسائے گا بھی یا نہیں، میں فرزان کو گھر بلاتا ہوں۔“ روحا کو باپ کی تجویز پسند آئی۔

”ٹھیک ہے ڈیڈی..... لیکن فرزان کی امی نہیں آئیں گی فقط آپ فرزان کو ہی بلائیں گے اور ان سے دو ٹوک بات کریں گے۔“ عماد نے بیٹی کی صلح پاتے ہی داماد کو فون کر دیا۔ اتفاق سے فرزان اس وقت اپنے سی این جی پمپ پہ موجود تھا۔ عماد نے فون پر داماد سے نرم انداز میں بات چیت کی اور اپنا مدعا مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا۔

”بیٹا، میں چاہتا ہوں کہ آج شام کا کھانا تم

میرے ساتھ کھاؤ۔“ دو دن پہلے تو روحا جھگڑ کر گئی تھی اور تیسرے دن ہی سر کا فون آ گیا اس کا مطلب ہے شاہ صاحب کے عمل نے اثر دکھایا ہے۔ فرزان دل ہی دل میں سوچنے لگا اور اپنی ماں کے پیر سے متاثر ہونے لگا لیکن چونکہ وہ داماد تھا اس لیے اکثر تو اس نے دکھانی تھی۔

”میں کیسے آپ کے ساتھ آ کر کھانا کھا سکتا ہوں۔ کیا آپ کی بیٹی نے ہمارا تعلق اس قابل چھوڑا ہے۔“ داماد کے اس زہر خند جملے پر عماد الدین نے خون کا گھونٹ بھرا اور نرمی سے کہنے لگے۔

”دراصل میں چاہتا ہوں..... تمہارے اور روحا کے مسائل.....“

”میرے کوئی مسائل نہیں ہیں..... جتنے بھی مسائل ہیں آپ کی بیٹی کے پیدا کردہ ہیں۔ وہ میرے ساتھ گزارہ کرنا نہیں چاہتی۔ ابھی تک وہ اپنے عالیشان جہیز کے زعم میں ہے۔ میں اس کے سامان پر لعنت بھی بھیجنا پسند نہیں کرتا مگر وہ اپنی چیزوں کو ہم سب پر فوقیت دیتی ہے۔ اس کے نزدیک اس کا کمر اس قابل نہیں کہ اس کا شاندار فرنیچر اس میں سما سکے..... وہ کیا سمجھتی ہے۔ میں اسے علیحدہ کوشی یا بنگلے لے کر دوں گا تو یہ اس کی بھول ہے۔ کم از کم میں اس کے ایسے ارمان پورے نہیں کر سکتا۔“

”فرزان بیٹا یہ تمہاری غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ میری بیٹی کی ایسی کوئی فرمائش نہیں ہے۔ دراصل تمہارے گھر والے اور خاص طور پر تمہاری ماں.....“

”دیکھیے انکل، میں آپ کا بہت لحاظ کرتا ہوں۔ میری ماں کے متعلق بولنے سے پہلے سوچ لیجیے گا۔ میں اپنی ماں کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں۔“ فرزان کی دھمکی حقیقت سے قریب تھی۔ عماد کو لہجہ مزید ڈھیلا کرنا پڑا۔

”دیکھو فرزان، تم میری بات کا غلط مفہوم لے رہے ہو۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں ایسی باتیں فون پر نہیں ہوا کرتیں۔ تمہیں روحا سے جو شکایتیں ہیں وہ مجھے بتاؤ۔ میں ان کا ضرور ازالہ کروں گا۔“ فرزان ہنس دیا۔

”آپ کے ازالہ کرنے سے میرا گھر نہیں بستا۔ میرے گھر میں بسنے کے لیے آپ کی بیٹی کو اپنا گھمنڈ ختم کرنا ہوگا۔ میری ماں کو ماں سمجھنا ہوگا جو کہ اس نے آج تک نہیں سمجھا اور وہ سمجھ بھی کیسے سکتی ہے۔ اس نے ماں دیکھی ہوتی تو اسے ماں کی عزت و قدر کا احساس ہوتا پھر اس کے علاوہ آپ کی لازوال اور لایعنی محبت اسے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہونے دے سکتی۔ اس لیے آپ روحا کو ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔“ عماد الدین کا غصے کی شدت سے چہرہ سرخ ہو گیا۔

”اگر روحا نے تمہاری ماں کو ماں نہیں سمجھا تو تم

نے کون سا روحا کو بیوی سمجھ لیا..... چودہ ماہ سے میری بیٹی جس طرح نظر انداز ہو رہی ہے میں غافل نہیں ہوں اور تم نے کیا کہا کہ تمہیں اس کے ساز و سامان کی ضرورت نہیں تو پھر کیوں اس کے جہیز اور بری کا زیور تم لوگوں نے اپنی کسڈی میں لے رکھا ہے۔ زیورات پہننے کے لیے ہوتے ہیں یا لاکر میں رکھنے کے لیے۔ بتاؤ جواب دو.....؟“ فرزان کے پاس اس بات کا کافی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ڈھیس بنا سنتا رہا۔

”تمہیک ہے..... تم اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے حقوق پورے کرو..... ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوگا مگر بیوی کے حقوق کیا ہیں تمہیں اس چیز کا بھی علم ہونا چاہیے تھا اگر نہیں تھا تو تمہیں شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اب میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ اب تک تو میں یہی چاہتا تھا یہ ہمارا گھر یلو اور نجی معاملہ ہے اسے ہم خود حل کر لیں گے مگر شاید تم مثبت سوچ کے قائل نہیں ہو اور اس کا حل صرف علیحدگی ہی ہے۔ چاہے پھر مجھے روحا کے لیے ڈائیورس ہی کیوں نہ لینا پڑے۔“ انہوں نے طمطراق سے کہا اور کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ فرزان کے چھکے چھوٹ گئے۔ اب تک تو وہ آئیں بائیں شائیں ہانک رہا تھا لیکن اب اس کی عقل ٹھکانے آ گئی تھی۔

”ڈائیورس۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔ ظاہر ہے ڈائیورس کا مطالبہ کورٹ کے ذریعے ہی کیا جائے گا پھر کورٹ میں ان کے نجی معاملات بھی زیر بحث آئیں گے۔ ڈائیورس لینے کی روحا کے پاس

معتول وجہ ہے اور وہ وجہ ہے..... اس کی ازدواجی زندگی میں بے توجہی..... وکیل سوال کریں گے اور تب اس کے پاس ان باتوں کے کوئی جواب نہیں ہوں گے۔ فرزان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”کیا روحا اپنے باپ سے اتنی اونچ ہے..... کہ وہ ایسے معاملات بھی اپنے باپ سے ڈسلس کر لیتی ہے؟“ ادھر سیٹھ عماد الدین نے سر تھام رکھا تھا۔ وہ سخت غصے کی کیفیت میں تھے۔ روحا باپ کے نزدیک آ گئی۔

”کیا کہا ہے فرزان نے.....؟“ وہ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو کچھ بھی ہوگا میں خود دیکھ لوں گا۔“ عماد الدین نے بیٹی کو ٹالا تھا مگر روحا کی بے چینیان بڑھ گئی تھیں۔

”کیا.....؟ کیا کہا تم نے..... اس گھمنڈی سیٹھ کے گھر ماما جائیں گی۔ شرم نہیں آئی تمہیں یہ بات سوچتے ہوئے اگر تمہیں اپنی بیوی سے اتنا ہی عشق ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر تین دن بھی نہیں گزار سکتے تو ڈوب مرو..... مگر ماں کو تو بڑھاپے میں ڈیل نہ کرو۔“

”شمع آ پا، آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میرا مقصد ماما کو جھکانا نہیں ہے لیکن اگر میں ماما کے بغیر چلا گیا تو وہ ہر معاملے کا ذمے دار ماما کو ٹھہرائیں گے۔“

”سن رہی ہو شمع اور صبا اس کے الفاظ..... اس کی بیوی کے دل میں میرے لیے کتنا زہر ہے۔“ ارشاد بیگم نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ”جب تک تمہارا باپ زندہ تھا میں دکھوں کو پہچانتی تک نہیں تھی جب سے وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر گیا ہے سکی اولاد بھی دشمن بن گئی ہے میری۔“

”آپ ایسی باتیں مت سوچیں، یہ بھائی لاکھ آنکھیں بدلیں مگر ہم بیٹیاں آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑیں گی۔“ شمع اور صبا ہمدردی سے ماں کے نزدیک آ گئیں اور ماں کی دلجوئی کرتے ہوئے بولیں۔ ان حالات میں فرزان کیا کرنا حسب معمول سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اس کی نئی نئی گڑبستی برباد ہونے کی اکائی پر کھڑی

تھی صرف اور صرف ماں کی وجہ سے اور پھر بھی اس کی ماں مطمئن نہیں تھی۔ بقول بہنوں کے وہ بھی غیور کی طرح انہیں آنکھیں دکھانے لگا تھا۔

”اگر تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ..... اور شوق سے اپنے سر کی عدالت میں پیش ہو لیکن ماما تمہارے ساتھ کبھی نہیں جائیں گی۔“ فرزان چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ شادی سے پہلے کی زندگی کتنی اچھی تھی۔ کم از کم ماں، بہنوں کو اس پر اعتبار بھی تھا اور محبت بھی..... آئے دن اس کی شادی کے تذکرے گھر میں ہوتے تھے۔ چاندی دہن لانے کی باتیں..... کسی بڑے خاندان میں اس کی شادی کا چاؤ..... یہی شمع اور صبا آ پا تھیں جو اس کے لیے قریہ قریہ دہن ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔

غیور احمد اور اس کی بیوی سے انہیں جتنے بھی شکوے تھے اتنے ہی ارمان، فرزان سے تھے۔ تب تک وہ ہیر و تھا اور وہ بھی سوچا کرتا تھا وہ ضرور ماں، بہنوں کے ارمان و معیار پر پورا اترے گا لیکن نہ جانے کیا ہوا..... جیسے جیسے شادی کے دن قریب آتے گئے۔ آنے سے قبل ہی روحا میں کیڑے پڑتے چلے گئے۔ فرزان کے نزدیک بنیادی طور پر یہ معاملات خراب کرنے والے روحا کے والد تھے۔ فرزان کا دل اس بات پر صادق تھا کہ عماد الدین کو اپنی دولت کا گھمنڈ ہی بہت ہے۔ انہوں نے شادی کی ساری رسومات اپنی مرضی سے کرائیں۔ مختصر اور سادگی سے..... جب کہ فرزان کی بہنیں مہندی اور ایشن پر ٹھیک ٹھاک ناچ گانے کا اہتمام کرانے پر بضد تھیں لیکن عماد الدین نے ان خرافات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا..... نتیجہ یہ نکلا کہ شمع اور صبا نے بائیکاٹ کر دیا ارشاد بیگم دل ہی دل میں خار کھا رہی تھیں۔

شادی تو جیسے تیسے طے پا گئی لیکن بعد میں بھی روحا کے باپ نے کسر نہیں چھوڑی ہر دو گھنٹے کے بعد فون کر کے بیٹی کی خیریت دریافت کرنے کی تک کیا بنتی تھی..... اگر باپ فون نہیں کرتے تو بیٹی فون کر کے سارے حالات باپ کو بتاتی..... باپ پھر بیٹی کو گائیڈ کرتے اور

اس کے مطابق روحا کا دن گزرتا۔ یہ ساری کارگزاریاں ارشاد بیگم دیکھتیں اور تپ جاتیں۔

”آخر ایسی بھی کیا تکلیف ہے تمہاری بیوی کو جو ہر وقت کان سے موبائل لگا رہتا ہے۔ ایسے کون سے دکھڑے ہیں جو وہ باپ کو سناتی رہتی ہے۔ اپنی مرضی سے سوتی ہے، اپنی مرضی سے اٹھتی ہے گھر کا سارا کام میری بیٹی کرتی ہے۔ میرے گھر میں جو کچھ پکتا ہے وہ یہ کھاتی نہیں۔ باپ، ہونٹوں کا کھانا بھیجتا ہے۔ وہ یہ بیگم صاحبہ تناول فرماتی ہیں اگر اسے ہمارے ہاتھ کا پسند نہیں آتا تو خود کیوں نہیں پکا لیتی.....!“

”تو آپ اسے کہیں کہ وہ گھر کا کام کاج کیا کرے۔ آخر یہ بیٹی بھی کل کو چلی جائے گی تو سارا گھر روحا نے ہی سنبھالنا ہے۔“ فرزان نے تو اپنی طرف سے اچھی ہی بات کی تھی لیکن ارشاد بیگم کو سارا گھر سنبھالنے والی بات ہضم نہیں ہوئی۔ سانپ کی طرح پھنکار کر بولیں۔

”اس گھر کی مالکن میں ہوں اور وہ کیا گھر سنبھالے گی..... دو دن کے لیے ہوٹل میں قیام کرنے آتی ہے تیسرے دن صبح سویرے ہی ڈرائیور منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ آٹھ دس دن کی چھٹی..... میاں، اس طرح گھر نہیں بستے آج کل کے دور میں کون چھوڑتا ہے۔“

اب فرزان کیا کہتا۔ تیسرے دن اگر روحا یہاں رک جائے تو گھر میں قیامت صغریٰ پھا ہو جاتی ہے۔ کیا وہ یہ حالات اپنے باپ کو نہیں بتاتی ہوگی جا کر..... ٹھیک ہی تو کرتے ہیں وہ جو ہر تیسرے دن بیٹی کو بلا لیتے ہیں۔

”جب میں تم سے بات کرتی ہوں..... جب تمہیں چپ لگ جاتی ہے نہ جانے کلمو ہی نے گھر میں داخل ہوتے ہی کون سے تعویذ گاڑے ہیں کہ تمہاری زبان ہی سل گئی۔“ ارشاد بیگم تھوڑی دیر بعد ہی کمرے میں آگئیں اور بیٹے کے قریب بیٹھ گئیں۔

”ہم تو رشتے داری کر کے پھنس گئے ہیں۔“ فرزان تعظیم سے ماں کے فرمودات سنتا رہا۔

”اگر تمہارا دل کرتا ہے تم روحا کے باپ سے ملنے جا سکتے ہو۔ میں تمہیں روکوں گی نہیں۔“ ارشاد بیگم نے

بیٹے کو گم صم پا کر احسان کا ٹوکرا بیٹے کے سر رکھا۔

”نہیں ماما..... میں نہیں جاؤں گا جو لوگ آپ کی عزت نہیں کرنا جانتے ان سے میرا بھی کوئی تعلق نہیں۔“ ارشاد بیگم دل ہی دل میں بہت خوش ہوئیں لیکن اس خوشی کو چھپا کر بولیں۔

”مجھے پتا ہے تم میرے سب سے لائق بیٹے ہو اور مجھے تم پر شروع سے مان ہے اب یہ اداسی کا لبادہ سر سے اتار دو اور روحا کو فون کر دو کہ وہ جیسے گئی تھی ویسے ہی واپس آ جائے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں سیٹھ عماد الدین کی عدالت میں مجرم بننے کی۔“ ارشاد بیگم کا انداز حتمی تھا۔ فرزان کو حوصلہ ہوا وہ کون سا وہاں جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا وہ تو خود سہرا صاحب کے سامنے خود کو احساس کمتری میں مبتلا پاتا تھا اور اس احساس کمتری کو مٹانے کے لیے وہ ہر چندان سے اکھڑا ہوا رہتا۔ اس بات کو صرف روحا ہی سمجھ سکتی تھی لیکن روحا تو تب سمجھتی جب وہ ساس اور باپ کی کشاکش سے نکل پانی۔ ایک طرف ساس ہٹ دھری برتی ہوئی تھیں دوسری طرف باپ..... جب کہ اسے باپ ہی اپنے سب سے بڑے ہمدرد لگتے تھے پھر وہ کیونکر باپ کے سحر سے نکل پانی۔

”ڈیڈی..... فرزان کا فون آیا تھا۔“ روحا متذبذب و پریشان سی کھڑی تھی۔ عماد الدین فکر مندی سے بیٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ نہ جانے فرزان نے کیا کہا تھا جو اس کا چہرہ اتنا مغموم ہو رہا تھا۔

”اب ضرورت محسوس ہوئی اسے فون کرنے کی۔“

”کیا کہا ہے اس نے تمہیں.....“ وہ ذرا طیش میں آگئے تھے۔ روحا نے باپ کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں کہہ رہے تھے..... رور ہے تھے۔“

”کیا..... فرزان رور ہا تھا.....“ عماد الدین کو دھچکا

لگا تھا۔ ”وہ مرد ہو کر حالات کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔“

”سوے بہا رہا ہے تو تم کیسے حالات کو کنٹرول کر پاؤ گی۔“ انہوں نے غصے میں اپنی ہتھیلی پر مکا مارا۔ ”کس لیے سوے بہا رہا تھا وہ.....؟“ عماد الدین بیٹی کو بدستور

مغموم پا کر کچھ نارمل ہوئے۔

”پتا نہیں.....“ روحا خود ابھی ہوئی تھی۔ ”کہہ

رہے تھے میرے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”تو گویا تم سمجھو گی اس کے مسائل کو وہ خود نہیں

کہے گا.....!“ وہ پھر طیش میں آگئے۔

”آپ یقین کریں ڈیڈی، فرزان کی ایک نکل

کی حیثیت نہیں ہے گھر میں..... سارا حکم ان کی ماں کا

پتا ہے یا پھر بہنوں کا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، رہ لے وہ ان کے ساتھ۔“

”میں سوے بہا کر کیوں دکھا رہا ہے وہ..... مردوں

کے یہ کام ہوتے ہیں۔“ وہ ہنوز غصے میں تھے۔

”فرزان کے علاوہ گھر میں کوئی مرد بڑا نہیں جس

سے بات کی جائے۔ بھلا میں اس عورت کے کیا منہ

لگوں۔ بہت بد زبان اور چلتی عورت ہے۔ میری پھول

ی بیٹی نہ جانے کن لوگوں میں پھنس گئی۔“

”ڈیڈی..... فرزان مجھے لینے آرہے ہیں لیکن وہ

کہہ رہے تھے کہ وہ یہاں اندر نہیں آئیں گے اور نہ ہی

میں گھر جا کر کسی کو علم ہونے دوں گی کہ میں ان کے

ساتھ آئی ہوں۔“

”تو گویا وہ میرا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ نہ جانے

کس احساس کمتری میں مبتلا ہے جو سامنا کرنے سے

کتراتا ہے۔“

”ماں کی چابی ہی اتنی سخت ہے جو وہ چاہیں گی

وہی ہوگا۔“ روحا نے باپ کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”مگر اس کا آنا ماں کی چاہت نہیں ہے۔ اس

بات کو پک کر رو رو جا بیٹا۔ وہ تمہیں بسانا ضرور چاہتا ہے

..... لیکن اس میں اپنی یاں بہنوں کا سامنا کرنے کی

امت نہیں ہے اور یہ ہمت تمہیں دینا ہوگی اسے۔“

”مم..... میں..... کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی

آپ..... میں ان چندال عورتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

روحا روئے لگی تھی۔

”دیکھو روحا بیٹا..... پوں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر

اپنے نصیب سے ہار جانا ٹھیک نہیں ہے۔ میرا بالکل دل

نہیں مانتا..... لاکھوں کا جہیز وہاں چھوڑ کر تم یہاں لٹی پٹی

سی بیٹھی رہو۔ ہمارے اسٹیشن اور ان کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ فرق جیسی مٹے گا جب تم اس کے ساتھ رہو گی اور فرزان یہاں آئے گا۔ مجھے لگتا ہے فرزان کو ہمارے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ میں نے سوچا ہے میں تمہیں روزانہ ڈنر پر انوائٹ کر لیا کروں گا۔ دو مہینے گھنٹے فرزان ہمارے ساتھ گزارے گا تو اس کا برین واش ہوگا، اس کی سوچ میں سلجھاؤ آئے گا اور اسے پتا چلے گا کہ میں اپنی بیٹی کا گھر بسانا چاہتا ہوں، اجاڑنا نہیں۔ تم ایسا کرو تیار ہو جاؤ اور فرزان سے کہو..... اسے آنے کی ضرورت نہیں۔ تم خود آرہی ہو۔ گھر میں کسی کو پتا نہ چلے وہ اس خجالت سے بھی بچے گا اور تمہارا مشکور بھی ہو جائے گا۔“ روحا کو باپ کی بات سمجھ آگئی اور وہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔

۵۵۵۵

روحا کو اچانک گھر کی دہلیز پر دیکھ کر ارشاد بیگم اور ان کی بیٹیاں دنگ رہ گئیں۔ انہیں ذرا بھی امید نہیں تھی کہ روحا وہی دن میں واپس آجائے گی۔

”دیکھا ماما..... میں نہ کہتی تھی۔ بنگالی بابا کے

تعویذوں میں بڑی تاثیر ہے۔ ان تعویذوں سے تو باپ

بیٹی کے دماغوں پر وہ اثر ہوگا کہ سوچنا سمجھنا بھی بھول

جائیں گے۔“ شیخ نے ماں کے کان میں کہا تو صبا نے

اسے چٹکی کاٹی کیونکہ روحا ادھر ہی آرہی تھی۔ روحا

سیدھی اسے کمرے میں چلی گئی۔ ارشاد بیگم تملاکر رہ

گئیں۔ وہ گھر میں داخل ہو کر کبھی سلام نہیں کرتی تھی۔

ارشاد بیگم کو اپنی حیثیت کا یوں بے وقعت ہونا بالکل

پرداشت نہیں ہوا تھا مگر وہ اس وقت برداشت کر گئی

تھیں۔

”دل تو کر رہا ہے پوچھوں بڑی اکڑ دکھا کر گئی

تھیں۔ اب کیوں آگئیں..... مگر بیٹے کی طرف دیکھتی

ہوں تو دل پر سانپ لومتے ہیں نہ جانے ناگن نے کون

ساعلم کیا ہے میرے بھولے بھالے فرزان پہ کہ اس کی

زبان ہی بند ہو کر رہ گئی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں ماما..... زبان تو اب اس کی بھی

ایسی بند ہوگی کہ یہ آپ کے اشاروں پر ناچے گی۔“ شیخ

اترائی تو ارشاد بیگم چڑ گئیں۔

”تم اپنے بنگالی بابا کا ذکر اپنے تک ہی رکھو ہمارے شاہ صاحب کو پتا چل گیا تو قیامت آ جائے گی۔ ایک طرف سے عمل چلتا رہے وہی بہتر ہے۔“

”ماما آپ تو خواخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ بنگال کا جادو دنیا بھر میں مشہور ہے اور بنگالیوں کا جادو سرچڑھ کر بولتا ہے۔“

”اچھا شمع آ یا، اگر بنگالیوں کا جادو اتنا ہی سرچڑھ کر بولتا ہے تو بنگالی لوگ اپنی بھوک افلاس کا خاتمہ جادو سے کیوں نہیں کر لیتے..... کیوں تیسری دنیا کے پست لوگوں میں شمار ہوتا ہے ان کا۔ انہیں تو ورلڈ کا ڈان ہونا چاہیے تھا۔ وہ محبوب کو قدموں میں گرانے کا دعویٰ کرتے ہیں تو امریکا کو..... جو دنیا بھر کا محبوب ہے اسے قدموں میں کیوں نہیں گرا لیتے۔ کیوں تیسری دنیا کے بھوکے، ننگے لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنی روزی روٹی کر رہے ہیں..... ہونہ بنگالی جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے..... وہ سفلی علم سے لوگوں کا بھلا کریں گے۔“

”ظہور..... اپنی زبان بند رکھو..... جس بات کا تمہیں پتا نہیں..... اس بات میں بولتے کیوں ہو۔“

”کیوں نہ بولوں.....؟ گھر میں کوئی جگہ ایسی ہے جہاں تعویذ نہ بندھا ہو۔ سب کو پتا ہے یہاں میرے دوستوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ کالج میں وہ میرا کتنا مذاق بناتے ہیں اس بات کا اندازہ ہے کسی کو..... دنیا چاند پر جا رہی ہے اور ہمارے گھر میں وہی پڑھا ہوا انڈا، پڑھی ہوئی ریت، کنکریاں، طشتریاں، تعویذ یہی موجودات رہ گئے۔ کیا فائدہ حاصل ہو رہا ہے آپ کو ان باتوں سے اگر دنیا کے معاملات جادو سے حل ہو سکتے تو جادوگر دنیا کے بادشاہ ہوتے۔ وہ یوں فنٹ یا تھ پر پڑے نظر نہ آتے..... یہ نجومی، یہ درویش..... اچھی طرح جانتا ہوں میں ایسے لوگوں کو صرف پیسہ بٹورنا جانتے ہیں یہ لوگ اور ان کا وسیلہ آپ جیسی شوقین خواتین بن جاتی ہیں۔ آج اگر میں ایک جینز کے لیے ماما سے پیسے مانگ لوں تو ان کے پاس پیسے نہیں ہوں گے مگر عالموں کی جیبیں بھرنے کو ان کے پاس بڑا سرمایہ ہے۔“ سب سے چھوٹے بیٹے

کی اتنی زبان نکل جائے گی ارشاد بیگم کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ ارشاد بیگم کی توجہ اس کی تربیت پر کہاں تھی۔ وہ تو اور ہی چکروں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ آنکھیں پھیلانے جامد سی بیٹے کو دیکھتی رہی ہیں۔ البتہ شمع اور صبا سے چپ نہ رہا گیا۔

”آخر تم نے بھی اپنی حیوانیت دکھلا ہی دی۔ تم کون ہوتے ہو ماما سے کچھ مانگنے والے۔ ماما ہر چیز کی مالک ہیں..... وہ جہاں چاہیں خرچ کریں۔ تم کون ہوتے ہو حساب کتاب لینے والے۔“

”ٹھیک ہے..... اگر ماما کے پاس میری ذات پر خرچ کرنے کے لیے نہیں ہے تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ظہور مڑا پھر واپس پلٹا۔ ”اس کے ساتھ ایک بات اور بھی روز بھانت بھانت کے جادو گروں سے ملنے سے بہتر ہے ایک مستقل جادوگر اپنے گھر میں لا کر بٹھالیں چاہے وہ بنگالی ہے یا ہندو یا پاکستانی یا کوئی اور سو رہا..... میں دیکھتا ہوں اس گھر کے کتنے مسائل حل ہوں گے یا پیچیدہ ہوتے جائیں گے۔“ اس کے ساتھ ہی ظہور گھر سے نکلتا چلا گیا۔

فرزان گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے ظہور کی آخری بات سنی تھی۔ ظہور اتنی تیزی میں تھا کہ وہ اسے روک بھی نہ سکا۔ ظہور کتنا سچ بول گیا تھا۔ کاش اتنا جرات مند وہ بھی ہوتا مگر وہ سچ کیسے بول سکتا تھا۔ اسے تو اس کا لالچ خاموش رکھنا تھا اور یہ خوف کہ ماں اسے غیور احمد کی طرح بے سرو سامان گھر سے نہ نکال دے..... وہ کیسے اتنی مشقت کا سامنا کرے گا۔ ہر چیز کی مالک و مختار ماں تھی۔ ماں کی نظروں میں سرخرو ہوگا تو جائیداد کا حصہ دار بن سکے گا ورنہ..... مفلسی اور تنگ دستی اس کی منتظر تھی..... اس نے جو عیش و آرام میں آنکھ کھولی تھی کیونکر ایسی زندگی کا تصور کر سکتا تھا۔ جہاں سختی اور مشقت ہی مشقت تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی بڑے بھائی کی زندگی سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ جس کے بیوی بچے تنگ دستی کا شکار تھے اور یہ سب غیور احمد کی نادانیوں کا نتیجہ تھا اگر وہ سیاست سے کام لیتا تو اب بھی اس کے لیے اس گھر

میں جگہ تھی۔ اس نے پہلے ہی روز سے بیوی کی حمایت شروع کر دی تھی۔ اس حمایت کے نتیجے میں علیحدگی اس کے حصے میں آئی۔

ارشاد بیگم کو بڑے بیٹے سے اس قدر نفرت ہو چکی تھی کہ اٹھتے بیٹھتے اسے بد دعائیں دیتی تھیں۔ وہ ان بد دعاؤں سے بھی ڈرتا تھا۔ وہ اس گھر سے نکلنا نہیں چاہتا تھا اور یہی وجوہات تھیں کہ وہ روحا سے تعلق صحیح طرح جوڑ نہیں سکا تھا۔ وہ اس بات سے بھی گھبراتا تھا اگر روحا سے کوئی بچہ ہو گیا تو ماں جینا حرام کر دیں گی۔ ابھی تھوڑا اور وقت نکل جائے ماں کے دل میں روحا کی محبت پڑ جائے مگر یہ بالکل ناممکن تھا۔ ادھر ارشاد بیگم جتنی بھی یقین رکھتی تھی کہ ان کا فرزان ان تعویذ کندوں کی بدولت روحا کے قریب نہیں جاتا جو وہ دن بھر کی مشقت سے اکٹھا کرتی ہیں۔ جب کہ ارشاد بیگم بیٹے کی نیت کو نہیں جانتی تھی کہ بیٹے پر کس چیز کا جادو چل رہا ہے۔ سب سے بڑا جادوگر تو وہ پیسہ ہے جو انسان کو اللہ کا غلام بنا دیتا ہے..... اپنی ہی نظروں میں گرا دیتا ہے۔ بے ضمیری کی یہ زندگی فرزان کے لیے کسی بوجھ سے کم نہیں تھی۔

”فرزان..... فرزان، باہر کیوں کھڑے ہو جلدی اندر آؤ..... ماما بے ہوش ہو گئی ہیں۔“ فرزان ضمیر کی عدالت میں نہ جانے ابھی کتنی دیر کھڑا رہتا کہ بہنوں کی آواز پر چونکا..... اور ماں کی طرف بھاگا جو واقعی ظہور کے صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو چکی تھیں۔

ۛۛۛ

علی زمان نے دو ہزار روپے کیسے اکٹھا کیے تھے اس بات کا اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ بارہا یہ بوجھ مٹانے کے لیے اس نے اپنے دل کو سلی دی تھی کہ وہ اپنی بہن کو اس سے بھی اچھی اور تمہنگی بالیاں بنوادے گا اس نے زندگی میں پہلی بار چوری کی تھی مگر..... یہ چوری اس نے صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے تو نہیں کی تھی۔ سب کے بھلے کے لیے کی تھی۔ اس موذی مرض سے جان بھرانے کے لیے کی تھی جو موروثی تھی یعنی غربت۔

پھر بھی اس نے تعمیل کی اور تیسرے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں چند لوگ اور بھی تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو درویش بابا نے اس کی طرف اور اس نے درویش بابا کی طرف دیکھا۔ لمبی داڑھی، لمبے بال، بڑا سا چولا پہنے ایک ادھیڑ عمر شخص رنگ برنگے پتھروں کی مالا ڈالے لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ علی زمان کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”دولت کی خواہش میں یہاں آئے ہو؟“

علی زمان دنگ رہ گیا۔ ابھی تو اس نے کچھ کہا بھی نہیں تھا اور بابا اس کا حال دل جان گئے تھے۔

”بیٹھ جاؤ..... ابھی تمہیں نمبر بتاتے ہیں۔“

اتنا کہنا تھا علی زمان کی ہتھیلیوں اور پیروں کے ٹکڑے سینے سے بھگ گئے۔ اس کمرے کی آب و ہوا میں عجیب سی خوشبو رچی تھی۔ لوبان اور حرمل کی دھونی جس سے علی زمان یکسر نابلد تھا۔ وہ خوشبو علی زمان کے دماغ میں چڑھنے لگی اور اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔

”گلتا ہے یہ شخص واقعی عامل ہے۔ ڈھونگی نہیں ہے جی تو بن بتائے ہی میرے دل کا حال جان گیا۔“

مگر علی زمان یہ نہیں سوچ سکا کہ یہ پانچ دروازے جو ہیں مختلف ضرورتوں کے لیے منقسم ہیں جس دروازے سے اندر جانے کے لیے کہا گیا تھا وہ اسی کے لیے تھا۔ یعنی دولت مند بننے کے خواہشمند لوگوں کے لیے۔ اللہ کے سوا تو کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا حال دل نہیں جان سکتا باہر بیٹھے مست حال شخص مست نہیں ہیں یہ لوگوں کو بے غرض ہو کر دکھاتے ہیں لیکن دراصل یہ سارے درویش بابا کے کارندے ہیں جو درویش بابا کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

وہ آستانے میں داخل ہوا تو ایک وسیع و عریض صحن تھا صحن کے ایک طرف ایک لمبی سی راہداری تھی جس میں عقیدت مند بیٹھے تھے۔ اس راہداری میں قریب قریب پانچ دروازے تھے جو ایک ہی کمرے میں کھلتے تھے۔

علی زمان ایک دروازے سے اندر داخل ہونے لگا تو سر جھکائے بیٹھے ہوئے مست حال شخص نے علی زمان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”پہلی بار آئے ہو؟“

”جی..... جی ہاں۔“ وہ رک کر بولا۔

”ہونہہ.....!“ مست حال شخص مسکرایا۔

”کیا معاملہ ہے؟“

”درویش بابا سے ملوں گا تو انہیں بتا دوں گا۔“

”ہم بھی درویش بابا کے مرید ہیں اور ہم یہاں لوگوں کی خدمت کے لیے ہی بیٹھے ہیں۔ یہ پانچ دروازے دیکھ رہے ہو۔ ہر شخص ان دروازوں سے اندر نہیں جاسکتا۔“

”کیا مطلب؟“ علی زمان خود کو گھبرایا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

”گھبراؤ نہیں..... درویش بابا کے پاس آئے ہو تو مراد پا کر ہی جاؤ گے۔ مگر ابھی تمہیں یہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑے گا جب باری آئے گی جب جانا۔“ یہ کہہ کر وہ شخص اپنے حال میں پھر سے مست ہو گیا۔ علی زمان وہیں بیٹھ گیا۔ لوگ ان دروازوں سے آ جا رہے تھے۔ لوگوں کا اتنا رش دیکھ کر علی زمان دل کو تسلی ہونے لگی۔ ”ضرور یہاں کمالات و معجزات ہیں جی لوگ اتنی عقیدت سے آ جا رہے ہیں۔“

”کیا درویش بابا پرائز بانڈ کا نمبر صحیح بتا دیتے ہیں.....؟“ مست آدمی سر جھکائے جھکائے مسکرایا اور تسبیح چلاتا رہا لیکن اس نے علی زمان کو کوئی جواب نہیں دیا۔ علی زمان کو بے چینی ہونے لگی۔ تھوڑی دیر میں اس شخص نے تسبیح ختم کر لی اور آہستہ سے بولا۔

”چپ چاپ تیسرے دروازے سے اندر چلے جاؤ۔“ علی زمان نے پہلے اس شخص کو دیکھا پھر دروازے کو..... بظاہر تو سارے دروازے ہی ایک جیسے تھے لیکن

جاری ہے



قسط نمبر 2

ناولٹ

کچی گاڑوٹ گئی

میمونہ خورشید علی

”یہ چندہ ہے..... جو ہم فقیروں کی کفالت کے لیے ہے، بابا کو ان پیسوں کی ضرورت نہیں ہے انہیں وہاں پڑا دل دوں“ علی زمان کھیا سا گیا پھر اٹھ کر پیسے صندوقچی میں ڈال دیے پھر بابا کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

علی زمان، درویش بابا کی قابلیت سے اتنا متاثر ہوا کہ خود ہی دو ہزار روپے درویش بابا کی طرف بڑھا دیے اس کی اس حرکت پر ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور ڈپٹ کر بولا۔

”بچہ، تیرے ستارے آج کل گردش میں ہیں تو اس وقت سونے کو بھی ہاتھ لگائے گا تو وہ مٹی بن جائے گا، اپنی مراد پانے کے لیے تجھے چند دن انتظار کرنا ہوگا۔“

”کتنے دن بابا.....؟“ علی زمان کو اپنی آواز گہرائی سے آتی محسوس ہوئی۔

”صرف چند دن..... جیسے ہی زحل، مشتری کے قریب سے گزرے گا، تیرا ستارہ آزاد ہو جائے گا۔“

”زحل، مشتری کے قریب سے گزرے گا۔“ علی زمان نے تعجب سے جملے زیر لب دہرائے۔ وہ فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا زحل اور مشتری کا نام تو وہ بھی جانتا تھا پوچھ بیٹھا۔

”بابا..... آپ فلکی علم بھی جانتے ہیں۔؟“ درویش بابا تھوڑا سا مسکرائے۔

”فلکی علم کے ذریعے ہی تو ہم تدبیریں کرتے ہیں۔“

”مگر.....!“ علی زمان ابھی کچھ اور بولنا چاہتا تھا بابا کو غصہ سا آگیا۔

”اگر تم نے ہم سے معاملہ درست کرانا ہے تو ہم سے الٹے سیدھے سوال مت کرنا..... اب جاؤ..... چاند کی آخری تاریخ کو ہمارے پاس چکر لگانا.....“ علی زمان خاموشی سے وہاں سے اٹھ گیا آستانے سے نکلے ہوئے اس کا دل گواہی دے رہا تھا اس کی مراد ضرور پوری ہوگی۔

اور پھر یہی ہوا اگلی بار درویش بابا نے اسے نمبر دے دیا۔ نمبر اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا گویا ہفت اقلیم کی دولت آگئی تھی، وہ ہر پندرہ دن کے بعد قسمت آزمائے نکل پڑتا اور پانچویں بار بھی جب اس کا نمبر نہ لگا تو وہ سخت کبیدہ خاطر ہوا اس بار صرف ایک نمبر سے اس کا بچیس لاکھ کا انعام رہ گیا تھا اسے رہ رہ کر ملال ہو رہا تھا انعام نہ نکلنے پر..... درویش بابا نے کتنے بڑے بڑے دعوے کیے تھے وہ تو پانچ بار اپنی قسمت آزمایا تھا بالآخر اس نے درویش بابا کو فون کیا۔ درویش بابا نے اسے اپنے پاس بلایا اور سخت غصے میں کہنے لگے۔

”تیرے ستارے گردش میں آگئے ہیں، اس میں ہمارا کیا قصور ہے کیا تو مشیت ایزدی سے لڑ سکتا ہے یا کر.....!“ علی زمان ان کے جلال کے آگے ہم سا گیا۔ اس کی قسمت واقعی..... خراب تھی اول تو کوئی کام بنتا نہیں تھا، بننے لگا تھا تو ستارے گردش میں آگئے اسے پُر ملال دیکھ کر بابا کھٹکھارے اور کہنے لگے۔

”اب ہم تیرے پیچھے پڑھائی کریں گے.....“

نیا نمبر ہے اس کے بارے میں کسی کو پتا نہ چلے۔“ علی زمان کا چہرہ پھر سے کھل گیا۔

”لیکن ہم جب تک پڑھائی نہیں کر سکتے جب تک تم اپنا صدقہ نہیں دو گے جتنا زیادہ صدقہ دو گے اتنی جلدی تمہاری جان اس مصیبت سے چھوٹے گی۔“ علی

زمان سوچ میں پڑ گیا پھر ہزار روپے جیب سے نکال کر صندوق میں ڈال دیے۔ آستانے سے نکلے ہوئے وہ سوچ رہا تھا ایگزیم سر پر ہیں وہ فیس کہاں سے بھرے گا۔

II II II

”جانتا نہیں کریموں..... زمین کو کیا ہو گیا ہے۔؟“

ون سے اس کی عجیب ہی حالت ہو رہی ہے کچھ روز پہلے اسے بخار چڑھا تھا۔ کجخت ایسا بخار کہ بچی سدھ بدھ ہی بھول گئی تھی۔ لیکن اب تو بخار بھی اتر گیا مگر نہ جانے کیا ہوتا جا رہا ہے..... ڈرنے لگی ہے ساری رات اسے نیند نہیں آتی..... ہر وقت روتی رہتی ہے پر منہ سے کچھ نہیں بولتی..... میری بچی اچھی بھلی تھی مجھے تو دوسو سے

آرہے ہیں..... کہیں میں نے جھارو مائی کے پاس جا کر کچھ غلط تو نہیں کر دیا۔“ کریموں نے زمین کو دیکھا تو

دل تھام لیا..... اس کا کھلا ہو چہرہ بالکل زرد پڑ رہا تھا آنکھیں ویران اور خوفزدہ تھیں ہونٹ سیاہ پڑ رہے تھے۔

”ہائے..... رہا..... یہ جھلی تو بہت ہی ”ماڈی“ کمزور ہو گئی ہے..... تو اسے مائی کے پاس لے کر کیوں نہیں گئی.....؟“

”نہیں کریموں..... میں اسے مائی کے پاس لے کر نہیں جاؤں گی مجھے لگتا ہے مائی کے عمل سے میری بچی کے دل وماغ پہ کچھ ہو گیا ہے..... رشتے نہیں آتے

..... نہ آئیں پر یہ کجخت کھاٹ سے کیوں لگ گئی.....“ دادی رونے لگیں۔

”صدیقین..... تیرے دل کا وسوسہ ٹھیک نہیں ہے تو نے اپنی بچی کا علاج شروع کر لیا ہے تو اسے بچ

اں ادھورا نہ چھوڑ..... اس طرح تو یہ پاگل ہو جائے گی۔“

”ہو سکتا ہے..... یہ چھیٹے میں آگئی ہو۔“

”چھیٹے کا علاج تو جھارو مائی منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اگر مائی یہ تیرا دل نہیں تو کسی اور ملا کو دکھالے

پر اتنا کہوں دیر مت کرنا ضرور کچھ اثر وثر ہے تیری جان پہ جلدی خبر لے لینا..... کہیں بہو کی طرح اس سے

اگلی ہاتھ دھولو۔“ کریموں کی بات یہ دادی نے دل تھام لیا۔ وہ اپنی پوتی کی حالت پہ بہت دل گرفتہ تھیں۔

جھارو مائی کے ہاں جانے کا فوراً ہی فیصلہ کر لیا۔

II II II

جھارو مائی نے بڑی تسلی سے زمین کو دیکھا..... زمین خوف سے لپٹی کٹی ایک طرف بٹھکی تھی

اس بات سے لائق کہ وہ کہاں بیٹھی ہے اس کے ذہن تو صرف ایک ہی خوف چمٹا تھا۔

ملکونے اس کے ساتھ زیادتی کی پھر اسے دھمکا یا اور اپنی حیثیت کا اس پر رعب بھی ڈالا۔

نوٹے قدموں سے زمین گھر آئی تو دادی گھر پر نہیں تھیں وہ اندر کوٹھری میں جا کر گر گئی اور خوب

روئی..... یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئی۔ دادی جب گھر آئیں تو وہ لپٹی بچی کوٹھری میں پڑی تھی اور بخار میں

رہی تھی، دادی نے اس کی حالت دیکھی تو دل تھام لیا۔ آج تک تو وہ اچھی بھلی تھی۔ یہ اچانک اسے کیا ہو گیا

لہذا فوری طور پر تو یہی سوچا کہ حکیم کی رکھی ہوئی پڑیا دادی جو اکثر وہ اپنے لیے رکھتی تھیں شام تک اس کا بخار

اسی طرح رہا تو دادی کو تشویش نے آن گھیرا اور وہ حکیم کو گھر لے آئیں، حکیم نے اسے مزید داد دے دی۔

”بخار کی شدت کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہے، اللہ دوا سے بخار اتر جائے گا۔“ حکیم تسلی دے کر چلا گیا مگر دادی کو تسلی نہ ہوئی۔

زمین کیسے کسی کو بتاتی..... کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ حکیم کی دوا سے اس کی کچھ آنکھیں کھلیں تو دادی نے شکر کا کلمہ ادا کیا اور اسے زبردستی جائے یلائی۔ دوا

کے بعد دادی نے اسے لٹا دیا، زمین بالکل گم صم تھی دادی ادھر ادھر ہوئیں تو زمین کے آنسو نہ تھے دادی سامنے

آ جاتیں تو زمین خود کو سمیٹ لیتی..... آنکھیں بند کرتی تو وہی بھیا نک منظر آنکھوں میں اتر آتا..... وہ ڈر کر

آنکھیں کھول دیتی، دادی کی آنکھ کھلتی تو زمین کو جاگتا یا تیں وہ پریشان ہو جاتیں اور اسے سلانے کی

کوشش کرتیں۔

”سو جا میری دھی نیند تیرے لیے بہت اچھی ہے۔“ مگر زمین کیسے سو سکتی تھی وہ اتنی خوف ناک

حقیقت سے گزر کر آتی تھی کہ اب اس کی آنکھیں بند نہیں ہوتی تھیں۔ دادی مطمئن ہو کر خراٹے بھرنے لگیں تو

زمین کی سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں دادی چونک جاتیں اس کی چارپائی پر آکر بیٹھ جاتیں پھر خود بھی

رونے لگیں۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے زمین..... تو کیوں رورہی ہے میری بچی..... مجھے کچھ بتا تو سہی.....“ پر زمین کے

آنسو نہ رکتے۔

اور پھر یونہی کئی روز گزر گئے اس کی زبان سل گئی تھی اور آنکھیں سمندر بن گئی تھیں۔ جھارو مائی نے اچھی

طرح اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

”کہاں..... کہاں جاتی ہے تو.....؟“ زمین نے چونک کر جھارو مائی کی طرف دیکھا۔ سوکھا لبوتر ا جھریوں

زدہ گہرا سا نولا چہرہ اور بڑی بڑی سفید خوفزدہ کر دینے والی آنکھیں، بال سرخ، بالوں کی لٹیں چہرے کے گرد

پڑی تھی اور وحشت میں اضافہ کر رہی تھیں۔

”بول کہاں گئی تھی.....؟“ جھارو مائی نے اب کی بار مزید رعب دار لہجے میں پوچھا۔

”بولتی کیوں نہیں..... بتا.....!“ جھارو مائی کی بوڑھی پاٹ دار آواز زمین کی سماعتیں چیرنے لگی۔

”میں اچھی طرح جانتی ہوں تو کہاں گئی تھی صرف اتنا بتا دے کہ کون سا پہر تھا.....؟“ زمین خوفزدہ ہو کر خود

ہی میں سمٹ گئی۔ وہ غم سے نڈھال ضرور تھی مگر اپنا داغ کسی کو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

”کیا داوی یہ دکھ سہہ پائیں گی اور گاؤں والے تو سنگسار ہی کر ڈالیں گے..... نہیں..... نہیں میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ وہ جھارو مائی کے سوالوں سے گھبرا کر بھاگنے لگی تو مائی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بڑی سرکشی ہے تجھ میں۔“ زمین نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو یہ بدتمیزی کریموں کو بالکل پسند نہیں آئی..... وہ زمین کو ڈپٹنے لگی۔

”تو چپ کر جا..... کرنے دے اسے ہیکڑی..... جھارو نام ہے میرا ابھی اسے قید نہ کر لیا تو دیکھنا.....“ اس کے ساتھ ہی جھارو مائی نے ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور زمین کی طرف بڑھائی اور چلا کر بولی۔

”کون ہے تو اور اس بچی کے اندر کیوں گھسا ہے۔“ یکدم زمین نرم پڑ گئی مائی سمجھتی ہے کہ اس پر کسی بھوت کا سایہ ہے۔ زمین کے چہرے پر ہنسی پھیل گئی.....

بلےبی اور نار سائی کی ہنسی پھیل گئی اور جھوٹی ہنسی..... آج وہ کتنے دن کے بعد ہنسی بھی مگر اس ہنسی میں اس زمین کی کھلکھلاہٹ نہیں تھی جو صبح صادق کے ساتھ ہی گھر میں پھوٹنے لگتی تھی وہ خود پر ہنس رہی تھی اس فریب پہ ہنس رہی تھی پھر یک دم اسے روٹا آگیا وہ اپنی حقیقی حالت پر رورہی تھی۔ وہ کتنی بے بس تھی ملکو سے اپنے لٹ جانے کا انتقام بھی نہیں لے سکتی تھی۔

”مگر..... کرتا ہے مجھ سے.....“ جھارو مائی نے زمین کے بالوں کو پیشانی کے اوپر سے پکڑا اور کس کے اپنی مٹھی میں مروڑ لیا یہ تکلیف اتنی شدید تھی کہ زمین بلبلایا اٹھی مگر اس نے منہ سے آہ نہ نکالی اور قہقہے لگانے لگی..... ایسے قہقہے جن میں اس کا راز دفن تھا۔ وہ ان قہقہوں میں آخر کب تک اپنا زخم چھپاتی پھر رونے لگی جھارو مائی نے کریموں اور داوی کی طرف دیکھا۔

”بہت بڑے جن کا سایہ ہے اس پر..... سورج ڈھلتے ہوئے کسی پیری کے درخت پر چڑھی ہے یہ اور وہیں وہ اس پر عاشق ہو گیا.....“ کریموں تائید آسر ہلانے لگی جب کہ داوی گم صم سی بیٹھی تھیں اور زمین کی

پل پل بدلتی حالت کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں اور اس پل پل بدلتی حالت سے انہیں یقین ہو رہا تھا کہ واقعی زمین پر کسی جنات کا اثر ہو گیا ہے پھر زمین بالکل چپ ہو گئی۔

”یہ اس طرح نہیں بولے گا..... مگر میں سمجھتی ہوں اسے بولا کر ہی دم لوں گی۔“ یہ کہہ کر جھارو مائی نے ایک بچے کی طرف اشارہ کیا جو وہیں بیٹھا تھا تقریباً چھ سات سال کا وہ بچہ جھارو مائی کے اشارے پر زمین کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ جھارو مائی جلال میں آگئی تیز تیز منتر پڑھنے لگی پھر اس بچے سے کہا کہ اس لڑکی کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ لے بچے نے جیسے ہی زمین کے سر پر ہاتھ رکھے مائی نے بچے سے سوال شروع کر دیے۔

”کیا نام ہے تیرا.....“

”ال بل.....“

”کہاں سے آیا ہے.....؟“

”پیرو کے کھیت سے.....!“

”کیا چاہتا ہے..... میں پوچھتی ہوں کیا چاہتا ہے تو اس لڑکی سے؟“

”ستایا ہے اس نے.....!“ بچے نے بھاری آواز میں چلا کر کہا۔

”کسے ستایا ہے.....؟“ جھارو مائی غصے میں آ کر بولی۔

”شام ڈھلے اس نے پیری سے چھلانگ لگائی تھی وہاں ہمارے بچے پھیل رہے تھے دو بچوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے اب میں اس سے بدلہ لوں گا۔“ وہ بولا..... جھارو مائی ہنسی۔

”تجھے ابھی مزہ چکھاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہی مائی نے آگ میں سے گرم مٹی اٹھائی اور زمین کے منہ ہاتھ اور گردن پر رگڑ دی..... زمین تڑپنے لگی۔

”بول پیچھا چھوڑے گا یا نہیں..... بول..... اب کرے گا مجھ سے مقابلہ.....!“ زمین کو تکلیف میں تڑپا دیکھ کر داوی کے آنسو نکلنے لگے۔ زمین بری طرح ہا رہی تھی پھر وہ نقاہت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی۔ جھارو مائی نے بچے کو ہٹا دیا دو عورتیں آئیں اور زمین کو اٹھا کر لے گئیں۔ داوی پیچھے پیچھے جانے لگیں تو کریموں نے

روک لیا۔

”بے شک یہ سب کچھ مجھ سے بھی دیکھا نہیں گیا مگر..... بچی کے حق میں یہی بہتر ہے۔“ دادی چپ سی ہو گئیں۔

جہاں جہاں زمین کو زخم آئے تھے ان عورتوں نے مکھن میں مرہم لگا کر زمین کے لگا دیا جس سے زمین کو ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا پھر اسے ٹھنڈے پانی کے پھینٹے مارے اور پانی کا پیالہ زمین کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ نمک کا پانی تھا جس سے خاطر خواہ زمین کو تقویت کا احساس ملا پھر وہ دوسرے دروازے سے زمین کو باہر لے گئیں۔ زمین کا سر چکر رہا تھا اور زخموں میں بری طرح جلن ہو رہی تھی سامنے سے کریموں اور داوی آتی نظر آئیں تو زمین داوی سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کریموں تسلیاں دے رہی تھیں۔

”بس اب دیکھنا کیسی جنگی بھلی ہو جائے گی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اسے سہارا دیے ہوئے باہر نکل گئی۔ مائی نے آگلی جمعرات بولا یا تھا۔

II II II

”میٹرک میں تھا میں جب مجھے ایک لڑکی سے مشق ہو گیا تھا۔ نہ صرف مجھے بلکہ وہ بھی میرے عشق میں گوڑے گوڑے ڈوب چکی تھی لیکن اس کی ماں پوری چنگیز کی خالہ تھی۔ ہمیں ملنے نہ دیتی ہر وقت شکاریوں کی طرح ہمارے پیچھے پیچھے رہا کرتی۔ میں تو تنگ تھا ہی اپنی ہونے والی سائیس سے میری محبوبہ بھی ماں کی افسرانہ مادتوں سے تنگ تھی آخر ہم نے فیصلہ کیا کچھ ایسا ہندو بست کرتے ہیں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اماں کو کچھ نظر نہ آئے۔ ہم دونوں ایک سفلی علم والے بابا کے پاس گئے۔ حیرت کی بات تھی ہم نے اسے ابھی کچھ بھی مدعا نہ سنایا اور وہ ہمارے دل کا حال جان گیا۔“ علی زمان نے چونک کر رضوان کی طرف دیکھا۔ ساری بات میں صرف یہی ایک بات دلچسپی کا مظہر تھی۔

”پھر کیا ہوا..... یہ سلسلہ چل نکلا۔ آئے دن بابا ہمیں کوئی نہ کوئی نیا راستہ دکھا دیتا اور پیسے ٹھک لیتا مگر

کا میاں کسی صورت ہو ہی نہیں پارتی تھی۔ ایک دن میں تنگ آ گیا اور بابا سے الجھ پڑا۔

”بابا اگر تمہارے بس کا روگ نہیں تو ہمارا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو.....!“ بابا کو میرے نوٹوں کا چسکا لگ گیا تھا کہنے لگا۔

”اس کی ماں بہت بڑی جادوگرنی ہے..... جو بھی وار کرتا ہوں مجھ سے ٹکرا جاتی ہے..... اور پھر مجھے بہت مقابلہ کرنا پڑتا ہے یوں سمجھو کہ فی الحال اس کے وار سے تمہیں بچا رہا ہوں ورنہ وہ تم لوگوں کا ستیا ناس کر دیتی۔“ مجھے ہنسی آ گئی۔

”ایک بات سمجھ نہیں آئی بابا، کیا وہ تم سے بھی بڑی جادوگرنی ہے۔“

”کبھی اس کے گھر گئے ہوتے.....؟“ بابا کو میری بات پر سخت غصہ آ گیا اور جلال میں آ کر بولا۔

”کبھی نہیں.....! اور جانا بھی نہیں چاہتا..... وہ تو مجھے کچا چبا کر کھا جائے گی۔“

”بھئی..... بھئی تم نہیں سمجھ سکتے.....“ بابا کے چہرے پر تسخر پھیل گیا پھر یکدم سنجیدہ ہو کر بولا۔

”اس گھر کی آب و ہوا میں عجب سی بدبو ہر وقت پھیلی رہتی ہے اور وہ ہے کتے کی بچہ کی بدبو..... جو میرے علم کو اس تک پہنچنے نہیں دیتی۔“

”ہاں..... مجھے یاد آیا میں ایک بار زریں سے ملنے اس کے گھر تک گیا تھا تب اس کی ماں گھر میں نہیں تھی وہ مجھے اوپر لے گئی۔ گھر میں بہت ہی بری بدبو پھیل رہی تھی میں نے ناک چٹکی سے پکڑ لی اور زریں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا وہ شرمندہ سی ہو گئی اور کہنے لگی..... ”اماں نے کتابالا ہوا ہے اس کے کھانے کے لیے آئے دن کبھی بالائی ہیں اس کی یہ منخوس بدبو ہے مگر تم اندر آ جاؤ پھر نہیں آئے گی۔“ وہ مجھے ہاتھ سے گھسیٹ کر اندر لے گئی مگر مجھے ابکائیاں آنے لگی تھیں اور میرا دل کرتا تھا یہاں سے بھاگ جاؤں، میری بے زاری دیکھ کر زریں کو بھی غصہ آ گیا اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے آنگن میں رکھی وہ کالی دیپتی جس کے نیچے برادر آگ سلگ رہی تھی اور جو دھوئیں میں مدغم تھی اٹھا کر کہیں

پھینک دے وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنائے یا نہ پہنائے میں وہاں سے بھاگ آیا..... اور پھر میرا دل نہ کیا کہ اس کے گھر جاؤں۔ میں نے بابا کو روداد سنائی تو بابا چمک کر بولا۔

”دیکھا..... دیکھا تم نے..... میں تمہیں یہی بتا رہا تھا، سمجھا رہا تھا۔ وہ بہت بڑی جادوگرنی ہے.....“ اور میں دل ہی دل میں ایمان لے آیا بابا بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں..... بابا نے مجھے سختی سے منع کیانی الحال زریں سے ملنا چھوڑ دوں اور اس کے گھر تو بالکل نہ جاؤں ورنہ مجھے بہت نقصان ہوگا۔ میں نے فی الحال ایسا کرنے کا ارادہ کر لیا پھر زریں سے دور رہنا میری برداشت سے باہر تھا میں ایک روز بابا سے یہی اجازت لینے گیا کہ زریں مجھ سے باہر تو مل سکتی ہے ناں اور بھی میرے قدم باہر ہی رک گئے۔

”میں نے زریں کی ماں کو بابا کے آستانے میں جاتے دیکھا تھا چونکہ اس نے چادر سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رکھی تھی اس لیے مجھے نہیں دیکھا البتہ میں اسے پہچان گیا تھا..... وہ بابا کے پاس کیا کرنے آئی ہے۔ بقول بابا کے وہ تو خود بہت بڑی جادوگرنی تھی میں اوٹ میں ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں اور بھی میرے دل میں خیال آیا کیوں نہ اندر چل کر دیکھوں کہ وہ کیا معاملہ لے کر آئی ہے سخت سردی کا موسم تھا گرم شال میرے کندھوں پر تھی جسے میں نے کھول کر اپنے سر اور چہرے کے گرد اس طرح لپیٹا کہ میرا چہرہ چھپ گیا اور پھر چہرہ جھکا کر بابا کے مریدوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں بابا اسے تعویذ لکھ کر دے رہے ہیں اس نے خوشی خوشی تعویذ تھا ما، نذرانہ بابا کے قدموں میں رکھا اور کہنے لگی جب سے آپ نے تجویز بتائی تھی وہ کبخت گھر کے آس پاس بھی نہیں بھٹکتا بس اب کچھ ایسا بتا دیں کہ زریں کے سر سے اس کا بھوت اتر جائے۔“

”صبر..... صبر..... سب کچھ آہستہ آہستہ ہی ہوگا ایسا بندوبست کریں گے کہ زریں اس کی شکل تو کیا نام سے بھی نفرت کرنے لگے گی۔“

”بڑی مہربانی بابا..... بڑی عنایت.....“ وہ

عاجزی و تشکر سے ہاتھ جوڑتی بابا کی کوٹھری سے نکل گی۔ میں جوں کا توں بیٹھا رہ گیا..... لوگ باری باری اٹھ کر عقیدت سے بابا کے پہلو میں جاتے اور اپنے مسئلے بتاتے اور میرا دل کر رہا تھا اس فراڈیے کو اٹھا کر باہر پھینک دوں مگر نہیں..... مجھے اپنے غصے کو روکنا پڑا..... اس کے مستندے چاروں طرف ہی کھڑے رہتے تھے۔ وہ تو میرا بھرتہ ہی بنا دیتے..... مجھے خاموشی سے وہاں سے نکلنا تھا..... مگر ایسا ممکن نہیں تھا بابا کو ملے بغیر کوئی یہاں سے نکل بھی سکے..... اسی شش و پنج میں میری باری آگئی۔ میں ایسے ہی سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”ٹوٹے دل کو لے کر آئے ہو۔“ بابا کا سوال کتنا صحیح تھا مگر میرا دل چلا چلا کر کہنا چاہتا تھا چور سے کہتے ہو چوری کرو اور سا ہو کار سے کہتے ہو کہ گھر بچاؤ..... تو یہ ہے تمہارا علم..... مگر میں نے ہونٹ سیٹے رکھے۔ بابا نے نرمی سے مجھے اکسایا۔

”بولو..... بتاؤ..... بچہ..... کیا بات ہے۔“ اور میں..... جو غصے سے بھرا بیٹھا تھا سر اٹھا کر بابا کی طرف دیکھا تو بابا مجھے دیکھتا رہا میرا خیال تھا وہ شرمندہ ہوگا مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا..... بابا مسکرایا تھا پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے مرید کی طرف کیا مرید نے ایک چراغ سا بابا کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور تم یقین نہیں کرو گے میرے اعصاب پہ دباؤ ہونے لگا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں پچھلا سب کچھ بھولتا جا رہا ہوں ایک عجیب سا غبار سا میرے اوپر چھا گیا تھا اور یہ زیادہ دیر نہ ہوا..... بابا نے ہاتھ اٹھایا اور مجھے وہاں سے اٹھ جانے کا کہہ دیا میں کون سا وہاں بیٹھنا چاہتا تھا وہاں سے بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔ یہ بات مجھے بعد میں پتا چلی کہ بابا نے وقتی طور پر مجھے نظر بند کر لیا تھا میں گھر آ گیا..... رات کے وقت مجھے ڈر محسوس ہونے لگتا پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ اسی گھبرائی ہوئی طبیعت میں تین چار دن گزر گئے..... میرے گھر والے میرے لیے پریشان تو..... ادھر زریں بے قرار وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی اس نے مجھے فون کیا وہ قبرستان میں مجھ سے ملنا چاہتی تھی میں اس کے بلاوے پر پہنچ گیا وہ ایک قبر کے نزدیک

بیٹھی تھی اور گڑھا کھود رہی تھی۔

”میری ماں..... مجھ پر کالا جادو کر رہی ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں لیکن یہ میری ماں کی بھول ہے میں نے بھی ایسا بندوبست کیا ہے کہ میری ماں..... سب کچھ بھول جائے گی۔“

”مگر یہ صحیح نہیں ہے..... اور یہ جادو وادو کچھ نہیں ہوتا بس ڈھونگ ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہوگا.....“ میں یک دم بولا زریں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور حیرانی سے پوچھنے لگی۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو رضوان..... کل تک تو تم خود.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کہنے سے روکا۔

”مجھے پتا ہے تم کیا کہنا چاہتی ہو.....!“ میں کچھ ہنچلا سا گیا تھا وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگی اور بے قراری سے بولی۔

”اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو خالی ہاتھ رہ جاؤ گے..... میری ماں میری شادی کر رہی ہے۔“

”شادی.....!“ میں دنگ رہ گیا۔

”ہاں..... شادی..... وہ بہت مالدار ہے تمہارے جیسے تو اس کے گھر کے ملازم پھرتے ہیں۔“

”تو پھر کرلو شادی..... عیش ہی عیش کرو گی.....!“ میں جل کر بولا۔

”مگر میں اسے بڑھے کھوسٹ کے ساتھ شادی نہیں کروں گی..... میری ماں کا دماغ سٹھیا گیا ہے مگر مجھے لالچ نہیں ہے۔“ وہ تنک کر بولی، میں اسے ابھی کچھ دلا سا ہی دیتا کہ اسی وقت اس کی ماں آندھی طوفان کی طرح ہم پر نازل ہوگئی اور زریں کو وہیں مارنے لگی۔

”دماغ تو تیرا سٹھیا گیا ہے جو اس کنگے“ بلوگڑے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جو روز اسکول سے بھاگ کر تیرے پاس دل بہلانے آ جاتا ہے۔ اپنی عمر دیکھ اور اس کی عمر دیکھ میس بھی نہیں پھوٹی ہیں اس کی..... ذیل ڈول بڑا ہو گیا ہے تو کیا دماغ بھی بڑا ہوگا اس کا..... کیوں اپنی زندگی خراب کر رہی ہے زریں..... چل میرے ساتھ گھر..... تیرے چاچا نے

دیکھ لیا تو تجھے یہیں گاڑ... دے گا۔“ زریں کو مارتے ہوئے گھسیٹ گھساٹ کر وہ وہاں سے چلی گئی جاتے ہوئے وہ مجھے خونی نظروں سے گھور ہی تھی کچھ دیر تک میں وہاں کھڑا رہا پھر اپنے گھر آ گیا۔

”واقعی میری عمر شادی کی تو نہیں ہے پھر زریں میرے ساتھ شادی کے خواب کیوں دیکھ رہی تھی..... چلو اچھا ہوا خود ہی جان چھوڑ گئی۔“ یہ میں نے صرف وقتی طور پر سوچا تھا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ زریں میرے دل و دماغ پر کس قدر چھا گئی ہے۔ دن رات مجھے اس کے ہی سپنے نظر آنے لگے تھے میں بہت چاہتا تھا اس کے خیال سے جان چھڑا لوں مگر ایسا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ میرا کھانا پینا سب کچھ چھوٹ گیا، نیندیں حرام ہو گئیں اور بالآخر میں چار پائی سے لگ گیا۔ امی ابو کو میری بہت تشویش لاحق تھی وہ اپنی طرف سے میرا اچھے سے اچھا علاج کروا رہے تھے مگر مجھے نہ سمجھ آنے والا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ میں راتوں کو ڈرنے لگا تھا مجھے عجیب عجیب آوازیں آتی تھیں۔ دل بری طرح کھینچتا تھا اور میں رونے لگتا تھا امی پریشان ہو جاتیں پھر ابو کسی مولوی کو لے آئے۔ مولوی نے بتایا میرے اوپر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔

شاید زریں نے مجھے اپنانے کے لیے مجھے جادو کیا تھا یا اس کی ماں نے چھٹکارے کے لیے یا ان جگہوں پہ جانے سے مجھ کچھ دہشت سی ہو گئی تھی کچھ تو تھا جو میری حالت ایسی بدتر ہو گئی تھی..... مگر میرا دل نہیں مانتا تھا کہ میرے اوپر کسی کا جادو چل سکتا ہے کیونکہ میں جانتا تھا یہ سارے عامل فراڈیے ہوتے ہیں..... اور یہی بات میں اپنے ماں باپ کو سمجھاتا تھا مگر انہوں نے میری ان باتوں کو بھی میرے اوپر اثرات سے ہی محمول کیا۔ پورے دو سال میں نے سخت بیماری اور اذیت میں گزارے۔ کوئی کہتا دریا پار لے جاؤ کوئی یہ کہتا شہر بدل۔۔۔ لو ابو سب کچھ کرتے رہے میں ٹھیک ہوا تو پھر سے تعلیم کا آغاز کیا اور اللہ سے توبہ کی کہ آئندہ ان خرافات میں نہیں پڑوں گا مگر.....“ رضوان یہ کہہ کر خود ہی ہنس دیا۔

”دل ہی تو ہے..... عارضی طور پر ادھر ادھر بھٹک جاتا ہے مگر میں اس کی لگا میں کھینچ کر رکھتا ہوں۔“ بہت دیر کے بعد رضوان کو اندازہ ہوا کہ وہ اکیلے ہی بول رہا ہے علی زمان مزے سے خراٹے لے رہا تھا بھلا اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اس کے محبت نامے سے..... رضوان نے خشکیں نگاہوں سے اسے گھورا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔

IIII

”نواب زادی چوبیس گھنٹے کمرے میں بند رہتی ہے، ہم اس کے باپ کے ملازم لگے ہوئے ہیں جو اسے پکا کر کھلائیں.....!“ ارشاد بیگم کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

”ماما..... آپ آرام کریں، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”خاک آرام کروں میں، آخر کب تک یہ لپچھن دیکھوں..... میری بچی سارا دن گھر کے کاموں میں گھلتی رہتی ہے مجال ہے جو جھانک کر بھی دیکھ لے..... آنے جانے والے بھی توبہ توبہ کر کے جاتے ہیں۔ آئینے دو آج اس زن مرید کو آج ہی گھر سے نہ نکالا تو نام ارشاد نہیں..... ہم یہاں گرمی میں مر رہے ہیں اور خود اسے سی میں بیٹھی رہتی ہے، لائٹ جاتے ہی یو پی ایس چل جاتا ہے ذرا عیش تو دیکھو..... بجلی کس کی خرچ ہو رہی ہے میری بی بی ناں ارے باپ نے اے سی تو دے دیا تھا بجلی کا میٹر بھی لگوا دینا۔“

”سن رہے ہیں ڈیڈی آپ.....؟ کس قدر بکواس کر رہی ہے یہ عورت اور آپ یقین نہیں کریں گے فرزان ذرا سی دیر کے لیے بھی اے سی نہیں چلاتے..... یہی بجلی کے بلوں کا رونا اور کیا..... اب آپ ہی بتائیں اتنی گرمی میں بند کمرے میں بنا اے سی کے رہا جا سکتا ہے..... چوبیس گھنٹے کمرے میں بند رہ کر تنگ آ گئی ہوں۔“

”آخر کب تک کہوں بیٹی کہ صبر کرو..... صبر تو انسان جب کرے جب کوئی امید نظر آتی ہو..... فرزان جیسا لڑکا میں نے آج کے دور میں کہیں نہیں دیکھا یہ

فرزان کی دی ہوئی طاقت ہے جو یہ عورت تم پہ اس قدر حاوی ہو رہی ہے۔ تم اسے منہ توڑ..... جواب کیوں نہیں دیتیں۔“

”میری خاموشی میں ہر وقت اس گھر میں قیامت آئی رہتی ہے..... بولنے لگی تو عذاب آجائے گا۔“

”آجائے..... ایک بار ہی آجائے جو کچھ آنا ہے تم امی فون بند کرو..... اور اس کی بکواس کا جواب دو جا کر۔“

”ڈیڈی میں کیا جواب دوں گی.....؟“

روحار وہاں سی ہو کر بولی تو عماد الدین کہنے لگے۔

”یہی تو تمہاری کمزوری ہے کہ تم ان عورتوں کا سامنا نہیں کر سکتیں کم از کم روحا تم نا جائز الزام پہ تو بول سکتی ہو۔“

”روٹیاں توڑنے کے لیے لائے تھے اس نواب کی بچی کو ہم..... اگر مجھے پتا ہوتا کہ گھمنڈی باپ کی گھمنڈی بیٹی ہوگی تو کبھی بھی جا کر نہ تھوکتی۔“ روحا نے فون بند کر دیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ ارشاد کے ارادے اور آرام برا جمان تھیں۔

”میں تو اس گھر کا پانی تک نہیں پیتی تو روٹیاں کیسا توڑوں گی۔“ روحا کا اتنا کہنا تھا کہ ارشاد کے غصے میں پھل آ گیا۔

”جانتی ہوں..... منرل واٹر کی بوتلیں ساتھ ہاندھ کر لاتی ہے۔ کیونکہ تو بادشاہ سلامت کی اولاد ہے ناں اور ہم کی کمین لوگ جوئل کا پانی پیتے ہیں تیرے باپ کو اپنی دولت دکھانے کا اتنا ہی شوق ہے فلا جی طور پر ہارے ملک میں پانی کی ترسیل کرادے تاکہ غریبوں کا املا ہو جائے بیٹی کو کیوں کانچ کا برتن بنا رکھا ہے۔“

”آپ میرے ڈیڈی کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکی ہیں اب مزید کچھ کہا..... تو.....؟“

”ہاں..... تو..... تو..... تو کیا کر لے گی؟ سن رہے ہیں تم لوگ باپ کی حمایت میں مجھ سے لڑنے آئی ہے۔ اس گھمنڈی بڑھے کے لیے جس نے اسے سر پر تاج رکھا ہے.....!“

”میں نے کہا آپ سے..... میرے ڈیڈی کو کچھ

نہ کہیں.....!" شدت غم سے روحا کی آواز گھٹ رہی تھی یوں لگتا تھا کہ ابھی رو پڑے گی لڑنا تو اسے کیا خاک آتا تھا بس آنسوؤں یہ ہی بس چلتا تھا۔

"ہاں تو تو کیا ہمارا سر پھاڑ دو گی..... صبا تم بڑی ہو کبھی اپنے سسرال والوں سے میری حمایت ہیں.....!"

"ماما..... کبھی موقع ہی نہیں آیا....." صبا کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تو ارشاد نے بھویں اچکا کر بیٹی کی طرف دیکھا۔

"ہائیں تو تیرے سسرال والے اتنے اچھے ہیں کہ تجھے تیرے ماں باپ کے طعنے نہیں دیتے.....!"

"نہیں ماما..... میرا مطلب ہے آپ خود اتنی اچھی ہیں اور ظفر تو آپ کے دلدادہ ہیں کہتے ہیں آپ بالکل بھی ساس نہیں لگتیں....." صبا کی چاچلوسی پہ ارشاد بیگم پھولی نہیں سمائی اور چمک کر بولیں۔

"ہاں تو ماں والی ماما دے رکھی ہے دامادوں کو..... اس کے باپ کی طرح گیا گزرا انہیں سمجھتی.....!"

"اس کے علاوہ ماما..... ہم نے بھی تو اپنا آپ مٹایا ہے۔ سسرال میں بھابی جان کی طرح نخرے نہیں کیے۔ ناشتے میں چائے پاپا بھی کھایا اور کھانے میں دال بھی..... کبھی ناک بھوں نہیں چڑھائی حالانکہ یہاں

گوشت کے علاوہ کبھی سبزیاں تک بھی نہیں کھائی تھیں۔ ایک ہماری بھابی ہیں فرماتی ہیں کہ وہ بیف میٹ نہیں کھاتیں اس لیے ان کے والد محترم ان کے لیے

کھانا بھجواتے ہیں اتنے نخرے ہم کرتے تو دوسرے دن ہی ظفر گھر سے نکال کر باہر پھینک دیتے۔"

"اوہ..... ہا..... صبح کہہ رہی ہے میری بچی اس گھر میں جو بھی کلمو ہی آئی ہے اس نے ایسے ہی بھری تھال میں لات ماری ہے۔"

"بس بس رہنے دیں ماما..... بڑی بھابی، روحا بھابی سے بہت اچھی تھیں کم از کم ان میں ایسے نخرے تو نہیں تھے....." اس بات کی گواہی ارشاد بیگم کا دل بھی دے رہا تھا بے شک وہ زبان درازی کرنے لگی تھی مگر

غیور اسے مارتا بھی تھا اور گھر کا سارا کام بھی کراتا تھا یہ نہ جانے کون سا تعویذ پلو میں باندھ کر لائی تھی کہ فرزان اس کے سامنے بولتا تک نہیں تھا۔

"سو خد متیں علیحدہ کرتی تھی ہماری..... یہ محترمہ تو کبھی آکر سلام تک نہیں کرتیں.....!"

"تو تم لوگ اس کے سلام کی بھوک بیٹھی ہو..... آئے تمہاری ماں بیٹھی ہوئی ہے یہاں..... تمہارا گھر ہے جیسے آؤ جب مرضی آؤ.....!" ارشاد نے سینے پر دو ہتھ مار کر کہا تو صبا ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔

"ماما..... بس آپ اپنی صحت کا خیال رکھا کریں..... یہ جلن آپ کا بی بی شوٹ کر رہی ہے..... اس روز بھی ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے فوری طور پر آپ کو ڈاکٹر کے پاس نہ لے جاتے تو آپ کو فالج کا ایک بھی ہو سکتا تھا۔" ارشاد بیگم کو ایک دم

اتنا غصہ آیا کہ بیٹی کے گلے میں لپٹے بازو پرے کو جھٹک دیے اور غرا کر بولیں۔

"فالج پڑے میرے دشمنوں کو..... نہ جانے کون سا تعویذ جو کھٹ میں گاڑ..... مگر گھر میں داخل ہوئی تھی کہ اس کی شکل پہ نظر پڑتے ہی سانس رکنے لگی تھی میری اور خبردار جو اس منحوس بیماری کو مجھ سے منسوب کیا تو.....

خواتین دشمنوں کو ٹھنڈ پڑوانی رہتی ہو۔"

"تعویذ..... تعویذ..... تعویذ نہ جانے اس گھر میں ہر مسئلہ تعویذ سے کیوں شروع ہوتا ہے اور تعویذ پر ہی ختم ہوتا ہے....." روحا واپس اپنے کمرے کی طرف پلٹنے لگی..... تو..... ارشاد بیگم چلا کر بولیں۔

"یہ کمرہ بھی جہیز میں لے کر آئی تھی تو جو چوبیس گھنٹے اس میں بچی رہتی ہے۔ روٹی اور پانی تو تیرا باپ بھیج رہا ہے اس سے کہہ بجلی کا میٹر بھی لگوا دے تاکہ تو چوبیس گھنٹے اسے سی میں آرام کرتی رہے..... مہم کی بنی ہے

ناں بے چاری گرمی میں پھسل جاتی ہے....." ارشاد بیگم نے یہ کہہ کر ٹھٹھا مارا تو صبا کی اور ارم کی ہنسی بھی اس میں شامل ہو گئی۔

"مجھے اگر پتا ہوتا کہ میرے نصیب اتنے برے ہوں گے تو کبھی بھی شادی کے لیے ہاں نہیں کرتی۔" وہ

الودوں کو حلق میں اتارتی ہوئی واپس کمرے میں چلی گئی..... اندر آتے ہی سیل فون اٹھایا..... جس میں عماد الدین پانچ ہزار روپے کا بیلنس ہمہ وقت موجود رکھتے تھے۔

"ڈیڈی پلیز..... گاڑی بھجوا دیں، میں آؤنگ کے لیے جانا چاہتی ہوں ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔" اس کی آواز اتنی روہا سی اور دلگرفتہ تھی کہ عماد الدین نے اگلے ہی پل بیٹی کے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔

IIII

"اب کیا سوچا ہے تم نے.....؟" کریموں نے دادی سے پوچھا تو دادی سر جھکا کر دوپٹے کے پلو سے کیلی آنکھیں پونچھنے لگی۔

"کیا بتاؤں کریموں، کچھ سمجھ نہیں آتا زمین تو سدا بدھ بھلا بیٹھی ہے۔ پانچ جمعراتیں ہو گئی ہیں مالی کے پاس جاتے ہوئے مگر زمین کو ذرا بھی فرق نہیں پڑ رہا ہے روز بروز کمزور اور پیلی پڑتی جا رہی ہے ذرا سا

ہل کھاتی ہے اسے فوراً ابکیاں آنے لگتی ہیں اور اگلے دن ہی ہے اتنا معدہ کمزور ہو گیا ہے اس کا مجھے تو لگتا ہے مالی جو ڈھونڈ دیتی ہے اس کا دھواں اس کے پیچھے ہٹ جاتا ہے

اس کی یہی حالت رہی تو یہ مرجائے گی..... ابھی اس نے دیکھا ہی کیا ہے۔" دادی بھبھک بھبھک کر رونے لگیں تو کریموں بوا بھی پریشان ہو گئی۔

"اگر ایسی کوئی بات ہے تو اسے شہر لے چلتے ہیں کی آپ مجھے ڈاکٹر کا علاج بھی کروا لیتے ہیں..... کمزوری کی وجہ سے اسے معدے کا مرض ہی نہ ہو گیا ہو.....!"

ان اندر کمرے میں بیٹھی دادی اور کریموں بوا کی بات سن رہی تھی۔

"نہیں میں شہر نہیں جاؤں گی.....!" دادی نے کتنا کہا تھا کہ وہ حکیم کے چل پڑے وہ تو حکیم کے پاس بھی گئی تھی۔ حکیم تو بیٹھ پکڑتے ہی بتا دیتا کہ بھاری

ہو اور کیا وہ نہیں جانتی کہ وہ ایک پاپ اٹھائے پھر رہی ہوگی بھابی کی ہر نو ماہ کے بعد یہی حالت ہوتی تھی کہ کھاتی تھی وہ نکل جاتا تھا۔ گھر میں پکتی ہنڈیا کی

خوشبو بھی زہری طرح لگتی تھی اور اس کے ساتھ بھی تو یہی ہو رہا تھا۔ دادی جب ہنڈیا چڑھائیں تو وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھاتی تھی پھر بھی اس کی مہک اس کے نتھوں تک پہنچتی رہتی تھی۔ آخر وہ کب تک چھپ کر بیٹھے گی ایک نہ ایک دن تو یہ پاپ سامنے آئے گا پھر وہ کس خوش فہمی میں مبتلا ہے مگر وہ دادی کو کس منہ سے بتائے یہی سوچ کر وہ رونے لگتی تھی اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

وہ اپنی راندہ درگاہ حالت کس پر آشکار کرے۔ نہ جانے وہ کب سے رورہی تھی دادی اندر آئیں تو ان کا کلیجہ کانپ اٹھا اور اسے خود سے چمٹا کر پھپھک کر روتے ہوئے بولیں۔

"کیا ہو گیا ہے زمین بچھے، میرے بڑھاپے پر کچھ ترس کر میں تو پہلے ہی بہت غم سینے میں لیے پھرتی ہوں مجھ سے تیری حالت دیکھی نہیں جاتی.....!" ایک بار تو زمین کا دل کرا کہ دادی کو ساری سچائی بتا دے۔

"لیکن..... دادی تو خود رورہی تھیں غموں کی ماری تھیں کہیں یہ غم وہ برداشت ہی نہ کر پائیں تب زمین تو کہاں جائے گی؟ کون تیرا سہارا بنے گا۔ کون تیرا جرم چھپائے گا؟" اور پھر زمین نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ خود کو سنبھالے گی کوئی نہ کوئی ضرور ڈھونڈے گی۔

"پھر ایسے میں اسے ماسٹر علی کا خیال..... اندھیرے غار میں سورج کی روشنی کی طرح لگا۔

اگلے ہی پل زمین دادی کے آنسو..... پونچھ رہی تھی اور خود کو دل ہی دل میں مضبوط کر رہی تھی پھر رفتہ رفتہ زمین میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ اس نے گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینا شروع کر دی اس طرح تو نہیں جس طرح پہلے کیا کرتی تھی اب تو اسے باڑے کے پاس سے گزرتے ہوئے بھی ابکیاں آتی تھیں جانوروں کی دیکھ بھال کرنا

تو درکنار البتہ گھر میں چھوٹے چھوٹے کاموں پر توجہ ہی دادی کے لیے خیریت کا سبب تھی۔

آج بہت دنوں کے بعد ہانڈی روٹی بھی زمین نے ہی پکائی تھی پھر دادی پوتی نے اکٹھے ہی کھانا پکایا۔

اسی خوشی میں دادی نے گڑ کے چاول پکا کر بچوں میں

سب کو چیزیں بانٹ دیں گے۔“

”ٹھیک ہے.....! زبین نے سوچتے ہوئے کہا اور نوری پھدکتی ہوئی باہر نکل گئی۔

II II II

چاول بانٹنے کے بعد دادی اتنی ہلکی پھلکی ہو گئی تھیں کہ کمریموں سے ملنے چلی گئیں..... ”ضرور کمریموں نے مائی سے مل کر خاص ورد کرایا ہوگا جیسی تو زبین زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے۔“ دادی کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔

دادی کے جانے کے بعد..... زبین سوچ میں پڑ گئی کہ وہ ایسی کون سی چیز بنائے جسے لے کر وہ خود نکل سکے ابھی کچھ دیر قبل فیکا دودھ سے بھرا برتن رکھ کر گیا تھا۔ زبین نے دودھ پیلے میں چڑھا دیا جو بھی دودھ لینے کے لیے آیا زبین نے انکار کر دیا کہ وہ آج دودھ نہیں پینے گی آج گیارہویں کا ختم دلوائے گی۔

دادی گھر آئیں تو اتنی ساری کھیر کی دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ آج دادی مائی سے بھی مل کر آئی تھیں اور خوشی میں زیادہ نڈر اند بھی دے آئی تھیں جس کے عوض مائی نے ایک تعویذ دیا تھا جو بقول جہارو مائی حفاظت کا تعویذ تھا۔ مائی نے کہا تھا یہ تعویذ زبین کے بالوں میں باندھنا ہے تاکہ پھر وہ شیطان زبین پر وار نہ کر سکے۔

”اتنی ساری کھیر کا تو کیا کرے گی زبین.....؟“

”آپ تو بھول جاتی ہیں دادی کتنے مہینے ہو گئے گیارہویں شریف کا ختم نہیں دلویا میں نے سوچا آج دودھ کسی کو نہیں دوں گی اپنے ہاتھوں سے کھیر پکاؤں گی۔“ دادی..... زبین کی بات بہت خوش ہوئیں۔

”سچ میں زبین تیرے ہونے سے میرے گھر میں زندگی ہے تو بیمار پڑ گئی تھی تو میرے گھر میں موت نا پنے لگی تھی میں نے تو نہ جانے کتنی جمعراتیں ہوئیں تیرے انگلوں کی (آگے جانے والوں کی) نیاز بھی نہیں دلائی..... بہت اچھا کیا تو نے کہ آج کھیر بنائی..... سب کی نیاز اسی میں سے ہو جائے گی.....“ یہ کہہ کر دادی زبین کے قریب بیٹھ گئیں پھر اس کی لمبی چوٹیا ہل کر سر آدھ کھینچ کر بولیں۔

”کتنے پتلے ہو گئے ہیں تیرے بال.....!“ یہ کہہ کر دادی نے تعویذ چوٹیا میں باندھ دیا اور دو پٹاسر پر رکھ کر مائی کی بات بتانے لگیں۔ زبین نے خاص توجہ نہ دی اس کی توجہ تو صرف اور صرف امام علی کی طرف تھی پھر کھیر لال کر اس نے بالٹی میں ڈال لی اور مٹی کی پیالیاں اصرنے لگی۔

”میں سوچ رہی تھی دادی یہ کھیر صبح اسکول کے بچوں کو بھجوا دوں گی۔“

”اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے، میں نماز سے فارغ ہو جاؤں پھر نیاز دے دوں گی۔“ پھر دادی کو ڈال آیا تو ضرور کٹ کر بولیں۔

”مگر یہ لے کر جائے گا کون..... مجھ بوڑھی سے تو انا بوجھ نہیں کھشتا.....“

”آپ اس کی فکر چھوڑ دیں..... نوری اور انور آئیں گے وہ لے جائیں گے۔“ زبین نے دانستہ بے پروائی دکھائی تھی۔

”چل ہٹ، وہ تو معصوم بچے ہیں ان سے کہاں کا وزن چلے گا ایسا کرنا بچوں کے ساتھ تو خود چلی مانا..... میں فاطمی اور سجو سے بھی کہہ دوں گی وہ بھی تمہارے ساتھ چلی جائیں گی اپنے ہاتھ سے بانٹ کر آئے گی تو تھک کی بے ادبی نہیں ہوگی اور بتاؤ ہے تجھے کتنے بڑے پیر کی نیاز ہے۔“ یہ کہتے ہوئے دادی اٹھ کر نکل گئیں۔ زبین نے نہ ہاں کی نہ نہ..... چپ چاپ بیٹھی رہی..... اسے تو بس رات گزرنے کا انتظار تھا۔

نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگی تھی کہ صبح اٹھ ہی نہ کی..... نوری اور انور دھڑا دھڑا دروازہ پیٹ رہے تھے اب وہ چونک کر اٹھی۔

”زیبو..... اے زیبو.....!“ دادی اسے آوازیں دے رہی تھیں وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

”بچے آگئے ہیں.....“ زبین جلدی جلدی اٹھی..... ابھی تل کھول کر منہ پر چھپکے ہی مار رہی تھی کہ اناکیاں شروع ہو گئیں بہت دیر تک کڑوا کڑوا پانی آتا رہا۔ دادی پیالے اور کھیر کا برتن کپڑے میں باندھنے

آج وہ سب بچے زبین کے ارد گرد اکٹھا تھے جو ماسٹر امام علی کے اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ زبین کا بہت جی چاہا کہ ان بچوں سے امام علی کے بارے میں پوچھے لیکن دادی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ زبین کو بچے چینی ہونے لگی۔ اس کی برابر نگاہیں جیلہ کے بھتیجا جیسی تھیں پھر دادی کو بچوں میں الجھتا چھوڑ کر زبین جیلہ کی بیٹی کو اندر کمرے میں لے گئی نوری زبین سے کچھ کچھ خوفزدہ تھی کیونکہ پورے پنڈ میں افوہ پھیلی ہوئی تھی کہ زبین یہ جنات عاشق ہو گیا ہے اور اس کی دادی مائی سے علاج کرواتی ہے۔

”مجھ سے ڈرو نہیں نوری..... میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی مجھے یہ بتاؤ تم روز اسکول جا رہی ہو؟“ نوری نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وہ..... ماسٹر امام علی اب بھی آتا ہے.....؟“

زبین نے ڈرتے ڈرتے آہستہ آواز میں نوری سے پوچھا تو وہ چمک کر بولی۔

”وہی تو ہمیں پڑھاتا ہے۔“

”اچھا.....!“ زبین گم صم صم ہو گئی اور سوچنے لگی کہ اس بچی کے ذریعے پیغام کیسے بھجوائے۔

”اب میں جاؤں.....“ بچی کو بیٹھے چاولوں کی اشتہا کھینچ رہی تھی۔ زبین چونکی پھر نوری کی طرف پھر سے دیکھ کر بولی۔

”میں تمہیں سب سے زیادہ چاول دوں گی نوری..... میرا ایک کام کرو گی۔“ وہ نو سال کی بچی تھی رضا مند ہو گی۔

”تم ایسا کرنا..... صبح جب اسکول جاؤ ناں..... تو میری طرف آ جانا میں تمہیں بہت اچھی اچھی چیزیں دوں گی پھر تم صبح اسکول کے بچوں میں بانٹنا۔“ نوری اس بات سے بہت خوش ہوئی۔ گاؤں میں یہ عام رواج تھا بچوں کو کچھ بانٹا ہوتا تو گاؤں کی عورتیں اسکول کے بچوں میں بانٹ آتی تھیں ان کے نزدیک یہ سب سے اچھا صدقہ تھا..... معصوم بچے کھاتے تھے تو بلا میں دور ہوتی تھیں۔

”میں انور کو بھی ساتھ لے آؤں گی ہم دونوں

لگیں تو نوری نے انور سے کہا۔

”دیکھ..... دیکھ اے..... زیبو بھی اماں کی طرح پیہج کر رہی ہے۔“ نوری زبین کا مذاق اڑاتے ہوئے بولی..... تو انور ہنسنے لگا..... جب کہ زبین کی اوپر کی سانس اور پر اور بچے کی سانس نیچے رہ گئی..... وہ جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی۔

”زیبو کے بھی بچہ ہوگا.....!“ انور نے قہقہہ لگا کر کہا تو زبین کو لگا جیسے آسمان اس کے سر پر آگرا ہے..... وہ غسل خانے کی دیوار سے چپک کر رہ گئی جب کہ دادی کے کام کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے پھر بری تیوری سے انور اور نوری کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔

”تمہاری ماں نے تمہیں بہت خراب کر رکھا ہے..... کیا بچے ایسی باتیں کرتے ہیں، زیبو کتنے دن سے بیمار ہے سب کو پتا ہے آدھی بھی نہیں رہی اور تم یہ بکواس کر رہے ہو..... یہی سبق پڑھا رہی ہے تمہاری ماں تمہیں آج آؤں گی پنڈرو کے پاس..... دیکھ کیسے چھتر لگواتی ہوں۔“

”معاف کر دے دادی..... اے کو نہ کہنا..... انا تو پہلے ہی بہت ظالم ہے..... ہمیں تو جان سے مار دے گا۔“

”ہاں..... اتنا ہی ڈرتا ہے تو اپنے باپ سے.....“ دادی کو سخت غصہ آ رہا تھا زبین کی جان میں جان آئی اور وہ کلیاں کر کے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے غسل خانے سے نکل آئی۔

”چل دفعہ ہو یہاں سے..... آجائے گی زیبو، نوری کے ساتھ۔“ دادی نے انور کو دھتکارا تو وہ سر جھکا کر دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا زبین چادر اوڑھنے لگی دادی نے دیکھا اس کا چہرہ بالکل پیلا زرد ہو رہا تھا۔

صورت لگ رہا تھا اس کی روشن آنکھیں آج بھی اس طرح روشن تھیں جیسے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ کیا اس نے میری غیر موجودگی کو محسوس نہیں کیا ہوگا زمین خوش نہی سے امام علی کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں، میں زمین ہوں.....!“ اچانک اس کی آواز گھٹ سی گئی۔

”یہ تمہیں کیا ہوا.....؟“ امام علی نے حیرانی سے اس سے پوچھا۔ تو زمین نے سر جھکا لیا، آنکھوں میں جلتا دریا اُٹ آیا تھا۔ اچانک امام علی کو کسی نے آواز دی..... تو اس نسوانی آواز پر امام علی کا چہرہ کھل گیا۔ زمین نے سر اٹھا کر اس وجود کو دیکھا جو ان کی طرف ہی آ رہا تھا۔

”آپ یہاں کھڑے ہیں اور میں کب سے آپ کو اسمبلی میں ڈھونڈ رہی ہوں..... یہ لیجیے رجسٹر میں کلاس میں جا رہی ہوں.....!“ لڑکی کہتے کہتے رکی پھر زمین کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور امام علی سے پوچھنے لگی کہ یہ کون ہے؟

”یہ زمین ہے..... اسی گاؤں کی رہنے والی اور زمین یہ اسما ہیں اس اسکول کی نئی میڈم..... اور میری نئی شریک حیات میرا مطلب ہے میری بیوی.....!“ زمین نے حیرانی سے امام علی کی طرف دیکھا پھر اسما کی طرف..... دونوں کے چہروں پر بے پناہ خوشی اور آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی نمایاں تھی..... زمین کی سانس حلق میں آ کر رک گئی اور دل کی دھڑکن تھم گئی اس وقت زمین کو لگا تھا کہ وہ دوسری بار لٹی ہے وہ دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔

”لگتا ہے کچھ نیاز وغیرہ تقسیم کرنے آئی ہو.....“ اسما مسکرا کر زمین سے پوچھ ہی تھی۔ لیکن زمین کو کہاں آواز آرہی تھی ایک ہی گونج اس کے چاروں طرف گونج رہی تھی۔

”میری نئی شریک حیات..... میرا مطلب ہے میری بیوی.....!“

جاری ہے

”تیری حالت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی زیو..... آج پھر تجھے ابکائیاں ہو گئی ہیں..... کہیں تو بیچ راستے میں گری پڑی ہو.....“

”نہیں دادی، مجھے کچھ نہیں ہوتا..... اگر مرنا اتنا آسان ہوتا تو تیری زمین اس تکلیف میں نہ آتی.....“

”صبح صبح اچھا کلمہ منہ سے نکالا کرتے ہیں.....“ دادی نے جھڑک سا دیا..... زمین بچوں کے ساتھ سامان لے کر گھر سے نکل گئی۔

”راستے سے سجو اور فاطمی کو بھی لے لینا.....!“ دادی نے پیچھے سے ہانک لگا تو دی مگر ایک عجیب طرح کی پریشانی نے اچانک آن گھیرا۔

”نہ جانے زیو کو کیا ہوتا جا رہا ہے بالکل مریل سی ہوتی جا رہی ہے۔“ اسے گلی سے مڑتا دیکھ کر دادی دیوڑھی سے ہٹ گئیں۔

”یہ نوری اور انور کیا کہہ رہے تھے۔“ دل ہی دل میں دادی نے استغفار پڑھی۔

اسکول کے بڑے سے کچے صحن میں قومی ترانے کی گونج تھی اور زمین کی نگاہیں ماسٹر امام علی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اپنے گھر سے اسکول کا سفر اس نے بہت مشکل سے طے کیا تھا راستے میں یہ بھی ڈرتھا کہیں ملک سے سامنا نہ ہو جائے بھی تو چہرہ ڈھانپ کر گھر سے نکلی تھی نہ سجو کو لیا تھا نہ ہی فاطمی کو..... کھیر کا برتن رکھ کر وہ پیلی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کی موجودگی میں وہ امام علی سے کیا بات کرتی۔ مگر یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ امام علی سے کیا بات کر گئی..... کیا وہ اس کے راز کو راز رکھ کر وہ اس کی مدد کرے گا، کیا امام علی کو اس سے ہمدردی ہوگی.....؟ ایسے بہت سے سوال تھے جو اسے پریشان کر رہے تھے وہ امام علی سے جا کر کیا کہے گی۔ صرف اتنا پوچھے گی..... کیا وہ اس سے شادی کرے گا اور بس۔

”تم..... تم زمین ہونا.....!“ اچانک مردانہ آواز پر وہ چونک کر مڑی تو امام علی اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ زمین نے امام علی کو اسے دیکھا جیسے پتہ صحرا مہربان بادل کو دیکھتا ہو۔ امام علی پہلے سے زیادہ خوب

ناولٹ

کچی گاڑوٹ گئی

میمونہ خورشید علی

زمین کے گرد ایک ہی گونج تھی..... ”بیوی.....“ اسے لگا تھا کہ وہ دوسری بار برباد ہوئی ہے۔

یہ بربادی پہلی بربادی سے بھی زیادہ ہولناک

قطع 3

تھی۔ اب تو زمین کے پاس کوئی آسرا نہیں رہا تھا۔ ماسٹر علی اپنے آفس میں چلا گیا زمین بچوں کو تیرک تقسیم کر رہی تھی نہ جانے کب نیاز ختم ہوئی اسے پتا نہیں چلا۔ ابھی بھی اس کے ارد گرد گھیرا جمائے کھڑے تھے اچانک



گھنٹی کی آواز بلند ہوئی اور بچوں کا رش اس کے ارد گرد سے چھٹ گیا۔

وہ شکستہ قدموں سے گھر کی طرف پلٹی اور انہی ٹوٹے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی۔ پھر برتن باورچی خانے میں رکھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اپنے وجود کو چار پائی پہ ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ دادی کو کمریوں کی طرف جانا تھا وہ زمین کا ہی انتظار کر رہی تھیں غسل خانے سے نکلیں، برتن باورچی خانے میں رکھے دیکھے تو کمرے کی طرف آگئیں، زمین کی حالت دیکھ کر دادی نے کلیجہ تھام لیا۔ وہ چار پائی پر الٹی پڑی تھی اور بلک بلک کر رو رہی تھی دادی ہول کو اس کی طرف بڑھیں۔

”زمین..... اے زمین کیا بات ہے ایسے کیوں رو رہی ہے؟“ دادی نے اسے سیدھا کرتے ہوئے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”کیا بات ہے گھر سے تو چنگی بھلی گئی تھی..... کسی نے کچھ کہا ہے تجھے، کیوں رو رہی ہے تو.....؟“ دادی کی آنکھیں اور لہجہ اتنا سرد تھا کہ زمین ساکت سی ہو گئی۔ اور پھر خود کو سنھالتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی لیکن اب دادی کو کھد بد لگ چکی تھی۔

”کیوں رو رہی تھی تو یوں.....؟“ زمین سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”مجھے نہیں بتائے گی تو کسے بتائے گی۔“ دادی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ زمین سابقہ کیفیت میں آگئی اور چپ چاپ سسکتی رہی دادی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور رونا شروع کر دیا۔

”نہ جانے کس کمبخت نے کیا کر دیا ہے، میری پھول سی بچی پتھر کی طرح ہو گئی ہے..... اتنے بڑے پیر کی نیاز بانٹنے لگی تھی..... میرا تو خیال تھا جب لوٹ کر آئے گی تو اور بھی ہلکی پھلکی ہو جائے گی..... مگر نہ جانے کیا مرض ہے..... جتنا علاج کی طرف دوڑتی ہوں اتنا ہی تجھے کمزور پاتی ہوں.....“

پھر رحم دل نگاہوں سے دادی نے زمین کی طرف دیکھا اور کہنے لگیں۔

”چل اٹھ، تجھے جھارو مائی کے پاس لے کر ہوں..... اس کی جھاڑ پھونک سے تیری طبیعت ال ہو جائے گی۔“

”میں نے نہیں جانا مائی کے پاس.....!“ وہ اس قدر زور دے لہجے میں بولی کہ دادی اٹھتے اٹھتے واپس آگئیں اور بغور زمین کو دیکھنے لگیں۔

”میرا علاج مائی کے پاس نہیں ہے۔“ زمین کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور لہجہ اتنا سرد اور اجنبی تھا کہ دادی حیرانی سے دیکھتی رہ گئیں۔

”تو کس کے پاس ہے..... تیرا علاج؟“ دادی اچانک یونہی پوچھ لیا۔ تو زمین نے چپ رہے کی زمین کا جواب غیر متوقع ہی نہیں کسی ہم کی طرح دادی سر پر پڑا تھا۔

”میری شادی کرادیں دادی.....!“ زمین نے کہا اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا۔ ”ورنہ لوگ ہمیں جی مار ڈالیں گے اگر یہ نہیں کر سکتیں تو میرا گلا دبا دیں۔“

”جان سے مار دیں..... کیونکہ..... میں..... ایک پاپن ہوں..... بے گناہ ہو کر بھی گناہ گار ہوں..... کوئی یقین نہیں کرے گا..... میں کیسے یقین دلاؤں کہ میں بے قصور ہوں..... مجھے اپنی نہیں آپ کی فکر ہے اگر آپ کی فکر نہ ہوتی تو کب کی جان دے چکی ہوتی۔“ یہ سب بار

منہ چھپا کر زمین نے روتے روتے کہتا تھا، دادی الی جگہ ساکت وسامت ہو کر رہ گئیں کیا انہوں نے یہ حال دھوپ میں سفید کیے تھے..... وہ زمین کو بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

دادی نے زمین کی طرف دیکھا اس وقت دادی کے چہرے کی رنگت سفید لٹھے کی طرح ہو رہی تھی اور وہ کپکپاتے ہونٹوں سے بولیں۔

”کون ہے وہ.....؟“ دادی کے لہجے کی طرح جیسے زمین کی ریزہ کی ہڈی میں اتر گئی وہ ہنوز ٹپکی رہی۔

”بتا کون ہے وہ.....؟“ اب کی بار انداز چار ہوا تھا۔ زمین پھر بھی نہ بولی۔

”بتا کون ہے وہ.....؟“ دادی چلائی تو زمین

ملوکا نام لے دیا۔ ملوکا نام سنتے ہی دادی کے ہوش گم ہو گئے۔



گھر میں مرگ کی سی کیفیت طاری تھی یہ صدمہ ایسی کوکھاٹ سے لگا گیا نہ وہ کچھ بولتی تھیں نہ کھاتی پیتی..... تہ سوئی تھیں نہ جاگتی تھیں زمین مجرموں کی طرح الگ اسی کمرے میں کونے سے چکی بیٹھی تھی۔ وہ تصور ہو کر بھی اصل تصور وار تھی..... کیا ہی بہتر ہوتا کہ وہ کو ختم کر لیتی دادی کی ناگفتہ حالت اس سے دیکھی جا رہی تھی..... وہ دادی کے پیروں میں آ کر بیٹھ گئی..... اس کے قدموں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ دادی چھت کی کڑیاں ہکتے ہکتے..... پتھرائی ہوئی ہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں جیسے محسوس کرنے کی کوشش کر رہی ہوں بھی زمین کی ہلکی ہلکی آواز کانوں میں آنے لگی۔

”مجھے معاف کر دیں دادی..... مجھے معاف کر دیں.....“ ایک دم دادی نے پاؤں یوں سمیٹے جیسے

کھٹ لگا ہو..... زمین نے زور دیا نگاہوں سے دادی کی طرف دیکھا..... وہ چار پائی سے چپکی ہوئی تھی..... پھر بے بسی سے اپنا سر چار پائی کی پٹی پر

رکھنے لگی..... وہ چار پائی کی پٹی پہ سر مارتی اور دادی کا بار وجود مل جاتا اور پھر زمین کی یہ کیفیت ہڈیاں ہوتی

ملی گی یہاں تک کہ اس کے سر سے خون رسنے لگا دادی نے زمین اور چار پائی کی پٹی یوں پکڑ لی جیسے زلزلہ ان کے وجود کو تھس تھس کرنے والا ہو، زمین متواتر اپنے آپ کو اذیت پہنچا رہی تھی۔

”زمین خدا کے واسطے..... میری نظروں کے سامنے سے چلی جا۔“ پھر دادی رونے لگیں..... ”شاید موت کا فرشتہ تیری وجہ سے میری چار پائی تک نہ آ رہا..... چلی جا زمین چلی جا.....!“ دادی چلانے

لگیں۔ زمین کی حرکت میں کمی آگئی..... اب وہ ایک دم دادی کو دیکھ رہی تھی جو مری تو نہیں تھیں مگر موت کی دیر بین گئی تھیں..... دادی نے بے بسی سے اپنا سر پیٹ

لیا تھا۔

”بتا میں کیا کروں..... میں کیا کروں..... ہم دونوں میں سے کسی ایک کو موت آجائے دعا مانگ..... دعا مانگ اپنی نہیں صرف میری موت کی دعا مانگ.....“ اب دادی پہ پاگل پن طاری ہو گیا تھا ایک دم باہر کا دروازہ اتنی زور سے بجاکہ دادی کے ساتھ ساتھ زمین بھی سہم گئی۔ دروازہ مستقل مزاجی سے بج رہا تھا۔ بالآخر زمین نے ہمت کی تو دادی نے وحشت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں..... تو کمرے سے باہر نہیں نکلے گی..... خبردار جو تو یہاں سے اٹھی۔“ یہ کہتے ہوئے دادی چار پائی سے اتریں تو ان کا سر گھوم گیا۔ بروقت زمین نہ تھا مٹی تو دادی چاروں خانے جت ہو جاتیں..... آنکھوں کے آگے بالکل اندھیرا چھا گیا تھا۔

زمین نے انہیں واپس چار پائی پر بٹھا دیا..... اور جلدی سے مکے میں سے پانی بھر کر دادی کے ہونٹوں سے لگانے لگی بھی باہر سے دروازہ پینے کی آواز کم

ہو گئی..... پانی کے دو گھونٹ اندر جانے سے دادی کی آنکھیں روشن ہوئیں تو زمین کا چہرہ نظر آنے لگا اس کے ماتھے سے خون رس رہا تھا اور وہ پانی آنکھ بالکل نیلی ہو گئی تھی..... ابھی دادی زمین کو کچھ کہتیں کہ باہر صحن میں

کھڑ پڑ ہونے لگی..... جیسے کوئی صحن میں کودا ہے آواز اتنی واضح تھی کہ دونوں نے ہی محسوس کی..... اب وہ آواز کمرے کے قریب آتی جا رہی تھی اور پھر اچانک..... فیکا کمرے کے دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ عجیب طرح کا خوف اور وحشت تھی۔

”دادی آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟“ وہ گھبرائے ہوئے سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ایک دم زمین نے

پنٹھ موڑ لی لیکن فیکا اس کے چہرے کی سوجن اور زخم کو دیکھ چکا تھا۔ دادی نے فیکے کی طرف دیکھا..... دادی کی انجانی اور حیران نظریں..... فیکے کی جان پہ بن گئی وہ وضاحت کرنے لگا۔

”کل بھی دروازہ بند تھا..... بنا دودھ چوئے ہی جلا گیا تھا آج پھر دروازہ بند دیکھ کر مجھے فکر ہونے لگی..... کیونکہ ایسا تو کبھی ہوا نہیں تھا کہ دادی کا دروازہ

کھلا ہو۔“

بند ہو..... پھر جانور بھی باہر نہیں نکلے مجھے فکر ہوئی کہ خیریت معلوم کروں۔ دودن جانور کا دودھ نہ نکلے تو جانور بیمار پڑ جاتا ہے..... اس لیے دیوار پھیلاؤنگ کے اندر آنا پڑا.....“ دادی اب بھی فیکے کو دیکھ رہی تھیں۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں دادی.....؟“ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے زمین کی طرف دیکھا تھا۔

”آں..... ہاں.....!“ دادی جیسے چوٹیں۔

”ہاں سب ٹھیک ہے تو باہر چل، میں آتی ہوں۔“ پھر دادی خود کو سنبھالتے ہوئے دیواریں پکڑ پکڑ کر باہر صحن میں آگئیں اور تخت پہ بیٹھ گئیں۔

”بہت کمزور ہو رہی ہیں دادی.....؟“ فیکا ان کے نزدیک بیٹھ گیا، کالا سا کمزور لبوتراسا فیکا..... جسے دادی اندر بھی نہیں آنے دیتی تھیں وہ دادی کی پالکتی بیٹھا تھا۔

”ہاں دودن سے بہت تیز بخار تھا، ہوش ہی نہیں تھا.....!“ دادی نے گہری سانس سچ کر راز کو اپنے اندر دفن کیا۔

”تو آپ کہیں تو حکیم کو لے آؤں.....!“ فیکا ہمدردی کرنے لگا۔

”نہیں..... دوا میں نے لے لی تھی..... تو جانوروں کا دودھ نکال لے..... کہیں وہ اینٹھ ہی نہ گئے ہوں..... ہو سکے تو تھان کی صفائی کر کے انہیں نہلا بھی دیو.....“ دادی کے حکم پہ فیکا ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”حکم تو کریں دادی پھر دیکھیں..... فیکا کیسے لٹش پٹش کرتا ہے، جانوروں کو بھی اور ان کی جگہ کو بھی۔“ یہ کہہ کر وہ تھان میں چلا گیا۔

دادی نے محسوس کیا کہ فیکے نے زمین میں دلچسپی نہیں لی..... فیکا ہی کیا..... زمین کی سہلیاں بھی اب زمین سے ملنے نہیں آتی تھیں۔ جھارو مائی کے علاج سے سارے گاؤں میں یہ بات اچھی طرح پھیل گئی تھی کہ زمین پہ آسیب کا اثر ہے اور یہ بات پھیلائے میں سب سے زیادہ کریموں دانی کا ہاتھ تھا یوں تو وہ دادی کی سب سے بڑی ہمدرد تھی..... لیکن..... فطرت کے ہاتھوں پوری مجبور تھی کسی کی ذرا سی بات کان میں پڑ جانی جب

تک اس کا اچھی طرح ڈھنڈورا نہیں پیٹ لیتی سکوں سے نہ بیٹھتی اور یہ بات دادی ہی نہیں پورا گاؤں اچھی طرح جانتا تھا۔

”یہ بھی بھلا ہی ہوا کہ کریموں کو اصل بات کا ہی نہیں چلا..... ورنہ..... آج پورے گاؤں میں عزت نیلام ہو چکی ہوتی اور اب بھی نیلام ہونے میں کون سی کمر باقی رہ گئی..... آخر میں کب تک اس پاپ کو چھپاؤں گی میں ملکو کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھا سکتی کون میری بات کا یقین کرے گا۔ زمین کی تو عزت چلی گئی اب اگر اس بات کو ڈھراؤں گی تو بھرم بھی چلا جائے گا..... پھر ملکو اس کی بدنیتی کا کچھ بتائیں..... پھر سے کچھ ایسا دیا.....

کر دے۔ مجھے زمین کو گھر سے باہر نہیں نکالنا چاہیے مگر میں اسے کب تک چھپاؤں گی..... یا اللہ میں جاؤں تو کدھر..... کیا زمین کو زہر دے دوں.....“

”ہاں..... یہی بہتر ہے..... زمین کا مرنا ہی بہتر ہے۔ ویسے بھی کچھ عرصے سے بیمار ہے سب یہی سوچیں گے آسب نے زمین کی جان لے لی ہے..... آ.....“

”آسب.....!“ دادی کے ہونٹوں پر سچ تبسم پھیل گیا۔

”میں بھی کتنی نادان اور بھولی تھی..... جان ہی نہ تھی..... وہ کون سا آسب ہے جو زمین کے اندر ہے..... یہ جو آئے دن جھارو مائی کے پاس میں نے تماشا دیکھا..... یہ سارا ہے آسب ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ کیا سب یہ ایسا ہی آسب آتا ہے جیسا زمین آیا..... تو پھر..... مائی کس چیز کا علاج کرتی ہے جو لوگ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔“

”دیکھو دادی، کتنا ڈھیر دودھ نکلا ہے۔“ فیکے نے بالٹی دادی کے سامنے رکھی تو وہ یک دم چونک سی گئیں پہلے دودھ کو دیکھا پھر فیکے کی طرف..... جو نہ جانے کیوں شاباشی کا منتظر کھڑا تھا۔

”تھان کی بھی صفائی کر دی ہے اور جانور بھی نہلا دیے ہیں آپ کہیں تو روزانہ یہ کام میں ہی کر دیا کروں گا۔“

”ہاں..... جب تک زمین ٹھیک نہیں ہو جاتی.....“

”یہ ڈتے داری سنبھال لو.....“ دادی نے بے ساختہ کہا تو فیکا دادی کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا اور راز داری سے بولا۔

”زمین کب تک ٹھیک ہوگی.....؟“ دادی ٹکر ٹکر لے کر دیکھنے لگی کوئی اور وقت ہوتا تو دادی کے دل میں لے کے لیے جو خیال آیا تھا بڑا عجیب تھا صرف اس خیال کے آتے ہی دادی کا وجود آپوں آپ ہلکا ہو گیا تھا دادی کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی روشنی فیکے سے مبہم نہ رہ سکی۔

”زمین بالکل ٹھیک ہے..... اسے کچھ نہیں ہوا ہے.....!“ نہ جانے کیوں دادی فیکے کو یقین دلا رہی تھیں۔ ”میں تو اسے فضول ہی مائی کے پاس لے کر گئی..... نہ جانے کیا جھاڑا پھونکا کہ میری بجی ڈرنے لگی..... سارا ماس اتر گیا۔ اب آہستہ آہستہ ہی کمزوری دور ہوگی۔“

”مگر دادی..... آپ کے آس پڑوس میں تو بڑی عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔“

”کیسی باتیں.....؟“ دادی چونکنا ہو گئیں۔

”یہی کہ زمین..... یہ بہت بھاری جنات کا اثر ہے۔ جب سے دادی نے اس کی شادی کا سوچا ہے جنات کو غصہ آ گیا ہے..... وہ دادی کو بھی مار رہا ہے اور زمین کو بھی..... کیونکہ جنات نہیں چاہتا کہ زمین کی شادی ہو.....“ فیکے کی خبر پر دادی ہنس دیں..... اور دل میں شکر کا کلمہ ادا کیا۔

”سب بکواس ہے۔ میں زمین کی شادی جلد ہی کروں گی اور زمین کا رشتہ بھی آ رہا ہے۔“

”جی..... کون ہے وہ.....؟“

”مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے.....؟“ دادی نے اراضی سے فیکے کی طرف دیکھا۔

”خوشی کیوں نہ ہو دادی..... زمین اتنی اچھی ہے..... اس کی شادی اچھی جگہ ہی ہونی چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے فیکے کا منہ اتر گیا..... دادی کی جہان دیدہ لگا ہوں نے اس چمک کو ماند پڑتے دیکھا تھا۔ ابھی دادی چاہتی نہیں تھیں کہ فیکے سے ڈائریکٹ بات

کریں..... اس لیے گھما پھرا کر بولیں۔

”تو سنا تیری بھر جانی کا کیا حال ہے؟“

”ویسا ہی چل رہا ہے جیسا چل رہا تھا.....“ فیکے نے بے زاری سے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا..... اس کی نگاہیں غیر محسوس انداز میں زمین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

”تیرے بیاہ کے بارے میں نہیں سوچا اس نے.....؟“ دادی نے بڑے تاک کر سوال کیا تھا۔

”یہ فکریں ماں، پیو کرتے ہیں..... بھرا اور بھر جانی کو ایک کانا چاہیے..... بال بچے دار بندہ نہیں اس کے ٹبر کا کہاں سے پورا کریں گے۔“

”کیوں.....؟ اتنا تو..... تو کما لیتا ہے کہ اپنا بوجھ اٹھا سکے۔“ دادی نے ٹھنڈے طریقے سے سلگایا۔

”ایسی باتیں بھی ماں اور پیو سوچتے ہیں۔“ یہ کہہ کر فیکے نے گہری سانس بھری اور کھڑا ہو گیا دادی نے بنا سانس لیے ہی دانہ پھینک دیا۔

”تو کہے تو تیری بات چلاؤں.....؟“ فیکا دم بخود سادادی کی طرف دیکھنے لگا۔ دادی دانستہ بے پروا رہیں۔

”اگر تجھے کوئی گھر پسند ہو تو مجھے بتا دینا..... اور میں تیری بھر جانی کو بھی سمجھاؤں گی.....“ یہ کہہ کر دادی وہاں بھی نہ رہیں اور جوتیاں کھینچی باورچی خانے میں چلی گئیں..... مگر ان کے کان فیکے پہ ہی تھے..... کچھ دیر فیکا متذبذب سا کھڑا رہا پھر باہر نکل گیا۔

دادی کی..... رات بے حد بے چینی میں کٹی۔ ادھر..... فیکا کروٹیں بدل بدل کر تھک چکا تھا۔

”اس سے پہلے تو بھی دادی نے ایسی بات نہیں کی آج دادی کو ایسا خیال کیوں آیا.....“ پھر فیکے کو اپنی خوش فہمی پہ ہنسی آگئی۔ ”اگر دادی نے ہمدردی کر بھی لی تو کیا فرق پڑ گیا ایسی ہمدردی تو راہ چلتے بھی کر لیتے ہیں دادی کے ساتھ تو مجھے کئی برس ہو گئے ہیں۔“

اسی ادھیڑ بن میں ساری رات گزر گئی..... نہ جانے کب دادی کی آنکھ لگی اور کب فیکے کی..... فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی جب توبہ استغفار کی تسبیح پڑھتی ہوئی دادی قضا نماز کے لیے انھیں باہر آئیں تو کھرے پہ

زمین بیٹھی الٹیاں کر رہی تھی اسے دیکھ کر دادی کا ماتھا ٹھنک گیا۔

”لوٹا بھر کر اندر والی کوٹھری میں چلی جا..... اس گھری دیواریں کتنی بڑی ہیں جو تو یہاں تماشا لگانے بیٹھ جاتی ہے۔ فیکا بھی آنے والا ہے..... مگر تجھے تو جیسے میری عزت سے کھیلنے کا شوق ہو گیا ہے..... یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت نہ آئی۔“ یہ کہہ کر دادی غسل خانے میں گھس گئیں زمین چکراتے وجود کو تھامتی لوٹا بھر کر اندر چلی گئی۔

آج طبیعت اس قدر خراب تھی کہ سنبھل کر ہی نہیں دے رہی تھی زمین سدھ بدھ کھوئے اندر ہی پڑی رہی باہر کی چہل پہل اسے بری لگ رہی تھی یہاں تک کہ سورج کی روشنی بھی بری لگنے لگی تھی..... دل ہی نہیں کرتا تھا کہ دن نکلے، اندھیرا اور سناٹا جیسے اس کے وجود میں اتر گیا تھا اور اب اچھی طرح سے رچ بس جانا چاہتا تھا۔ اس گھر کی ساری رونق اس کی چہچہاہٹ میں پنہاں تھی اب یہ گھر خود ایک آسیب بن گیا تھا نہ یہاں کوئی آتا تھا نہ ہی دادی کہیں جاتی تھیں۔

”آخر ایسا کب تک چلے گا..... کیوں سانسوں کی ڈوری ٹوٹ نہیں جاتی..... میں بالکل مر چکی ہوں..... تن سے من سے بس فقط سانس ہی باقی ہیں..... پروردگار انہیں بھی کیوں نہیں کھینچ لیتا۔“

”فارغ ہو گئے۔“ دادی فیکے سے پوچھ رہی تھیں۔

”ہاں..... نہیں کچھ اور کام ہے تو بتا دیں وہ بھی کر دیتا ہوں۔“ دادی مصنوعی سانسیں..... پھر کہنے لگیں۔

”جیتا رہ.....!“

”زمین کی شادی کے بعد تو آپ بالکل اکیلی رہ جائیں گی دادی.....!“ فیکے نے بے ساختہ ہی کہہ دیا تو دادی کہنے لگیں۔

”ہاں..... یہ تو ہوتا ہی تھا..... اس لیے تو کہہ رہی ہوں تجھے تو اپنا گھر بسالے اور اپنی ووہٹی کو لے کر میرے پاس رہ جا..... میرا بھی آسرا ہو جائے گا اور تیری بھر جانی کا بھی منہ بند رہے گا۔“ یہ دادی نے کیا کہہ دیا

تھانکے کے تو ہوش جاتے رہے بہت دیر تک سانس روکے بیٹھا رہا پھر کہنے لگا۔

”مجھ، کم جاتے کو رکھنے سے بہتر یہ نہیں کہ زمین بیاہ کر رخصت نہیں کریں اور اپنے گھر آپ ہی رہ لیں۔“ گویا دونوں ایک دوسرے سے آنکھ پجولی کر رہے تھے۔

”کون..... رہے گا یوں گھر داماد بن کر.....“ دادی گہری سانس بھر کر بولیں۔

”زمین کی قسمت تو اس گاؤں میں بھی پھوٹی..... رشتہ بھی شہر سے آ رہا ہے۔“ دادی نے اس کی اڑائی۔ ”میں اکیلی کتنے دن کی سکون کی.....“ وہاں تھا آس پاس ہی بیاہ دوں گی..... پر نہ جانے کیوں گاؤں والوں نے زمین کو ہوا بنالیا..... رشتہ تو دور کوئی چوکھٹ یہ ملنے بھی نہیں آتا، اتنے دن بیمار رہی کوئی پوچھنے بھی نہیں آیا.....“ یہ کہہ کر دادی ہچکچہک کر رونے لگیں۔

”خدا کسی بے برا وقت نہ لائے۔“ فیکے کو دادی دلی ہمدردی ہونے لگی..... اور وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ”میں ہوناں..... دادی..... آپ فکر کیوں کرتی ہیں..... آپ اکیلی نہیں رہیں گی میں آپ کا خیال رکھوں گا۔“ دادی نے آنسو پونچھے پھر فیکے کی طرف دیکھ لگیں۔

”اگر تو ہی زمین سے شادی کر لے تو میری ساری فکریں دور ہو جائیں گی۔“ دادی کی بات پہ فیکا ساکت سا کہہ سامت سا بیٹھا رہ گیا اسے یقین ہی نہیں آیا کہ دادی نے یہ کہا ہے سمجھا کہ وہم ہوگا..... دادی مزید کہہ رہی تھیں۔

”اپنے منہ سے کہنا نہیں چاہتی تھی کہیں تو بھی یہ سمجھے کہ واقعی زمین پہ جنات ہے بھی دادی تیرے منڈھ رہی ہے۔ مگر اس قدر غیروں میں زمین کو دھونے ہوئے دل ہول رہا ہے..... اس نے کہاں شہر دیکھا ہے۔ شہری زندگی آسان تھوڑا ہی ہوتی ہے بڑے غم ہوتے ہیں شہر والوں کے مگر..... اس کی قسمت جی اس کی طرف ہی پڑا رہے گا۔ رہ گیا..... یہ بوڑھا وجود..... آہ..... ہا..... گر..... پڑ کر گر رہی جائے گی۔“

لگے پہ جیسے سکت طاری ہو گیا تھا لگتا تھا سانس بھی لے گا یہ نوب صورت خواب ٹوٹ جائے گا، اسے کم صم پا کر دادی نے اس کی طرف دیکھا۔

”لگتا ہے تجھے میری بات اچھی نہیں لگی، ہے..... چل چھوڑ.....“

”نن..... نہیں دادی..... ایسی بات ہر گز نہیں ہے۔“ فیکے کو یک دم ہوش سا آیا تھا۔

”میں..... بھرا سے بات کروں گا۔“ ”گھر تجھے بسانا ہے یا تیرے بھرا اور بھر جائی نے.....؟“ دادی نے یک دم کڑوا سا منہ بنالیا تھا۔

”وہ..... تو سب ٹھیک ہے..... پر..... ان کی رضا مندی بھی تو ضروری ہے ناں.....!“

”تو خود تو رضا مند ہے نہیں اور ان کو رضا مند کرنے چلا۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں دادی..... یک دم کہیں دوں گا تو اچھا نہیں لگے گا..... آخر کو شرم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ فیکے کا کالا سیاہ رنگ سرخ ہونے لگا تھا..... اس کی مچھلیں کھل کر جڑوں تک آ گئی تھیں۔ اپنے کالے میں ہاتھ گھسیٹ کر گدگی کھجاتے ہوئے بولا۔

”میری طرف سے رضا مندی ہی رضا مندی ہے بس آپ شام تک بھرا اور بھر جانی کا انتظار کریں اور..... ہاں شہر والے رشتے کو فوراً انکار دیں۔“

”لے..... کیسے انکار کر دوں..... نہ بابا..... میں نہیں کروں گی کیا خبر تیرے بھرا بھر جائی نہ مانیں۔“ دادی دانستہ اگسا نے لگیں۔

”ایسے کیسے نہیں مانیں گے.....؟“ فیکا تن کے کھڑا ہو گیا۔

”فیکے کے سر سہرا تبھی سچے گا جب اس گھر کی ڈولی میرے گھر جائے گی ورنہ ساری عمر فیکا کنوارہ ہی رہ جائے گا۔“ اس کے جذبات معمولی نہیں تھے مگر دادی نے مزید پیش دی۔

”ٹھیک ہے، میں ایک دو دن ہی انتظار کروں گی بس..... اس سے زیادہ نہیں اور ہاں رہ گئی ڈولی کی بات تو تجھے کیا ضرورت ہے زمین کو لے جانے کی یہ گھر

میرے بعد زمین کا ہے اور اب بھی زمین کا.....!“ یہ ایسا تیر تھا جو نشانے پر لگا۔ فیکے کو گھر سے غرض نہیں تھی صرف گھر والی سے غرض تھی لیکن فیکے کے بھائی کو گھر اور جانوروں کی پیش کش سب سے اچھی لگی۔

”اونیک بختے..... اپنے فقیر علی کے تو بھاگ ہی جاگ گئے..... نہ شکل نہ عقل..... پر قسمت دیکھو کیسی جہیز میں گھر والی نہ صرف دھن دولت لا رہی ہے..... شکل صورت میں بھی حور پری ہے..... یوں سمجھو اپنا فقیر علی امیر علی ہونے جا رہا ہے..... اس کے ساتھ ساتھ ہماری قسمت بھی بدل جائے گی اور تو اور پڑھی لکھی بھی ہے، اپنے بچوں کو بھی پڑھا دے گی، لو بھی ہر طرح سے فائدہ ہی فائدہ کہیں سے بھی نقصان نہیں..... میں تو کہتا ہوں نیک بخت ابھی چلتے ہیں اور بات پکی کر کے آتے ہیں۔“ افروز نے پیر علی کا منہ بڑے غصے میں دیکھا پھر تنک کر بولی۔

”عقل پر پردہ پڑ گیا ہے تیری..... بڑھیا نے اتنا بڑا لالچ ایسے ہی نہیں دیا اس کی پونی پہ آسیب ہے جس کی وجہ سے رشتے تو کیا جمعدار بھی اس کی چوکھٹ پر نہیں آتا..... اور تجھے لگ رہا ہے تیری لاٹری کھل گئی اس بھوتنی کو گھر میں لا کر میں نے اپنے بچے نہیں مارنے نہ جانے کس پہر کس کی گردن مروڑ دے..... سب کو پتا ہے کہ اس کا علاج جھارو مائی سے ہوا ہے..... مائی بھی اس کا بندوبست نہیں کر سکی..... اور تو..... اتنا بھولا پاؤلا ہے کہ اپنے اس بے وقوف بھائی کی باتوں میں آ کر اپنا ہنستا بستا گھر تباہ کرنے جا رہا ہے۔“

”اری..... بنگلی..... کچھ نہیں ہے ایسا اور شادی کے بعد تو ویسے ہی جن بھوت خود ہی بھاگ جاتے ہیں۔“ پیر علی نے ذومعنی انداز میں..... ایک ٹھٹھہ لگایا تو فقیر علی نے شرما کر گردن گرائی..... جب کہ افروز چمک کر بولی۔

”کیوں..... یہ خود کیا بھوت ہے جو اس بھوتنی کو قبول کر رہا ہے۔“

”بھیلے..... ان بھوتوں کے چکر کو چھوڑ اور چلنے کی تیاری کر.....“

میں دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہہ رہا تھا۔

مہمانوں کی آمد کی خبر تو اسے ہوئی تھی..... مگر کون لوگ تھے کہاں سے آئے تھے کیوں آئے تھے زمین کو باہر علم نہیں تھا کیونکہ وہ باہر سے ہی چلے گئے تھے..... راہ کو دادی جب اندر سونے کے لیے آئیں تو زمین کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔

”تیرا رشتہ آیا ہے، کل وہ لوگ دوبارہ آئیں گے اور میں تاریخ دے دوں گی۔ اگلے جمعے تیرا نکاح ہے۔“ زمین نے حیرانی سے دادی کی طرف دیکھا..... اس کے چہرے اور آنکھوں میں ان کے سوال تھے دادی نے ایک نظر اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

”تیرے سارے سوالوں کا صرف ایک ہی جواب ہے۔“ فقیر علی عرف فیکے سے تیری شادی ہو رہی ہے۔“ زمین کے سر پر چھت گری..... نہ قدموں کے نیچے سے زمین گئی بس نجیف وجود میں جو سانس کی ہلکی سی فوری تھی..... چند ثانیے کے لیے ختم ضرور گئی تھی..... وہ بے جان سی پڑی چھت کو گھورتی رہی آنکھوں کے گوشے نیچے ہوئے اور زمین پانی ان کے کناروں سے نکلنے لگا۔ اگلے روز اس کے لیے افروز انگلی لے کر آئی تھی..... جو چلتے وقت دادی کے ہاتھ میں دے کر کہنے لگی۔

”یہ ہماری طرف سے زمین کو پہنا دینا۔“ دادی کو سخت ناگوار گزرا..... لاکھ وہ اپنی پوتی کے عیب سے واقف تھیں مگر عمر بھر کا سودا تھا افروز کی یہ حرکت ظاہر کر رہی تھی کہ زمین کا اس گھر میں کیا مقام ہوگا۔ یہ دھن دولت کی قربانی ایک کم عقل کم شکل لڑکے کا انتخاب اس طمطراق کو دیکھنے کے لیے تو نہیں کیا تھا۔ دادی غصہ نہ چھپا سکیں۔

”پہلے شگلن میں ہی تمہارا یہ رویہ..... اگر تمہیں کوئی اعتراض یا اختلاف تھا تو اپنے گھر سے ہی دور کر کے نکلتیں، یہ انگلی پہنانے کا تمہارا حق بنتا ہے میرا نہیں۔“ ”ہاں..... ہاں بھیلے۔ بے بے جی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں یہ تو تیرا حق بنتا ہے۔“ فقیر علی خوش ہی بہت

تھا۔ افروز کا خون کھولنے لگا۔

”آپ چپ رہیں آپ کو نہیں پتا.....“ پھر دادی کو ایک کونے میں لے جا کر بولی۔

”ان مردوں کو کیا پتا ان باتوں کا مگر آپ تو بڑی بڑی عورت ہیں اچھی طرح جانتی ہوں گی حمل کے دوران پرچھاویں کا بہت خدشا رہتا ہے، مجھے کچے کے دن ہیں اور سچی بات ہے سارے گاؤں میں افوہ پھیلی ہوئی ہے کہ زمین پہ اوپر اتھا اب ہے یا نہیں یہ تو اللہ جانتا ہے یا آپ لوگ خود..... مجھے تو بس احتیاط کرنی ہے.....“ یہ کہہ کر اس نے انگلی دادی کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ دادی کو غصہ تو بہت آیا مگر مصلحتیہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا..... اگر بات بگڑ جاتی تو متبادل کچھ بھی نہیں اور دادی جلد از جلد اس مٹی کو دوبارہ دینا چاہتی تھیں، فقیر علی نے دادی کے بگڑے تیور دیکھے تو خوشامدی لہجے میں کہنے لگا۔

”افروز ذرا وہم وغیرہ بہت کرتی ہے آپ اس کی بات کا برا نہ منانا..... آپ نے خود ہی منع کیا تھا ورنہ میں دو چار عورتیں تو اور بھی لے آتا..... اور وہ یہ رسم ادا کر دیتیں مگر..... گھر کی ہی بات سمجھیں یوں ہی پوٹھے دماغ کی ہے آپ برا نہ منانا.....“ دادی چپ ہی رہیں۔

”جمعہ کو بعد نماز ظہر ہم لوگ پہنچ جائیں گے کسی خدمت کی ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا، آخر آپ اکیلی عورت کیا کیا کر سکیں گی۔“ دادی کو فقیر علی کے رویے سے حوصلہ ہوا پھر کہنے لگیں۔

”فقیر علی..... بے شک یہ گھر میں زمین کو جہیز میں دے رہی ہوں لیکن جب تک میں زندہ ہوں اسی گھر میں رہوں گی۔“ یہ کہہ کر دادی رونے لگی تو فقیر علی تسلیاں دینے لگا..... دادی کی لمبی عمر کی دعائیں مانگنے لگا پھر راز داری سے بولا۔

”ضرورت بھی کیا ہے یہ بات کسی کو بتانے کی۔ جو چیز جس کی ہے بہر حال وہ اس کا مالک رہے گا آپ اطمینان سے رہیں..... فقیر علی آپ کا خادم تھا اور خام ہی بن کر رہے گا۔“ گویا فقیر علی نے اپنے سر سے بھائی کا بوجھ دادی پہ ہی احسان رکھ کر اتار دیا تھا..... یک دم

دادی کو خیال آیا تو کہنے لگیں۔

”رخصتی کر کے زمین کو رسوا تو دو چار دن کے لیے اپنے گھر لے کر جاؤ گے ناں.....؟“ فقیر علی کا اس طرف بالکل بھی خیال نہیں تھا..... چونک سا گیا پھر پھرتی سے بولا۔

”بے بے جی کیسی باتیں کر رہی ہو..... بالکل ایسا ہی ہوگا..... آخر رسمیں تو ایسے ہی ادا ہوں گی۔ اب فقیر علی سہرا باندھ کر تو گھر جوانی نہیں بنے آجائے گا معمولی ہی سہی عزت تو ہماری بھی ہے ناں.....!“ دادی نے فقیر علی کی یقین دہانی پہ اطمینان کی سانس لی تھی۔

زمین دہن خود بنی تھی کوئی اسے سجانے نہیں آیا تھا قاطعہ، زہرا، بالی اس کی ان گنت سہیلیاں جن کی شادیوں میں اس نے کئی کئی دن ڈھولکیاں بجائی تھیں اس کے آنگن میں ان میں سے ایک بھی نہیں آئی۔ ابن، مہندی، مایوں سب رسمیں خاموشی سے دم توڑ گئیں..... قاضی کی موجودگی میں چار گواہان میں اس کا نکاح ہو گیا اور جب رخصتی کا وقت آیا تو افروز نے ہنگامہ کھڑا کر دیا..... وہ ہرگز زمین کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار نہیں تھی افروز کے چھوٹے بڑے نو بچے چاچی سے چٹے بیٹھے تھے..... اور افروز کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے بچوں کو جان سے ہی مار دے۔

فقیر علی بضد قائم تھا کہ وہ کم از کم آج رات کے لیے ہی سہی زمین کو رخصت کرا کے لے جائے گا جبکہ افروز دیورانی کو اپنے گھر کی چوکھٹ بھی پار کرانے کے حق میں نہیں تھی۔

”یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔“ فقیر علی اسے کونے میں لے جا کر دھمکانے لگا۔ ”پہلے ہی لوگ کم ذات سمجھتے ہیں یہیں بھائی کو چھوڑ گیا تو کل کو تیرے بھی دھمی پوت ہیں، ان کے رشتوں پر اثر پڑے گا، کل کو تیری چوکھٹ پر کوئی نہیں آئے گا کہیں جائے گی تو لوگ تجھے لاپچی سمجھیں گے۔“ افروز کی عقل میں آ گیا۔ بقول فقیر علی کے عقل تھی تو سہی مگر موٹی بہت تھی۔ یوں زمین سسرال میں آ گئی..... فقیر علی نے فی

میں ہرگز نہیں جاؤں گی اور ہاں کان کھول کر سن لو..... وہ چڑیل میرے گھر میں نہیں آئے گی..... بھلے سے فیکا وہاں رہے، دفع کرے اپنی شکل.....!“ ”لے..... یہ تو نے کون سی نئی بات کہہ دی..... ہوگا تو ایسا ہی۔“ فقیر علی بے فکری سے بولا تو افروز سوچ میں پڑ گئی۔

شام تک فقیر علی نے بیوی کو راضی کر ہی لیا تھا..... ”فیکے کو اگر جہیز میں گھر مل جاتا ہے تو ہمارا تو فائدہ ہی ہے۔ اس گھر میں سے حصہ نہیں دینا پڑے گا، اتنا چھوٹا سا تو گھر ہے یہ..... اور اتنا بڑا ٹبر فیکے سے تو آپوں آپ جان چھوٹ رہی ہے کیوں تو راہ کا روڑا بن رہی ہے.....“ آہستہ آہستہ افروز کو سارے فائدے سمجھ میں آنے لگے اور وہ شام تک جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ بھر جائی کی تیاری دیکھ کر فیکا دوڑتا ہوا دادی کے پاس آیا..... اور انہیں چپکے سے یہ خوش خبری سنا گیا..... دادی کے من کے پھول کھل گئے..... مگر فیکے پہ ظاہر نہ کیا اور نروٹھے پن سے بولیں۔

”تو..... تو اتنا اتلا ولا کیوں ہوا جا رہا ہے..... آنے دو آتے ہیں تو..... زمین پلیٹ میں رکھا حلوہ تو ہے نہیں جو تیار کر کر سامنے رکھ دوں گی۔ سوچ سمجھ کر ہی جواب دوں گی کیونکہ شہر والے رشتے سے ابھی انکار نہیں کیا ہے، ہو سکتا ہے زمین کی قسمت میں شہر والا رشتہ ہی ہو۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں دادی.....؟“ فیکے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

”دیکھو فیکے ساری بات چاہ کی ہوتی ہے..... جس طرف سے زیادہ چاہت نظر آتی..... میں ہاں ادھر ہی کروں گی۔“ اب فیکے نے اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی اور بھائی کی منتیں سمجھتے کرتے لگا۔ فقیر علی پکی عمر کا مرد تھا..... چھوٹے بھائی کو تسلی دینے لگا۔

”تو فکر نہ کر فقیر علی..... چاہ تو میں ایسی دکھاؤں گا بڑھیا کو کہ وہ تیرے سوا کسی کا سوچے گی بھی نہیں۔“ وہ کلف والی دھونی اور گرتہ پہن کر اپنے کپے رنگ کو آئینے

UrduPhoto.com

چاہتی کہ اس منحوس کا اثر میری بچیوں پر پڑے..... میں تو ساری رات بیٹھ کر کانٹوں کی..... پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہوں گی بچوں پر صبح جب تک یہ دفع نہیں ہو جاتی۔“

”اولم بخت..... تجھے وہم ہے اور کچھ نہیں۔“

پیر علی برسا۔

”اچھا ٹھیک ہے چل جا..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دے..... اگر یہ وہم ہے ناں..... تو صبح تک دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“ افروز نے اس لہجے میں کہا کہ فیکے روٹے کھڑے ہو گئے اور وہ سوچنے لگا کہ واقعی زمین پہ کسی بھوت کا اثر ہے۔

”پرے کر.....!“ پیر علی غصے میں پرنا جھاڑتا ہوا پلٹا تو فقیر علی کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ اکیلی ہے نیچے.....“ فقیر علی سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

”چل نیچے چل۔ دماغ خراب ہے اس عورت کا

الحال اپنے چھوٹے بھائی کے لیے بیٹھک میں انتظام کر دیا تھا اس کے باوجود افروز ایک پل بھی نیچے نہیں نکلی اور اپنا سارا لشکر لے کر اوپر جا کر پڑ گئی۔

نہ دلہن کو سلامیاں ملیں اور نہ ہی منہ میٹھا کرانے والا کوئی تھا..... زہین کے دل میں کوئی ارمان نہیں تھے مگر فقیر علی کے تو من میں سارے ارمان تھے۔ کتنی خدشیں کی تھیں اس نے بھر جائی کی اس کے بچوں کی اور آج اس کی نئی نویلی دلہن کو کوئی بٹھانے والا تک نہیں تھا..... وہ یہی شکوہ کرنے اوپر بھر جائی کے پاس آ گیا۔

”کم از کم پلیٹ میں مٹھائی تو نکال کر اس کے کمرے میں رکھ دیتی..... نہ دودھ رکھانہ پانی اور یہاں آ کر پڑ گئی۔“ پیر علی پہلے سے بیوی پر غصہ ہو رہا تھا نیکے کے قدم رک گئے افروز کہہ رہی تھی۔

”دیکھو پیر و..... میرے سسھی پال لگی ہے، مجھے اس مصیبت میں نہ ڈال میری بچیاں کم عمر ہیں میں نہیں

”.....“ پیر علی اسے اپنے ساتھ نیچے لے آیا۔
 ”رات کافی ہوگئی ہے تو بھی جا کر آرام کر لیجئے، صبح
 اسے لینے والے آجائیں گے۔“ یہ کہہ کر پیر علی اپنے
 کمرے میں چلا گیا۔

فقر علی کچھ دیر باہر ٹھہرتا رہا پھر اپنے جذبات
سنبھالتے ہوئے اندر کمرے میں قدم رکھا ابھی وہ
کمرے کے اندر ہی پہنچا تھا کہ اسے خیال آیا اس نے
زمین کو تحفہ دینے کے لیے سونے کی چھوٹی چھوٹی سی
پالیاں بنوائیں تھیں اور انہیں شلوار کی جیب میں رکھا تھا
اب قہیں شلوار کی ساری جیبیں ٹٹول ڈالیں مگر وہ پالیاں
نہیں ملیں وہ بے چین ہو کر کمرے سے نکل آیا اور باہر
سجن میں ڈھونڈنے لگا..... زمین جو ادھ موٹی سی پیٹھی تھی
فیکے کی حرکتیں دیکھ کر پہلے تو حیران ہو گئی پھر ایک ٹک
اسے دیکھنے لگی فیکا پھر اندر آ گیا..... کبھی کپڑے جھاڑتا
..... کبھی بغلوں میں ہاتھ مارتا کبھی جھکتا..... کبھی

اٹھتا..... زمین اسے شدید، جھلا کہتی تھی اب بھی اس کی ہونق حالت پہ وہ اپنی تہی نہ روک سکی وہ جو تہی تو فیر کا یک دم جھل سا ہو گیا، زمین ہنس رہی تھی۔

اسی وقت گھنٹے کی ٹمک ٹمک نے فیکے کی توجہ اپنی طرف کرائی تھی، پورے بارہ بج رہے تھے۔ ایک دم فیکے پہ خوف سا طاری ہونے لگا..... فیکے نے بہت دنوں بعد زبین کو دیکھا تھا اس کا گول منہ صحت مند چہرہ بالکل ست گیا تھا جڑوں کی ہڈیاں نظر آنے لگی تھیں، آنکھوں کے گرد حلقے بہت گہرے ہو گئے تھے یہاں تک کہ اس کی رنگت بھی اب پہلے جیسی نہیں تھی میک اپ میں اس کا چہرہ واقعی کسی بھوت سے کم نہیں لگ رہا تھا فیکے پر لرزہ سا طاری ہو رہا تھا۔ فیکے نے اس طرح زبین کو دیکھا تو زبین ایک دم چپ سی ہو گئی فیکا الجھ سا گیا..... خود کو ملامت کرنے لگا کیا وہ اتنا بے وقوف اور بزدل ہے اسے پھر سے بالیوں کا خیال آیا۔

”لگتا ہے بالیاں کم ہو گئی ہیں..... اتنی بڑی بدشگونی پہلے ہی روز بھر جانی کہا کرتی تھی سونا کھونا اچھا ہے نہ پانا..... نہ جانے زمین میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔“ وہ شرماتا ہوا ساز زمین کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں باہر کا دروازہ بج گیا، فیکے کے قدم رک گئے دروازہ بری طرح بج رہا تھا زمین بھی گھبرائی فیکے نے دروازہ کھول دیا۔ پیر علی سامنے کھڑا تھا۔

”تمہاری بھر جانی پر گرم گرم دودھ گر گیا ہے وہ بری طرح جل گئی ہے، ہمیں اسے ابھی شہر لے جانا پڑے گا۔“ فیکا غلام کی طرح دست بدست چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

”بچے گھر میں اکیلے ہیں، فیکے کو گھر میں ہی رہنے دیں ہم بچہ کو ساتھ چلیں گے۔“ افروز تکلیف سے کراہ رہی تھی۔

”رات کا وقت ہے، فیکے کا چلنا زیادہ ضروری ہے..... بچہ تو ابھی بچہ ہے۔“ پیر علی، بیوی کو تسلیاں دے رہا تھا۔

”نہیں..... نہیں پیرو..... فیکے کو یہیں رہنے دو دیکھ ابھی رات بھی نہیں گزری اور کیسی قیامت آئی ہے نہ جانے صبح تک ابھی کیا ہونا باقی ہے۔“

”نیک بخت، بھلی بات نکال منہ سے..... غلطی تو تیری ہے اندھیرے میں دودھ لے کر چل رہی تھی۔“

پیرو بیوی کا وہم دور کرنا چاہ رہا تھا جبکہ افروز صدق دل سے اس بات پہ قائم تھی کہ یہ سب کچھ زمین کی وجہ سے ہو رہا ہے..... زمین دروازے سے چپکی کھڑی تھی۔

افروز کے خیالات جاننے کے بعد اس کے قدم ہمدردی اور مدد کے لیے بڑھ ہی نہ سکے۔ فیکے کے دل میں آہستہ آہستہ یہ باتیں جذب ہو رہی تھیں ضرور کچھ نہ کچھ ہے۔

”فی الحال اس بحث کا وقت نہیں ہے..... ہمیں بھر جانی کو فوراً اسپتال لے جانا پڑے گا یہ بہت زیادہ جل گئی ہے۔“ فیکے نے آفت مچائی تو افروز تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔

”اگر تمہیں مجھے سے ہمدردی ہے ناں تو تم خدا کے واسطے میرے بچوں کے پاس رہنا ورنہ..... وہ

میرے بچوں کو مار دے گی۔“ افروز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

فقیر علی اور پیر علی اسے ریڑھی پر ڈال کر شہر جا لے والی سڑک کی طرف نکل گئے جاتے ہوئے پیرو کے بچوں کو حوصلہ دیا تھا۔

”تمہاری چاچی ہے گھر میں، تم پریشان نہ ہونا.....“ بچے رو رہے تھے زمین کمرے سے نکل آئی اور بچوں کو تسلیاں دینے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں بچے ماں کا غم بھول کر نئی نویلی چاچی کے سحر میں گم ہو گئے تھے۔

صبح کی سپیدی پھوٹی تو دادی نے شکرانے کے نفل ادا کیے بس ایک رات کی بات تھی اس رات کی سناہی نے زمین کے داغ کو چھپا لیا تھا زمین الزام سے بچ گئی تھی اور وہ دنیا کی نظروں میں سرخرو ہو گئی تھیں مگر رب کے حضور کتنی ندامت اور شرمندگی تھی۔ زمین کو رخصت کرنے سے لے کر صبح تک ان کی آنکھ ہی نہ سو گئی تھی۔

رات گزر گئی تھی اللہ نے اپنے فضل کی چادر دونوں پر پھیلا دی تھی..... وہ اطمینان سے جائے نماز پہنچے ہوئے انہیں اور گڑھے سے پانی نکال کر پینے لگیں۔

”اب زمین کو لینے کون جائے گا..... یہ کام تو لوکیاں بالیاں کرتی ہیں، میں بوڑھی کیا اچھی لگیوں کی جاتے ہوئے۔“ وہ اپنے آپ ادھیڑ بن میں مبتلا تھیں۔

”اکثر یہ کام گاؤں میں نائی بھی کرتے ہیں کیوں نہ فضلہ نائی کو بلا لیتی ہوں شکرانے (میٹھے چاول) کا تھال بھی لے جائے گا اور زمین کو بھی لے آئے گا۔“ اسی خیال کے تحت دادی نے چاول چولھے پر ابلنے کے لیے رکھے اور گھر سے نکل گئیں۔

فضلہ نے اپنے گھر کی دیوڑھی میں ہی چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی۔ علی الصباح ہی اس کی دکان میں رونق ہو جاتی تھی اب بھی اس کی دکان میں گاہک موجود تھے۔ ریڈیو چل رہا تھا فضلہ نائی اپنے کام میں مصروف تھا دادی ابھی چند قدم کے فاصلے پر تھیں کہ رشید ہانپتا ہوا دکان میں داخل ہوا اور سب کو متوجہ کر کے کہنے لگا۔

”لو بھائیوں سن لو..... اب تو واقعی تصدیق ہو گئی ہے زمین پر کسی چھوٹے موٹے جن کا نہیں کوئی بھاری

ہی آسیب ہے اس پر۔“ دادی کے قدم رک گئے۔

”رات رخصت ہو کر فیکے کے گھر گئی ہے، فیکے کے گھر نہ جانے کیسی آفت آئی پیرو اور فیکے کو رات اسپتال جاتے دیکھا ہم نے..... ساتھ میں کوئی زانیہ بھی بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے بس اتنا ہی بتایا کہ اسپتال جا رہے ہیں۔“

”تو تم نے پتا نہیں کیا کہ کیا ہوا.....؟“ سب اس خبر سے متوجہ نظر آنے لگے تھے۔

”اگر آپ لوگ کہیں تو جا کر پوچھ آتا ہوں۔“ گاؤں والوں کو خوف کے ساتھ ساتھ تجسس بھی چھین نہیں لینے دے رہا تھا اچانک فضلہ کی نگاہ دادی پر پڑی۔

”صدیقن! بہن آپ..... اور یہاں اتنی صبح..... فیر تو ہے.....؟“ فضلہ کے ساتھ ساتھ باقی لوگ بھی دادی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

دادی کے چہرے کے رنگ اڑے ہوئے تھے انہیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ زمین کے گھر میں..... نہیں..... زمین کی اس گھر میں رات کیسی گزری ہے۔“ انہیں زمین کی ہی تو طبیعت زیادہ خراب نہیں ہو گئی ہو اور فیکا اسے اسپتال لے گیا ہو تب تو سارا اچھیدھل جائے گا۔“

دادی اگلے قدموں پلٹیں اور زمین کے گھر کی راہ لی۔

”کیسا شکرانہ اور کہاں کا شکرانہ نہ جانے کون سی رسوائی ابھی اس دامن پہ پھیلنے والی ہے.....“ دادی تیز تیز قدم اٹھاتی زمین کے گھر کی طرف جا رہی تھیں راستے میں جس جس کی نگاہ دادی پہ پڑی وہ حیرانی سے دیکھتا مگر پوچھنے کی کسی نے جرأت ہی نہ کی..... ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر دادی نے چھوٹے سے صحن میں قدم رکھا تو زمین سامنے ہی بیٹھی نظر آئی۔ دادی کو کچھ کر زمین، دادی سے لپٹ گئی..... مگر ابھی وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔

”فیکا اوپر پیرو کے اسپتال لے کر گئے ہیں.....؟“ ان کی آنکھیں پورے سراپا سے ہویدہ تھی۔

”اماں کے اوپر گرم دودھ گر گیا تھا، چاچا اور ابا اماں کو لے کر گئے ہوئے ہیں۔“ پیرو کی بیٹی نے بتایا تو دادی کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

”کیسے گر گیا تھا دودھ..... کیا زیادہ جل گئی۔“

”پتا نہیں کیسے گر گیا تھا..... مگر بہت زیادہ جل گئی ہیں.....“ دادی گہری سوچ میں پڑ گئیں ان گنت سوال ان کے دل میں تھے مگر فی الحال نہیں کر سکتی تھیں.....

دادی وہیں بیٹھ گئیں۔

”کافی دن چڑھ آیا ہے..... ان بچوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ کچھ کھلا پلا دیتی..... نہ جانے وہ لوگ تو کب تک آئیں گے۔“ زمین دادی کے کہنے پر انھی تو

193

ماہنامہ پاکیزہ

اگست 2009

192

ماہنامہ پاکیزہ

اگست 2009

ایک دم اس کا سر چکر ا گیا دیوار نہ تھامت تو زمین پر ڈھیر ہو جاتی..... دادی نے تشویشناک طریقے سے اس کی طرف دیکھا۔

”تیری تو خود طبیعت صحیح نہیں ہے..... جا..... تو اندر جا کر آرام کر لے..... میں شکر چاول بنا رہی تھی یونہی چھوڑ کر آگئی اب خود ہی جاتی ہوں تاکہ ان بچوں کو کچھ تو آسرا ہو.....“ یہ کہہ کر دادی نے سر پر ٹوپی والا برقع رکھا، زمین کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ دادی دروازے میں جاتے جاتے اس کے کمرے میں آگئیں۔

”کس وقت گئے تھے یہ لوگ اسپتال.....؟“

”پتا نہیں..... زمین نے سادگی سے جواب دیا تو دادی کو سخت تاؤ آیا.....؟“ میرے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ فیکا کمرے میں آیا تھا.....؟“ دادی نے دبے دبے لہجے میں ناراضی سے پوچھا۔

”ہاں.....!“ زمین نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ دادی سکون کا سانس خارج کرتیں پر زمین کے اگلے جملے نے حلق میں کانٹے اگا دیے۔ ”ابھی وہ کمرے میں آیا تھا اور دوسرے ہی پل یہ واقع ہو گیا۔“

دادی کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ سوچ کر بولیں۔

”ہو سکتا ہے افروز کو اسپتال میں ہی رہا پڑے..... اس لیے میں تجھے لے کر نہیں جاؤں گی..... اور اگر وہ گھر آگئی تب اس وقت تو اس کی خدمت کرے گی کام آئے گی تو تجھے ہی فائدہ ہوگا.....“

”مگر دادی.....“ زمین پریشان نظر آنے لگی۔

”مگر.....“ مگر کچھ نہیں جس طرح سمجھا رہی ہوں سمجھ لے، اللہ کرے وہ لوگ خیر خیریت سے گھر آجائیں زیادہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے اب بھولی بچی نہیں ہے..... جسے میں ایک ایک بات بتاؤں..... حالت دیکھ اپنی روزانہ تو تو الٹیاں کرنے دیتی جاتی ہے سب کو شک ہو جائے گا..... فیکا اگر آئے تو اسے رات اسپتال جانے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسے روک لینا.....“

”مم..... میں.....“ زمین اس جرات پہ حیران اور پریشان ہوئی تو دادی کو غصہ آ گیا۔

”ہاں..... تو..... اور کون..... ایک بات بتا دوں تجھے..... وہ تیری کبھی کوئی بات نہیں ٹالے گا.....“

تیرا غلام بن کر رہے گا..... کسی بھی چیز کی کی نہیں ہے تیرے پاس..... ذرا خرچے اور ٹھانڈ سے رہنا.....“

”مگر دادی.....“ زمین، افروز کے خیالات بتانا چاہ رہی تھی..... تو دادی جلدی سے بولیں۔

”بچے سارے گھر میں کد کڑے لگاتے پھر رہے ہیں کسی کے بچے کان میں بھنک پڑ گئی تو مصیبت آ جائے گی دو چار روز میں تجھے بلاؤں گی..... پھر بتانا..... اب میں جا رہی ہوں، شکرانہ بھیج رہی ہوں اس خدائی فوج کو کھلا دینا اور کچھ اپنے حلق میں بھی ڈال لینا ساتھ دودھ بھی بھیج دوں گی اب ذرا ہمت سے کام لے اب یوں کوٹھڑی میں پڑ کر گزارہ نہیں ہوگا، ہو سکتا ہے اب مجھ سے دوبارہ نہ آیا جائے..... جب افروز آجائے گی تب آؤں گی.....“ دادی نکل کر چلی گئیں ان کے بعد چند خواتین گھر میں داخل ہوئیں۔

”ہائے..... ہائے کیا ہو گیا..... بے چاری افروز کو..... رات تک تو اچھی بھلی تھی.....“

”اماں..... جل گئی ہے خالہ.....“ بچے معصومیت سے بتا رہے تھے خواتین کی نگاہیں زمین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

”ہائے بے چاری، کیسے جل گئی آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔“

”ہاں دیکھو تو سہی..... بیٹھے بیٹھائے کیسی مصیبت آ گئی.....“ وہ صحن میں پڑے پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں..... اور آپس میں خود ہی باتیں کرنے لگی تھیں۔

”افروز کا شک مجھ تھا مگر نہ جانے پیرو بھائی پہ کیا پھونکا دونوں دادی پوتی نے کہ بیوی کی ایک نہ سنی..... اب بھگت رہا ہے.....“

”بس بہن..... خدا بروقت نہ لائے، ہم تو کہتے ہیں افروز کو چاہیے اب اس گھر کو چھوڑ دیے۔“

”ہا.....“ ہے افروز کیوں چھوڑ دے..... وہی نکل جائے یہاں سے ویسے ہے کہاں تمہاری چاچی.....؟“

”چاچی اندر کمرے میں ہے خالہ۔“ تینوں عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا..... اور اشارہ کرتے ہوئے اٹھ گئیں۔

”ہم چلتے ہیں، افروز آئے گی ناں پھر آئیں گے۔“ چلتے چلتے انہوں نے جھانکی ضرور ماری تھی زمین مسہری پریشانی ہوئی تھی۔

”افروز کے بچے اس کے کمرے میں کھیل رہے ہیں، اللہ افروز کے معصوم بچوں کی حفاظت کرے..... یہ تو چڑیل ہے پوری..... آتے ہی گھر میں مصیبت مچا دی.....“ یہ کہتے ہوئے وہ خواتین باہر نکل گئیں..... زمین سکون سے لیٹی رہی..... اسے یہ الزام قبول تھا..... کیونکہ اس سے اس کے سارے گناہ چھپ رہے تھے..... بچوں نے اتنا ہنگامہ کر رکھا تھا کہ زمین کے سر میں درد ہونے لگا تھا اور دادی نے ابھی تک چاول نہیں بھیجے تھے، بچے بھوک سے بلبلاتے پھر رہے تھے اسے بھی خالی معدے کی وجہ سے اباکیاں آنے لگی تھیں اسی وقت باہر شور مچا۔

”اماں..... آگئی..... اماں آگئی.....“ باقی بچے بھی اس کے کمرے سے نکل کر باہر بھاگے۔

”اوئے دھیان سے..... پٹیاں بندھی ہیں.....“

”اماں سے پرے ہی رہو میرا تو خیال ہے بھر جائی کو اندر ہی لٹا دیتے ہیں یہاں کھیاں چین نہیں لینے دیں گی.....“ افروز کو ایک طرف سے پیرو نے پکڑ رکھا تھا اور دوسری طرف سے فیکے نے اس کی ایک ٹانگ پیٹ اور سینہ جلاتا تھا، بازو اور گردن پہ بھی چھنٹیں آئی تھیں..... زمین کمرے سے نکل آئی..... ایسے حالات میں اندر رہنا اسے ٹھیک نہیں لگا تھا لیکن جیسے ہی افروز کی نگاہ زمین پر پڑی تو غصے سے بولی۔

”یہ منحوس ابھی تک میرے گھر میں ہی ہے..... دفع نہیں ہوئی یہاں سے.....“

”تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے افروز تو اندر چل کر آرام کر۔“ پیرو بیوی کو سمجھا رہا تھا۔ اتنی دیر میں گلی کے لڑکے شکرانے کے تھال سر پر رکھے اندر آ گئے۔

”یہ چاول زمین کی دادی نے بھیجے ہیں۔“ یہ کہہ کر لڑکے نے تھال افروز کے سامنے رکھ دیا۔

”میرے گھر میں مصیبت بھیج کر بڑھیا کو شگونوں کی سوچ رہی ہے دیکھ رہے ہو تم لوگ..... اٹھا اسے یہاں سے اور پھینک کر آس کے گھر..... اور تو نے رہنا ہے ناں اس کے ساتھ تو واپس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر افروز اندر کمرے میں چلی گئی۔ بچے اس

شکرانے کے تھال پر نندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور منٹوں میں ہی شکر اور چاول ہڑپ کر گئے۔

فیکا بے دلی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ زمین دیوار سے چپکی کھڑی تھی..... نہ جانے کیا بات تھی..... جس زمین کو ایک نگاہ دیکھنے کے لیے وہ آنے بہانے سے دادی کے گھر میں جایا کرتا تھا زمین کی پوری ملکیت حاصل ہونے کے بعد اسے چھوٹا تو کیا دیکھنے کی بھی دل میں امنگ نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے سونے کی بالیاں کم ہوئیں۔ پھر بھر جائی کے ساتھ یہ حادثہ ہوا..... اور اب..... اچانک شور مچا اور اچھو پیرو کا سب سے چھوٹا بیٹا..... میزھی سے گر گیا تھا فیکا دوڑ کر باہر گیا بچے کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے.....؟“ سب بچے کو دیکھنے میں لگ گئے..... ادھر افروز اندر سے چلا رہی تھی فیکے کا دماغ چھٹنے لگا اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

”تمہیں..... تمہیں ابھی اور اسی وقت میں دادی کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔“ فیکے نے اس قدر جھرا لے ہوئے طریقے سے کہا کہ زمین خود کو مجرم تصور کرنے لگی۔

”یقین کرو یہ سب کچھ میری وجہ سے نہیں ہو رہا ہے، کیا تم بھی باقی لوگوں کی طرح یہی سمجھ رہے ہو۔“

”میں اس بارے میں فی الحال کوئی بات نہیں کر سکتا اس وقت یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ.....“

دادی کی نصیحتیں زمین کے ارد گرد گونجنے لگیں۔

”میں یہاں سے نہیں جاؤں گی.....“ اس کی بے کاری ضد یہ فیکا چڑ گیا۔

”تو ٹھیک ہے..... میں ہی چلا جاتا ہوں..... یہاں سے..... اور تم یہاں بیٹھی رہو۔“ فیکا کمرے سے نکلا تو زمین دوڑ کر اس کے پیچھے آئی۔

”ٹھہرو..... رکو..... میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر زمین نے چادر سنبھالی اور فیکے کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔

دادی نے دروازہ کھولا تو زمین، فیکے کے ہمراہ

کھڑی تھی دادی سامنے سے ہٹ گئیں زمین اندر آ گئی..... مگر فیکا اندر نہیں آیا۔

”بھر جائی کی طبیعت بہت خراب ہے اوپر سے ایک اور مصیبت آگئی، اچھو پیرو صیوں سے گر گیا بھر جائی نے واویلا مچا رکھا ہے جتنے دن حالات نہیں سدھرتے زمین ادھر ہی رہے گی۔“ فیکے نے دادی سے نظریں چراتے ہوئے کہا تو دادی کی تیوریاں چڑھ گئیں اتنی بڑی قربانی انہوں نے زمین کو یونہی رکھنے کے لیے تو نہیں دی تھی۔

”اور تم کہاں..... رہو گے.....؟“ دادی کا لہجہ سخت تھا فیکے نے چونک کر دادی کی طرف دیکھا..... گاؤں میں تو عام رواج تھا جوانی کو سر پر بٹھا کے رکھتے تھے اس کی ہر بات مانی جاتی تھی..... جائز یا ناجائز..... چاہے کوئی کتنا ہی کمتر کیوں نہ ہو بچی لینے کے بعد سب سے اوپر کے درجے پہ آجاتے تھے۔ پھر فیکا

ابھی تک نچلے درجے پہ ہی کیوں تھا فیکے کو اپنا آپ بہت کمزور اور حقیر لگا..... دادی نے اندر آنے کا نہیں کہا تھا..... دوبارہ استفسار کر رہی تھیں۔

”میں پوچھ رہی ہوں تو کہاں رہے گا.....؟“

دادی کے رعب اور دبے کے آگے فیکا ازلی بھیگی ملی بن گیا۔

”جب تک بھر جائی کی طبیعت خراب ہے تب تک..... وہ دبے دبے لہجے میں بولا..... تو دادی چمک کر کہنے لگیں۔

”زمینوں کی دیکھ بھال زنانیاں کرتی ہیں اسے تو تو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہے..... اور تو کمرے کا بھانج ک خد متیں..... جو تیرا گھر بسنے پر پہلے روز ہی جل گئی تھی.....“ فیکے نے چونک کر دادی کی طرف دیکھا۔

”ارے بیوقوف..... اب تو اس کا جسم سڑا ہے تیری قسمت اور بھاگ یر تو اس کا تن من پہلے ہی جل گیا

UrduPhoto.com

نت لہجے میں کہا تو فیکا عاجزی سے ان کے سامنے آگیا۔
”مجھے معاف کروں..... دادی.....“ وہ ہاتھ
بڑے کھڑا تھا دادی نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا
اور کہنے لگیں۔

”زبین میرے اوپر بھاری نہیں ہے.....“
”میں جانتا ہوں دادی..... مگر..... میں چاہتا تھا
ام لوگ ویسے کے بعد یہاں آئیں۔“

”تیری بھر جانی تو کھاٹ میں پڑی ہے اور تجھے
ایسے کی سو جھ رہی ہے..... جانتا بھی ہے اس کے ٹھیک
ہونے میں کتنا وقت لگے گا.....“ فیکے کے پاس خاموشی

کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ”اس سے تو بہتر ہے میں دل
پر پھر رکھ کر زبین کو شہر میں دھکا دے دیتی.....“ دادی
خالی گلاس لے کر صحن کی طرف آگئیں فیکا مجرم سا کھڑا رہا۔

”بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اپنے کپڑے
لتے لے کر شام کو ہی ادھر آ جاؤں گا..... بناتے ہیں تو
لوگ باتیں بناتے رہیں..... مجھے بھی کسی کی پروا نہیں ہے۔“

پہاڑ سادہ بڑی مشکل سے لونگھا تھا فیکے نے اپنا
سندوق جس میں اس کے کپڑے اور کچھ جوڑی ہوئی رقم
تھی باندھ لیا تھا..... بھر جانی سے ملنے کے لیے اندر

کمرے میں جانے لگا تو اندر سے آتی آوازوں پہ قدم
ہی رک گئے۔
”تجھے فیکے کا خیال نہیں ہے پیرو..... فیکا جھلا ہے

وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائے گا..... اور میں
صاف کہہ رہی ہوں زبین کا آسیب اسے بلا کر ہی دم
لے گا اور تب ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

”کہیں نہیں جا رہا فیکا، تجھے زیادہ ہمدردی ہو رہی
ہے تو جا کر دیکھ لے..... باہر بیٹھا ہے.....“ پیرو بیوی یہ
جھلا یا تھا بھر جانی کے خیالات پہ فیکے کا دل

ڈمگایا..... پھر یک دم ہی اس کے پورے وجود میں
غصہ بھر گیا اور وہ بنا ملے ہی گھر سے نکل آیا۔ دادی کو
پوری امید تھی کہ فیکا مغرب سے پہلے ہی آجائے گا

زبین کی طبیعت بہت گھبراہٹ تھی پھر اچانک ہی زبین
کے پیٹ میں درد اٹھ گیا۔
”میں نے تجھے کہا بھی تھا کپڑے نہ دھو مگر تو نے

اندر بھی چلا جاؤں گا..... مگر..... وہاں..... رہنا.....
بہت عجیب لگے گا.....“
”کیا بات ہے فیکے نیند نہیں آرہی کیا.....؟“ پیرو

نے منڈیر سے جھانک کر پوچھا تو فیکا جو بٹے پیر کی لمبی کی
طرح صحن میں پھر رہا تھا ٹھنک گیا۔
”بس..... وہ ذرا دل گھبرا رہا تھا اس لیے باہر نکل

آیا تھا۔“ وہ بھائی کو جواز بتا رہا تھا اتنے میں افروز کہنے
لگی۔
”صبح اسے کسی مولوی کے پاس لے جانا اس کی

جھاڑ پھونک ضروری ہے، ایک رات رہ کر گئی ہے وہ
یہاں ضرور اس پر بھی اثرات پڑ گئے ہوں گے..... مجھے
کی دوہنی کا بھی پیکی مسئلہ تھا..... یاد ہے ناں..... اور کسی

جھے کی ٹھکانی کی بھی اس جنات نے..... اور پھر سارے
گھر پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔“
”اچھا..... اچھا تو سو جا تجھے تو بس ہر وقت جن

بھوتوں کے قصے یاد رہتے ہیں.....“ افروز پیرو اسے
ابجھنے لگی تو فیکا مزید بے زار ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اسے
زبین شدت سے یاد آرہی تھی۔“

ابھی دن کا اجالا اچھی طرح سے بھی نہ نکلا تھا فیکا
اپنے کام پر پہنچ گیا۔ دادی جائے نماز سے اٹھیں تو تھان
میں کچھ آوازیں سی محسوس ہوئیں۔ دادی نے جھانک کر

دیکھا..... تو فیکا خاموشی سے جانوروں کے چارے کی
کھور (جس میں جانور چارا کھاتے ہیں) صاف کر رہا تھا
دادی چپ چاپ وہاں سے ہٹ گئیں۔ اس کا مطلب

ہے فیکا رات بھر جاگتا رہا ہے تبھی تو آج وقت سے پہلے
پہنچ گیا..... دادی کسی رٹک کر لے آئیں..... فیکا جانور
نہلانے کی تیاری کر رہا تھا۔

”لے..... یہ..... لی لے۔“ فیکے نے جھجکتے
ہوئے دادی کی طرف دیکھا اور گردن جھکا کر گلاس پکڑ لیا۔
”زبین کی طبیعت کیسی ہے.....؟“ وہ شرمندہ

دکھائی دے رہا تھا دادی نے کوئی جواب نہ دیا۔
”میں رات کو زبین کو لے جاؤں گا۔“
”زبین اپنے گھر میں ٹھیک ہے.....“ دادی نے

تھا مگر تجھے یہ بات سمجھ نہیں آئے گی..... تو جان کی
خدشیں کر..... مگر کچھ نہیں ملنے والا تجھے وہاں سے، تجھے
قدر ہی نہیں ہے زبین کی.....“ دادی نے یہ کہا اور سختی

سے دروازہ بند کر لیا..... فیکا جہاں کا تھاں کھڑا رہ
گیا۔ دادی زبین کی طرف پلٹیں..... جو مرے مرے
قدموں سے اندر جا رہی تھی۔

”نہ جانے قسمت میں کیا ہے..... جتنا اس داغ کو
چھپانا چاہ رہی ہوں اتنا ہی سامنے آ رہا ہے.....“ دادی
دلبرداشتہ سی ہوتی کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

فیکا گنوار انسان تھا..... بے شک زبین سے محبت
بھی کرتا تھا مگر ان اچانک حادثوں کو فراموش کرنا اس
کے بس میں نہیں تھا..... زبین کے جانے کے بعد گھر میں

جیسے سکون سا اثر آیا..... دراصل یہ سکون، سوچ سے
وابستہ تھا، خوف، سوچ میں پنہاں تھا۔ سوچ مکمل ہوئی تو
سب کچھ طے پا گیا..... فیکے کو تو بس گھر میں سکون چاہیے

تھا اور اب وہ میسر آ گیا تھا لیکن یہ کیا سکون تھا جو جلد ہی
ناپید ہو گیا تھا ساری رات اسے نیند نہ آئی..... اور وہ
کروٹیں بدلتا رہا۔

”کتنا بے وقوف ہوں میں بھی..... بھر جانی کی
لعن طعن سے گھبرا کر زبین کو اس سے گھر چھوڑ آیا..... کسی
کو اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے..... گڑہستی تو میری

خراب ہو رہی ہے..... دادی ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں یہ
لوگ جل گئے ہیں کہاں شہزادیوں جیسی زبین اور کہاں
کالی موٹی بھر جانی..... وہ کہاں برداشت کرے گی زبین

کو..... مجھے زبین کو یوں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا..... کیا
میں بھی وہیں رہنے لگ جاؤں..... نن..... نہیں نہیں
وہاں تو دادی ہوتی ہیں ساری عمر تو ان کا کاما بن کے رہا

اور اب جوانی بن کر ان کے ٹکڑوں پہ پلنے کے لیے پڑا
رہوں یہ طریقہ صحیح نہیں..... مگر..... اس کے علاوہ اور
کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے.....“ فیکا کمرے میں ٹہلتے

ٹہلتے بے زار ہو گیا تھا کمرے سے باہر نکل آیا۔
”صبح سے میں کام پر جانا شروع کر دوں گا آخر
دادی کے جانور بھی تو دیکھنے ہیں دادی نے لفٹ کرائی تو

اور تیز تیز آوازیں نکال رہے تھے ادھر طوفان میں شدت آتی جا رہی تھی۔ اندر زمین کراہ رہی تھی دادی کے بوڑھے ناتواں وجود میں ہول اٹھنے لگے۔

”یا اللہ رحم کرنا..... سب پر رحم کرنا..... آری ہوں دروازہ توڑو گے کیا.....؟“ دادی نے لکڑی کا دروازہ پیٹ سے کھول دیا۔ تیز آندھی نظروں کو دھندلا رہی تھی۔ ملکوسا منے چوکھٹ پر کھڑا تھا دادی نے بمشکل تمام دیکھنے کی کوشش کی مگر صحیح طرح بجھائی نہ دیا..... البتہ یہ صاف معلوم ہو گیا تھا کہ یہ فیکا نہیں ہے۔

”میں ملکو ہوں.....!“ دادی کے قدموں سے زمین سرک گئی..... ملکو اندر آ گیا دادی ڈر کر ایک طرف ہو گئیں طوفان اتنا تیز تھا کہ دروازے دھڑا دھڑا بجنے لگے۔

”سنا ہے تو نے اپنی پوتی کا بیاہ اس کم جاتے فیے سے کر دیا ہے..... ہمارا خیال نہیں آیا تھے.....“ دادی کی آنکھیں پتھرائی تھیں اور لب سل گئے تھے مگر ملکو، دادی کو کچھ سننے بھی نہیں آیا تھا صرف اطلاع دینے آیا تھا۔

”بہت جلد بازی کی تو نے..... مشورے میں برکت ہوتی ہے، ہم سے مشورہ تو کر لیتی۔“ یہ کہہ کر ملکو دھانہ طریقے سے ہنسا..... ”خیر..... ہم تجھے صرف اتنا بتانے آئے تھے اب فیکا بھی ادھر نہیں آئے گا..... بلکہ ادھر تو کیا پورے پنڈ میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔“ خوف اور دہشت سے دادی کی ٹانگیں کانپنے لگیں..... چہرہ پیلا زرد ہو گیا..... آنکھیں پتھرا گئیں دادی کی حالت سے محظوظ ہو کر کہنے لگا۔

”ڈر نہیں..... فیکا اپنا ہی بچہ ہے..... جہاں بھی رہے گا سکون سے رہے گا۔“ وہ پھر زور سے ہنسا اس قہقہہ دادی کی ہی نہیں زمین کی بھی سماعتیں چیرنے لگا تھا۔

”تو زمین کی فکر چھوڑ دے..... زمین کو ہم جائیں گے اور بڑے ٹھاٹ سے رکھیں گے۔“

”زے..... زے..... بن..... فیکے کے.....“

میں ہے.....“ دادی خوف سے رو دیں۔

”اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا.....“ ملکو نے ڈھٹائی سے کہا اور گھر سے نکل گیا۔

نہ مانی نہ جانے کیا درد ہے جو مٹنے میں ہی نہیں آ رہا..... لے لے یہ دوا پی لے..... اس سے ضرور درد کم ہو جائے گا۔“

”پتا نہیں..... دادی..... ایسا تو مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔“ زمین کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔

”کیا.....؟“ دادی چونک گئیں..... باہر دروازہ بج رہا تھا، کہیں فیکا نہ ہو..... دادی کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

”لے لے یہ اچھا..... تو لے یہ پھکی تو پی.....“ دادی نے اسے گرم دودھ سے دوا دی پھر اسے لٹا دیا۔ دروازہ گاہے بگا ہے بج رہا تھا۔

”میں جا کر دیکھتی ہوں۔“

”نہیں دادی..... میرے پاس سے نہ اٹھو..... یہ درد میری جان لے لے گا.....“ زمین رو رہی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے زمین تجھے حوصلہ کر..... کمزوری بہت ہو گئی ہے ناں تجھے اس لیے تکلیف برداشت کر نہیں کر پار ہی۔“ اب کی بار دروازہ زور زور سے بجنے لگا تھا۔

”یہ فیکا ہی ہے..... اس سے قبل وہ صحن میں کودے میں جا کر دیکھتی ہوں..... ہائے اللہ اتنی تیز آندھی.....“ دادی نے بمشکل اپنی اوڑھنی کو سمیٹا تھا آندھی اتنی تیز تھی کوئی بھی چیز صحیح طرح سے..... دکھائی نہیں دے رہی تھی پھر بھی دادی نے جلدی جلدی باورچی خانے اور دوسرے کمروں کے دروازے بند کئے جانوروں کے تھان میں بھی ہل چل مچ گئی تھی بجلی چلی گئی تھی۔

”اللہ رحم کرے بہت تیز طوفان ہے جانور بھی پریشان ہو گئے ہیں.....؟“ ان کی زنجیریں بج رہی تھیں



ناولٹ

پچی گاڑوٹ گئی

میمونہ خورشید علی

قطعہ 4

آج صبح ایسے نمودار ہوئی تھی جیسے زندگی نے آنکھ
موند لی ہو..... ہر طرف ہوکا عالم تھا اور دھول چہار سو
پہیلی ہوئی تھی..... رات بھر طوفان آیا اور بجلی چمکتی رہی
میں..... ملکوبھی اسی طوفان کا حصہ بن کر ان کی چوکھٹ پہ
آیا تھا اور دادی کے اعصاب پر جو بجلی گرا کر گیا تھا اس
نے ان کی سدھ بدھ چھین لی تھی..... طوفان کیا تھا تھا۔
دادی کو لگتا تھا جیسے ان کے قدموں کے انگوٹھوں سے کوئی
جان مچھنچ کر لے گیا ہے۔

کتنی قیامت تیز رات تھی..... ادھر ہوا کے تیز جھکڑ، درختوں کا باہم ٹکرانا اور زمین کا جان لیوا درد..... اور اس کی چیخیں اور پھر جیسے طوفان تھما، کائنات کی ہر شے خاموش ہو گئی۔

جس باپ کے پیچھے دادی نے زمین کا نکاح کرانے میں جلدی کی تھی..... وہ اب خود بخود زمین کی جان چھوڑ گیا۔ شاید قدرت کو ان پر رحم آ گیا تھا بھی تو رات کے اندھیرے میں اس داغ کو مٹا دیا جس کے پیچھے دادی..... زمین کے لیے کم ذات فیکے کوسر کا تاج بنانے پر مجبور ہو گئی تھیں..... ”مگر..... ملکو..... کیا کہہ کر گیا تھا رات کو..... کہ اب فیکا کبھی گاؤں میں نظر نہیں آئے گا۔ کیا ملکو..... فیکے کو جان سے مار دے گا..... ہاں وہ ایسا کر سکتا ہے اور پھر ملکو کیا کرے گا..... وہ زمین کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“ دادی نے چونک کر گہری نیند سوئی زمین کی طرف دیکھا۔

”نہ جانے کتنے دن کے بعد..... ایسی سکون کی نیند سوئی ہے جھلی.....“ دادی کی آنکھیں بھر آئیں۔

”اچھا ہی ہے، فیکے سے خود بخود جان چھوٹ گئی..... مگر..... نہیں..... ملکو..... ملکو سے ہمیں کون بچائے گا۔ وہ درندہ..... بھیڑیا..... یا خدا یا..... میں اپنی پھول سی بچی کو کہاں لے کر جاؤں..... جہاں تو نے میرا اتنا بھرم رکھا ہے۔ مجھے اس سے بھی بچالے..... میں بوڑھی ناتواں عورت..... اس خزانے کی حفاظت کیسے کروں گی۔“ پھر دوسرے ہی لمحے دادی کو شہر جانے کا خیال آیا۔

”زمین..... اے زمین.....“ زمین دوسری ہی آواز پراٹھ گئی۔

”چل جلدی اٹھ.....“

”یوں..... خیر تو ہے دادی.....؟“ زمین سخت نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ چکراتے سر کو تھام کر بیٹھ گئی۔

”مجھے پتا ہے تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... پر رب کا شکر ادا کر اس نے ہمیں سرخرو کر دیا..... تو شہر چل..... وہیں تجھے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر نی کو دکھاؤں گی..... تاکہ تیری صحت بحال ہو سکے۔“

”مگر..... دادی..... مجھ سے فی الحال سروس ہوگا۔“

”تجھے ہمت کرنا پڑے گی زمین ورنہ..... ورنہ ہمارے ساتھ اس سے بھی برا ہوگا..... تو نے سنا ناں..... ملکو کیا دھمکی دے کر گیا ہے رات کو..... اور گاؤں والے..... گاؤں والے بھی ہماری مدد نہیں کریں گے۔ اوپر سے فیکے کو غائب کر دیا ہے اس نے..... فیکا کا بھائی تو ہم سے ہی پوچھنے آئے گا ناں کہ فیکا کہاں ہے۔ تب ہم کیا جواب دیں گے..... ہمارے پاس سوائے اس کے کہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں اور کوئی حل نہیں ہے.....“ دادی ہراساں نظر آ رہی تھیں۔

”ہمیشہ کے لیے.....؟“ زمین نے حیرت سے دادی کو دیکھا۔ ”یہ گھر اور ہمارے مویشی؟“

”گھر کے کاغذ تو میرے پاس ہیں، بچی رجسٹریاں ہیں، وہ میں اپنے ضروری سامان اور زیور کے ساتھ لے چلوں گی، رہ جائیں گے مویشی..... چلتے ہوئے ان کی رسیاں کھول دیں گے..... اتنا بڑا گاؤں ہے..... کوئی نہ کوئی تو انہیں رکھ ہی لے گا۔ یوں بندھے بندھے بھوکے تو نہیں مریں گے۔ بس چل جلدی سے اٹھ جا۔ اس سے پہلے پورا دن پھیلے اور لوگوں کو ہمارے جانے کا پتا چلے..... ابھی نکل لیتے ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی دادی نے لوہے کا پرانا صندوق کھولا اور زیور اور رجسٹریاں اپنے دوپٹے میں باندھنے لگیں۔

”جب سے اس منحوس نے گھر میں قدم رکھا ہے۔ تب سے نحوست اس گھر کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی..... نہ جانے میری عقل پر کیسی پٹی بندھی تھی..... کہ میں نے کچھ نہ دیکھا، کچھ نہ سوچا۔ جوان بیوہ ہو گئی..... اقبال میرا سب سے اچھا داماد تھا، کیسی ہنستی بستی گرہستی تھی..... میری شمع..... چراغ کی طرح ہر وقت روشن رہا کرتی تھی اور اب کیسی دھواں ہو گئی۔ میری شمع کو اس ڈاکٹر کی نظر کھا گئی..... ہائے جوان داماد آنا فنا مر گیا۔ اسی دن رات کو میرے ساتھ کھانا کھا کر گیا ہے اور صبح میں اطلاع

لی۔ اقبال کو ایک ہو گیا..... ہائے کیسے صبر آئے گا۔ کیسے پلیں گے۔“ چاروں بچے نانی کے ارد گرد ہی کھڑے تھے۔ ماں کی آہ و بکا پر شمع نے درد بھری کاریاں لینا شروع کر دیں۔

”بس..... بس..... چار مہینے عدت میں جتنا رونا تھا اب..... میں بھی جوانی میں ہی بیوہ ہوئی تھی۔ یہ دنیا کسی کے آنسو صاف نہیں کرتی۔ الٹا دکھ دینے آ جاتی ہے۔ بچوں کو دیکھ، اب تجھے ان کو پالنا ہے۔“ ارشاد بیگم نے لنگ کر بیٹی کو دلا سہ دیا تو شمع پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”انہیں ہی دیکھ کر تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کیسے ہوگا.....“

”ابھی تمہاری ماں زندہ ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، تیرا اور تیرے بچوں کا سب کچھ اسی طرح سے ہوگا۔ اقبال کی زندگی میں تھا۔“

”مگر..... ماما..... آخر آپ بھی کب تک کریں گے۔ پہلے ہی فرزان کی شادی کے بعد سے اس گھر کے حالات پیچیدہ ہو رہے ہیں..... آپ کو کیا پتاؤں..... اب سے میں یہاں آگئی ہوں..... روحا بھابی..... مجھے اور میرے بچوں کو کن خونی نگاہوں سے دیکھتی ہیں..... اب کیا تھا، ارشاد بیگم کی تو کھوپڑی الٹ گئی۔

”یہ گھر ارشاد بیگم کا ہے..... روحا اپنے باپ سے لڑ میں نہیں لائی تھی اور نہ ہی روحا کے خصم کی کمائی کا..... رہ گئی بات خرچے پانی کی..... وہ بھی میں اپنے دل سے ہی کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ارشاد بیگم تھوڑا سا بیٹی کی طرف جھکیں اور تقریباً سر گوشی میں کہنے لگیں۔

”کرایے میں سے تھوڑی تھوڑی رقم بچا کر چار پانچ کھروے کر رکھے تھے میں نے، وہ ضرورت مند لوگوں کو نفع رکھ کر دیتی رہتی ہوں..... معقول نفع آ جاتا ہے اس سے تم بہنوں کا اچھا برا کرتی رہتی تھی..... اب وہ صرف تیرے لیے مخصوص رہے گا۔ یہ بات تو کسی اور کو بتانا۔ یہ پیسہ بہت بری چیز ہے، نہیں ایسا نہ ہو تیری اور بہنوں کی نیت خراب ہو جائے۔“

شمع کو خاصا سکون ہوا کہ ماں نے اس کے مستقبل

کی فکر میں اچھی پلاننگ کر رکھی ہے۔

”مگر..... ماما..... یہ بہت ریکی کام ہے اگر آپ نے نفع حاصل کرنا تھا تو آپ سہولت سے کسی بینک میں بھی رکھوا کر معقول ماہانہ نفع لے سکتی تھیں..... لوگوں کی نیتیں خراب ہوتے دیر نہیں لگتی..... آپ کیسے لوگوں پر اعتبار کر لیتی ہیں۔“

”ہاں..... ریکی تو واقعی ہے۔ کئی بار رقم چھنتے چھنتے بچی ہے مگر ارشاد بیگم نام ہے میرا۔ لوگوں کی آنتوں سے نکلا لیتی ہوں پھر پیروں کی دعا بھی ہے کہ آج تک ہر نقصان سے بچی رہی ہوں، رہ گئی بات بینک کی..... یہ راستہ تو میں بھی جانتی ہوں مگر اس طرح فرزان کو پتا چل جاتا اور ظہور..... لاچکی بے غیرت..... کب چھوڑتا یہ سب کچھ..... آخر پردہ بھی تو رکھنا پڑتا ہے ناں۔ اسی لیے میں نے دامادوں پر بھی اعتبار نہیں کیا۔ بھئی صاف بات ہے پیسہ دیکھ کر تو بیٹوں کی آنکھیں چمک جاتی ہیں، داماد تو پھر پرائے ہوتے ہیں۔“

”ماما..... اقبال بہت اچھے تھے.....“ شمع کو اقبال کی محبت یاد آنے لگی۔

”بس رہنے دے..... مر گیا ناں تو تجھے اس کی قدر آ رہی ہے۔ سارا وقت تو تو یہیں بڑی رہتی تھی۔ ڈھنگ سے دو وقت کا کھانا بھی نہیں دیتی تھی اسے.....“

”بس کریں ماما..... روحا بھابی..... اپنے کمرے میں ہیں۔ سنیں گی تو ہمارے بارے میں کیا سوچیں گی۔“

”ہاں..... میں کہوں..... وہ تو جیسے بڑی سیوا کر رہی ہے اپنے خصم کی۔ کبھی پانی کا گلاس بھی اسے نہیں دیتی، کھانا بنا کر تو اسے کیا دے گی.....“

”اس کا باپ جو بھیج دیتا ہے۔ اسے کیا ضرورت ہے محنت کرنے کی۔“ شمع نے بے پروائی سے کہا تو ارشاد بیگم جل بھن کر خاک ہو گئیں۔

”بینیوں کو سسرالوں میں بٹھا کر اگر سارے ماں باپ یہی کرتوت کریں جو عماد الدین کر رہا ہے تو نہ ہی سنسار بے اور نہ ہی کوئی بیٹا بیاہ کر بہو گھر میں لائے۔ عماد الدین اس طرح کر کے کیا سمجھتا ہے اپنی دولت کا ہم پر رعب بھار رہا ہے یا ہم پر یہ جتلا رہا ہے کہ ہم ان

کے برابر کے لوگ نہیں ہیں۔ دیکھنا، ایک دن آئے گا یہ حرام کی دولت اس طرح اڑ جائے گی۔“ ارشاد بیگم نے ہتھیلی پھیلا کر پھونک ماری تو شمع چپ ہو گئی۔ سامنے سے ہی فرزان جو آ رہا تھا۔ خاموش اور فکر مند۔ ارشاد بیگم اور شمع نے واضح محسوس کیا کہ وہ پریشان ہے۔ فرزان بھانجا بھانجی سے باتیں کرنے لگا۔

”کیا بات ہے، تمہارا منہ کیوں اترا ہوا ہے.....؟“ فرزان نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ”پھر تمہاری بیگم نے کوئی گل کھلا دیا کیا..... کل گئی تھی وہ اپنے باپ کے گھر کون سا شکوفہ کھلا کر آئی ہے۔“ ”روحہ کی کوئی بات نہیں ہے ماما۔“ ”تو اس کے سوا اور کون سی بات ہے جو پریشانی کا باعث ہو سکتی ہے۔“

”سمیرا کی شادی پہ..... اس گھر کو بینک میں گروی رکھوانے کا منصوبہ آپ کا تھا نا.....؟“ فرزان نے بلا تمہید ہی بات شروع کر دی۔

”ہاں..... تو کہاں سے کرتے تم شادی۔ نام کا کاروبار لے کر بیٹھے ہو..... سب کچھ میں کرایوں سے ہی کرتی آرہی ہوں اگر شادی پر یہ گھر بینک میں رکھوا کر رقم نہ لیتے تو ہو جاتی اس قدر دھوم دھام سے شادی.....“ فرزان نے ماں کی اتر اٹھ اور کم عقلی پر پہلو بدلا۔

”ہم اپنے جاسے میں رہ کر بھی تو سمیرا کی شادی کر سکتے تھے۔“

”ہاں تو اب کون سا ہم جاسے سے باہر ہوئے، میں نے تو شمع اور صبا کی بھی اسی طرح شادیاں کی تھیں۔ اب کیا سمیرا کی شادی یونہی ہی کر دیتی تاکہ عماد الدین کی بغلیں بچ جائیں، ایک وہی سیٹھ نہیں ہے۔ اپنی بیٹیوں کو دینے کے لیے ہمارے پاس بھی جگر ہے۔“ ارشاد بیگم نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا تو فرزان کا سر جھک گیا۔

”میں آپ سے کیسے کہوں، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے پیچھے ہم لوگوں نے اس چھت کا مستقبل غیر محفوظ کر دیا ہے۔“

”کیا بات ہے، تمہاری بولتی کیوں بند ہو گئی.....؟“

”کاروباری حالات بہت خراب ہیں۔“ فرزان نے آہستہ روی سے بات شروع کی تو ارشاد بیگم درمیان میں ہی بول پڑیں۔

”ہاں..... وہ تو ہوتا ہی تھے۔ سامنے کہہ گئے ہیں اولاد شوہر سے اور رزق عورت کے طفیل چوکھٹ پر آتا ہے۔ یہ لائی تو کہاں..... رہا سہا بھی اڑا دیا۔“ فرزان پھر چپ ہو گیا۔ اپنی غلطیوں کا الزام دوسروں کے سر دھرنا اس گھر کی پرانی روش تھی اور اب مستقل مزاجی سے یہ ذمے داری رو مار پر عائد ہو رہی تھی۔

”یوں منہ لٹکا کر نہ بیٹھ، مجھے ٹھیک ٹھیک کیا چکر ہے۔“

”تین ماہ سے میں بینک کی قسط ادا کر رہا ہوں۔ بینک کا نوٹس آ گیا ہے پھر معاہدہ بھی پورا ہونے والا ہے اگر معاہدے سے قبل بینک کا سارا خرچہ سود سمیت نہ اتارا تو بینک اس پر اپنی پرقبضہ ہمارا لے گا۔“ ”ہائے..... ہائے.....“ ارشاد بیگم نے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔

”اب یہ وقت بھی دیکھنا تھا مجھے.....“ فرزان نے اس سے یہ گھر بنایا تھا..... اور اب جو صبا کے گھر پر ہونا پڑے گا۔“ فرزان بیچ میں بولنا چاہتا تھا۔ ماں کو سمجھانا چاہتا تھا مگر ارشاد بیگم کہاں موقع دیتی تھیں

”جب تمہارے باپ سے بیاہ کر آئی تھی میں تو یکے بعد دیگرے دو جائیدادیں خریدی تھیں اس نے، سب میں شور مچا دیا تھا، بھانجوان پاؤں دھو رہا ہے۔ ایک میرے گھر یہ محسوس آئی ہے جب سے اس نے میرے گھر پر قدم رکھا ہے، مصیبتیں ہی مصیبتیں، نقصان ہی نقصان..... کج بخت..... محسوس..... ڈائن ہے پوری ڈال..... نہ جانے کچھ چھوڑے گی بھی یا نہیں۔“ روحہ نے دیر سے ساری بکواس سن رہی تھی۔ آخر اس کی برداشت بھی جواب دے گئی تو کمرے سے باہر نکل آئی۔

”صرف میرے ہونے سے ہی اس گھر میں مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں تو میں چلی جاتی ہوں یہاں.....“ ”ہائے..... ہائے..... تمہیں کیوں ہمارا.....؟“ ”ہم تمہارا ذکر تو نہیں کر رہے تھے.....“ ارشاد بیگم نے

سامنے صاف کر گئیں۔

”تو اور کس کا ذکر ہو رہا ہے یہ.....؟“ روحہ بھڑک اٹھی۔ ”اچھی طرح جانتی ہوں میں۔ بات بے بات مجھے کس طرح نشانہ بنایا جاتا ہے۔ گھر تو گھر..... گھر کے سامنے سے بھی کتاب یا بلی گزر کر مر جائے تو الزام مجھی پہ آئے گا کیونکہ اس گھر میں، میں موجود جو ہوں.....“

”تمہیں زیادہ بہتر رہتا ہوگا۔ تمہاری ”مار“ کس حد تک ہے۔“ ارشاد بیگم نے پھبتی اڑائی تو روحہ ماسک گئی۔ ”اللہ کی لاشی بے آواز ہے..... جو ان بیٹی کا غم بھی ڈھلا نہیں سکا تو اور جانے کون سا پہاڑ ٹوٹے گا۔“ روحہ کے الفاظ ارشاد بیگم کے سر پر تیزاب کی طرح پڑے۔

”سن رہے ہو اس کی بکواس..... یہ تو بولتی ہی نہیں تھی..... ساری زیادتی میں ہی کہتی تھی۔ اب تم نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا اور کانوں سے بھی سن لیا..... مگر ہونا کیا ہے..... تمہیں تو جادو سے الو بنا دیا ہے اس نے۔ پورا کاٹھ کا الو..... کہاں تم حمایت کرو گے ہماری۔“

”روحہ اندر جاؤ تم۔“ فرزان نے پوری ہمت کر کے روحہ پر رعب جمایا مگر روحہ ڈٹی کھڑی رہی آخر کو عماد الدین نے ایک گھنٹہ موبائل فون پر بریف کیا تھا۔ فرزان کو ڈر تھا اگر اس نے زیادہ زبردستی کی تو روحہ سالار لحاظ بالائے طاق رکھ کر مقابلے پر اتر آئے گی اور وہ کسی طرح بھی نہیں چاہتا تھا ماں بہن کے سامنے اس کی پھوک نکلے..... ماں کو ہی کہنے لگا۔

”اس کے منہ ہی کیوں لگ رہی ہیں آپ.....!“ ”لو..... دیکھو تو بیوی کی کیسی حمایت کر رہا ہے.....“

میں منہ لگ رہی ہوں یا یہ خود کمرے سے چیل کی طرح نکل کر آئی ہے لڑنے کے لیے۔ اللہ کے فضل سے میں تو اپنے گھر میں بیٹھی ہوں..... چاہے ہم جیسی بھی بات کریں، یہ کون ہوتی ہے ہماری بات میں بولنے والی۔ بجائے بیوی کو برا کہنے کے ہمیں ہی برا کہہ رہا ہے۔“ فرزان برا پھنسا تھا، بس پھر نہیں بولا۔ ارشاد بیگم کا بٹن اب کون آف کر سکتا تھا۔

”مجھے میری جوان بیٹی کے بیوہ ہونے کا طعنہ دے

رہی ہے یہ..... ہائے..... ہائے دیکھو تو کیسا وقت آ گیا۔“ پھر ارشاد بیگم نے اپنا دوپٹا پھیلا لیا۔

”اللہ کرے..... میں تو کہتی ہوں ایسا غم سیٹھ عماد الدین پر آئے..... اللہ کرے تیرا سہاگ اجڑے۔ ہائے تجھے لگے یہ روگ..... پھر دیکھتی ہوں تیرے باپ کی دولت کام آئے گی یا تیرا گمان.....“ روحہ لڑنا بھول کر حیرانی سے ارشاد بیگم کو دیکھنے لگی۔ کتنی سہولت سے وہ بیٹے کو بغل میں بٹھا کر اسی کی موت کی بددعائیں دے رہی تھیں..... آفرین تھی اس بیٹے پر جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ ماں تھی..... یا ڈائن۔

اب روحہ کیا کہتی..... پاؤں پٹختی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی..... کچھ بھی تھا، فرزان اس کے سر کا تاج تھا۔ ابھی تو اس نے ڈھنگ سے زندگی بھی نہیں جی اور یہ عورت کس طرح بددعائیں دے رہی تھی۔ روحہ کا دل بھرا آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

باہر ارشاد بیگم نے اپنا پورا ڈراما بجا رکھا تھا۔ فرزان ماں کی دل جوئی کرتا رہا جو اصل مسئلہ تھا وہ جوں کا توں تھا۔ وہ ماں سے فنانسلی مسائل ڈسکس کرنے آیا تھا یہاں اور ہی رولا پڑ گیا تھا اور یہ تو روزمرہ کا معمول تھا۔

”شمع آیا پلیز آپ ہی ماما کو سمجھائیں، زیادہ رونے سے ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ شمع اگر سنبھلے ہوئے ذہن کی ہوتی تو یہ حالات ہی کیوں ہوتے وہ خود رونے لگی۔

”فرزان میں اور میرے بچے تم پر بوجھ ہیں..... آج روحہ نے میری بیوی کا طعنہ دیا ہے کل اخراجات کا بھی.....“

”شمع آپا پلیز..... آپ بے کاری باتیں کیوں سوچ رہی ہیں۔ میں ہوں ناں..... بچوں کو اور آپ کو کبھی اقبال بھائی کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔“ بھائی کی وارنٹی پر شمع کو جہاں ڈھارس ہوئی، ارشاد بیگم کا بھی سینہ فخر سے پھول گیا، آخر وہ فرزان پر یونہی تومان نہیں کرتی تھیں۔ دل ہی دل میں دعا کرنے لگیں خداوند فرزان کے کبھی اولاد ہی نہ ہو اگر اس کے اولاد ہوگی تو شمع کے یتیم بچوں کا کون سہارا بنے گا۔

فرزان ماں کے دل کے حالات سے بے خبران کی دل جوئی میں لگا ہوا تھا۔ رات کو وہ اپنے کمرے میں آیا تو روحا غصے سے بھری بیٹھی تھی۔

”اب بھی آنے کی ضرورت کیا تھی۔ بیٹھے رہتے ماں کے پاس۔“

”ماں ہیں وہ میری..... تم کیوں جلتی ہو۔“ وہ ٹی وی آن کرنے لگا۔ ٹی وی جیسے ہی آن ہوا، بے ہنگم شور نے ارشاد بیگم کا مزہ کرکرا کر دیا۔ اب بھلا اندرونی حالات کیسے سنائی دے سکتے تھے پھر بھی ارشاد بیگم کھڑکی کے پاس سے نہ نہیں۔ شاید لائٹ چلی جائے اور وہ اندر کا تماشا سن سکیں۔ مقولہ برحق ہے امید پر دنیا قائم ہے۔

”ماں ہیں وہ..... ایسی ہوتی ہیں ماں، بھی سنا ہے کہ ماں اپنے جوان بیٹے کو ہی کوئے دے۔“

”تو تمہیں کیا تکلیف ہے..... وہ مجھے ہی کوئے دے رہی تھیں ناں، یہ ہم ماں بیٹوں کا معاملہ.....“

”ہونہ..... روحا کے بٹنے لگ گئے۔“

”ماں نہیں ہیں وہ..... ناگن ہیں جو اپنے بچے خود کھا جاتی ہے۔“

”تمہارا باپ بھی تو..... نیولا ہے..... ہر وقت..... بیٹی کے کان میں گھسار رہا ہے۔“

”نیولا..... کیا مطلب..... تم نے میرے ڈیڈی کو نیولا کہا۔ فرزان تم نے؟“ روحا کے دماغ کی رگ پھٹنے لگی۔

”تم میری ماں کو ناگن کہہ سکتی ہو، میں تمہارے باپ کو نیولا کیوں نہیں.....“ فرزان کان میں پھریری گھمانے لگا۔ روحا کا بس نہیں چلا کہ اس پھریری کی جگہ اس کے کان میں لوہے کی سلاخ ہی ٹھونس دے ایک تو وہ اس سے محبت جتا رہی تھی الٹا وہ اسے تکلیف دینے پر آمادہ تھا اور پھر ڈیڈی کے متعلق ایسے الفاظ..... وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی..... وہ ڈیڈی کو کس منہ سے بتائے گی کہ فرزان کے ان کے بارے میں یہ خیالات ہیں۔

جبکہ ڈیڈی خود مجھے بسانے کے لیے فرزان کی کتنی خوشامدیں کرتے ہیں، بڑے سے بڑے ہوٹل میں اسے ڈنر کراتے ہیں مگر سنا تھا منہ کھائے اور آنکھ شرمائے

یہاں تو بے غیرتی کی حد سے بھی حد ہے۔

”اب بس بھی کریں ماما..... پاؤں سوچ جا کر گئے آپ کے۔ ٹی وی کے اتنے شور سے تو خود میرے سر

میں درد ہونے لگا ہے۔ نہ جانے آپ کیسے اتنی درد کھڑی ہیں۔“ ارشاد بیگم شمع کی توجہ پر کچھ جھینپ کر گئیں پھر مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

”بہت چالاک ہے یہ روحا..... ہماری باتیں تو سننے وقت کمرے کا پنکھا بھی بند کر لیتی ہے اور جب فرزان کمرے میں ہوتا ہے تو ٹی وی ہی کیا ڈیک بھی چلا لیتی ہے۔“ شمع کی رائے پر ارشاد بیگم کو کچھ حوصلہ ہوا تو کہنے لگیں۔

”کون کبخت سنا چاہتا ہے اس کی باتیں۔ مجھے تو بس یہ دھوکا پکڑی رہتی ہے نہ جانے فرزان کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہوگی۔ بچہ..... میرا ”دم“ ہو کر رہ گیا ہے۔ ذرا بھانپ نہیں نکالتا کہ دونوں کے معاملات کیسے ہیں.....“ شمع نے حیرانی سے ماں کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی۔

”حیرت کی بات ہے..... ماما..... اب بھی کچھ جانتا چاہتی ہیں جبکہ معاملہ صاف اور دو ٹوک ہے۔ فرزان ذرا اور کمرے میں جاتا ہے اور پھر تعویذوں کی کرامات سے اور پیروں کی دعا سے واپس آ جاتا ہے۔ بھی وہ ماما کے کمرے میں سوتا ہوا ہوتا ہے، کبھی ڈرائنگ روم میں اور کبھی کبھار اپنے کمرے میں بھی سو جاتا ہے۔ جس رات وہ اپنے کمرے میں سوتا ہے اس رات ماما کو فجر سے پہلے ہی انجاننا کا ایک ہو جاتا ہے اور کئی کئی دن تک پھر فرزان اپنے کمرے کا رخ نہیں کرتا۔ اتنا تو اچھا ہے فرزان جبکہ اقبال کو تو میں اپنے اشاروں پر چلائی تھی۔ کبھی ماں بہنوں کی طرف رخ موڑنے نہیں دیا۔“ شمع کا دل جی جی باتیں یاد کرنے لگا تو اس نے لاجول پڑھی اور اپنے بچوں کو سنانے کی کوشش میں لگ گئی۔



”کیا بات ہے آج کل میں دیکھ رہا ہوں تم ایگزمر کی تیاری میں اتنے پرجوش نہیں ہو جتنے پہلے ہوا کرتے

تھے۔“ رضوان نے علی زمان کے کاندھے پر تھپکی مارتے ہوئے کہا تو علی زمان چونک سا گیا۔

”نہیں..... ایسا تو کچھ نہیں ہے۔“

”خیر ہے، دھیان کہیں اور ہی لگ رہا ہے تمہارا.....“

”نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے.....“ علی زمان نے بے دلی سے کہا تو رضوان اس کے قریب گھاس پر ہی پسر گیا۔

”پہلے تو ہر وقت تمہارے ہاتھ میں کتاب ہوا کرتی تھی۔ اب تو کتاب ہی نہیں دھیان بھی تمہارے پاس نہیں لگتا۔“

”خیر ہے یار..... ہو جائیں گے پاس۔“ علی زمان کے لفظوں نے رضوان کو چونکا دیا۔

”صرف پاس..... کہاں تو تم پوزیشن کے لیے دعائیں منگواتے پھرتے تھے..... اور اب صرف پاس پر ہی اکتفا کر لیا۔“

”ہیں ناں..... اب بھی بہت دعائیں ہیں..... درویش بابا کی دعا سے ہو جائے گی مراد پوری.....“ علی زمان کے لفظوں نے رضوان کو سرتاپا جھنجھوڑ ڈالا۔

”کیسی بات کر رہے ہو یا رحم..... بہت مختلف اور جینئس انسان تھے تم تو..... یہ کہاں پھنستے جا رہے ہو.....؟“

علی زمان نے یک دم پہلو بدل لیا۔ غیر ارادی طور پر الفاظ اس کے منہ سے نکل چکے تھے۔

”یہ دلدل ہے اور دلدل میں کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ انسان تیر نہیں سکتا، ٹھنسن جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے۔“ علی زمان کو اس کی نصیحت بے کار لگ رہی تھی مگر وہ منہ سے کہنا نہیں چاہتا تھا کہ تم چپ ہو جاؤ۔

”کچھ دن سے میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری ایکٹیو وٹیز پراسراری ہوتی جا رہی ہیں خصوصاً جب سے تم گاؤں سے ہو کر آئے ہو..... گاؤں میں سب ٹھیک تو تھا ناں.....؟“

”ہاں..... سب ٹھیک ہے وہاں۔“ علی زمان نے روکھا سا جواب دیا تو رضوان کو چپ ہونا پڑا پھر وہ تھوڑی

ہی دیر میں اس کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ علی زمان کو بے چینی نے آن گھیرا۔

وہ کیسے رضوان کو بتاتا کہ آج کل وہ کس پریشانی میں مبتلا ہے۔ کون سی چیز ہے جو اسے راتوں کو سونے نہیں دیتی۔ اس کے دل اور ضمیر پر روز بروز بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور اس بوجھ نے اس کا چین سکون سب کچھ برباد کر دیا تھا، عجیب حالت ہو گئی تھی اس کی..... اپنی سوچوں پر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ دن رات الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہتا تھا پھر بھی اس احساس کو دبا نہیں پاتا تھا جو اسے دن رات کچھ کے مارتا رہتا تھا اور وہ احساس تھا چوری کا۔

بچپن میں بھی جس نے کبھی چوری نہیں کی تھی۔ اب باشعور اور ذمے دار ہو کر اس نے تیسری بار چوری کی تھی اور اب کی بار وہ ماں کی جڑی جمع رقم چرا کر لایا تھا۔ نہ جانے ماں نے پیٹ کاٹ کر پتھر باندھ کر دس ہزار کس ضرورت کے لیے اکٹھا کر رکھے تھے مگر ماں سے زیادہ تو اس کی ضرورت بڑی تھی۔ درویش بابا نے دس ہزار روپے لانے کو کہا تھا اور ساتھ یہ بھی کہ یہ آخری نذرانہ ہے۔ اس کے بعد اسے کبھی نذرانہ دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور وہ ہمیشہ اپنا کام یونہی کرتا رہے گا۔

اس نے وہ دس ہزار درویش بابا کو دے دیے تھے۔ درویش بابا نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ اب زندگی میں اسے عروج اور دولت ہی ملے گی۔ کامیابی اس کے پیچھے پیچھے ہوگی، وہ کتنا خوش اور مطمئن ہوا تھا مگر یہ خوشی لمبائی تھی، رہ رہ کر اسے بے بے کا خیال آ رہا تھا۔ ماں جسے وہ بے بے کہتا تھا۔ اس پر اندھا اعتماد کرنی تھی، اس بار وہ گھر گیا تو بے بے نے رو رو کر آسہ کی بالیوں کا ذکر کیا۔ سونے کی بالیاں اتنی قیمتی بھی نہیں تھیں مگر آسہ سونے اس غم کو سینے سے لگا لیا تھا۔ ابھی یہ غم سوا بھی نہ ہوا تھا کہ بابو (ابا) کی انگلی چوری ہو گئی حالانکہ وہ بھی اتنی قیمتی نہیں تھی پر بابو جو پہلے سے ہی دے اور ٹی بی کا مریض تھا، کھاٹ سے لگ گیا تھا۔ جس گھر میں ایک وقت چولہا جلتا تھا اور دوسرے وقت فاقہ ہوتا تھا، وہاں یہ نقصان معمولی نہیں تھا۔ اس کے باوجود بے بے نے آسہ کی

شادی کے لیے رقم جمع کر لی تھی اور یہ رقم بے بہت سالوں سے جمع کرنی آرہی تھی۔ روزانہ وہ دیکھتا تھا بے رات کو کالا سا صندوق کھولتی ہے اور اس میں ایک گہرے ہرے رنگ کے کپڑے میں پیسے گن کر باندھ دیتی ہے، بے بہت کا یہ عمل وہ بچپن سے دیکھتا آرہا تھا۔ بے بہت اس پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ تبھی تو اس سے بھی کچھ چھپایا نہیں مگر بے بہت کو کیا پتا تھا جس پر وہ اعتماد کرتی ہے وہی نقب لگائے گا۔

یہ گھٹ اسے دن رات بے چین کر رہی تھی۔ نہ جانے بے بہت کا کیا حال ہوگا اور آسو..... خدا نہ کرے کہ اس کی خوشیوں میں کوئی چیز رکاوٹ بنے۔ میں کروں گا آسو کی شادی..... بابو کا علاج بھی کراؤں گا میں..... اور بے بہت..... بے بہت کو بہت ساری خوشیاں دوں گا..... مگر یہ وقت کب آئے گا؟ اس نے اچاٹ ہو کر اپنے سامنے بکھری کتابوں کو یوں دیکھا اب جن کی شکل بھی دیکھنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

”اگر میں یہ سب باتیں اپنے دوستوں کو بتا دوں تو وہ مجھے کتنی حقیر لگا ہوں سے دیکھیں گے۔ وہ سب جو مجھ پر اعتماد کرتے ہیں، میرے روم میٹ اپنا سب کچھ میرے حوالے کر کے عیاشیاں کرنے چلے جاتے ہیں..... پھر بھی وہ مجھ پر اعتماد کر سکیں گے۔ بھاڑ میں جائے ان کا اعتماد۔ میں نے کسی کے اعتماد سے کچھ لینا بھی نہیں ہے۔ بس کسی طرح..... میرا ایک کروڑ کا انعام لگ جائے..... پھر.....“

اچانک اس کی نگاہ رک گئی۔ رضوان اپنا موبائل فون اس کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔

”شاید..... وہ بھول گیا ہے۔“ علی زمان نے موبائل ہاتھ میں اٹھا لیا پھر الٹ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ ”رضوان کہتا ہے میں ہزار کا موبائل ہے یہ.....!“

”میں اس موبائل کو بیچ کر اس سارے نقصان کی تلافی کر سکتا ہوں“ آج تک جو میں نے کیا ہے رضوان کا کیا ہے وہ تو اور بھی ایسے کئی موبائل خرید سکتا ہے۔ اس

کا باپ بڑا افسر جو ہے۔“

بے ایمانی بھی کیا چیز ہے نیت میں آتے ہی ارادہ بن گئی۔ ارادہ بھی ایسا جو ایک دم اٹل ہو۔ اس نے وہ موبائل آف کر کے اپنی پتلون کی اندرونی جیب میں رکھ لیا اور وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا خیال تھا تھوڑی ہی دیر میں رضوان کو موبائل کی ضرورت محسوس ہوگی اور وہ یہیں ڈھونڈنے آئے گا اگر وہ اٹھ کر ادھر ادھر ہوا تو رضوان کو اس پر شک ہو سکتا ہے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ رضوان عجلت میں اس کی طرف آرہا تھا۔ ”یار میں یہاں اپنا موبائل تو نہیں چھوڑ گیا ہوں۔“

”آں..... ہاں کیا کہا تم نے..... موبائل۔ میں نے تو نہیں دیکھا..... پھر بھی دیکھ لو.....“ علی زمان یک دم کھڑا ہو کر اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اس کا انجان بننا قابل ستائش تھا۔

”پتا نہیں کہاں چھوڑ دیا میں نے..... شاید..... میں واش روم گیا تھا۔ وہیں بھول آیا ہوں۔“ رضوان ایک سیکنڈ بھی وہاں نہ رکا اور خود کلائی کے سے انداز میں کچھ ہونے وہاں سے چلا گیا۔ علی زمان کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا اب اس بات کا تو پکا یقین تھا کہ رضوان تو کیا کوئی بھی اس پر شک نہیں کر سکتا تھا۔

”مگر..... میں اس موبائل کو لے کر کمرے میں کیسے جاؤں گا، کمرے میں، میں زیادہ دیر رضوان سے چھپا نہیں سکتا۔“ اسے پھر سے پریشانی نے آن گھیرا تھا۔ دل میں ہول اٹھنے لگے تھے اگر بھولے سے بھی رضوان کو اس پر شک ہو گیا تو وہ نہ صرف ایک اچھے دوست کو کھو دے گا بلکہ ذلیل و رسوا بھی ہوگا، فوری طور پر علی زمان کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

”یہ موبائل کسی کے پاس رکھوا دیتا ہوں۔“ سبھی کلاس فیلوز سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ پڑھا کو ہونے کی وجہ سے ہر لڑکا اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا تھا، کوئی نوٹس مانگ لیتا تو کوئی پچھر مس ہونے پر اس سے سمجھنے چلا آتا۔ وہ ہر ایک کی خندہ پیشانی سے مدد کر دیتا تھا پھر آج ان میں سے کوئی بھی اس کی مدد کو کیسے

انکار کر سکتے تھے لیکن اعتماد کرنا سب سے بڑا رسک تھا اور اسے یہ رسک ہر صورت میں لینا پڑا۔ شاہد اور اکرم سے اس کی ٹھیک ٹھاک بنتی تھی اور رضوان سے ان لوگوں کی اکثر لگی رہتی تھی۔ اس کا خیال تھا شاہد اور اکرم اس کے لیے سب سے بہتر رہیں گے..... اس کے بعد..... فون کو مارکیٹ میں سیل کرانے کا معاملہ بھی وہ انہی سے طے کرے گا وہ جانتا تھا اس کام کا وہ لوگ کمیشن رکھیں گے اور یہ تو بہر حال لازمی تھا سو اس بھروسے اور اعتماد کے تحت وہ اکرم اور شاہد سے ملنے چلا گیا۔



”جوان بچی بیوہ ہو گئی اور تم نے ہمیں اطلاع بھی نہ دی.....“ دادی نے ارشاد بیگم سے شکوہ کیا تو ارشاد بیگم جو اچانک ساس کے آنے پر بدحواس ہو گئی تھیں تنگ کر رہ گئیں۔

”ایسا تعلق تو تمہارے بیٹے نے رہنے ہی نہیں دیا تو میں کیا بھاتی۔“ بہو کی بات پہ دادی نے ہنکارا بھرا اور لہجے میں پچھتاوا بھر کر بولیں۔

”وہ نیک بخت چاہی کتنے دن تھا بھری جوانی میں چلا گیا تھا۔ اس کے چہلم کے بعد اس گھر سے گئی تھی میں اور آج انیس برس کے بعد آئی ہوں ماشا اللہ سبھی بچے بیاہ دیے تم نے اور ایک بار بھی مجھے بلانا گوارا نہیں کیا۔“ ”بس کیا بلا کر گیتی..... مجھے تو زمین داریوں نے اوسان ہی آنے نہیں دے۔ بھری جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد..... تنہا عورت کا جس طرح گزارہ ہوتا ہے کوئی نہیں جانتا۔“ ارشاد بیگم نے نسوے بہانے شروع کیے تو دادی کو مفاہمت کرنا پڑی۔

”اللہ تعالیٰ تمہیں اس چیز کا بہت اجر دے گا۔ بچے لائق اٹھ جائیں یہی سب سے بڑا اجر ہے۔ پوتا پوتوں سے تو مل لی اب ذرا بہوؤں سے بھی تو ملو او..... اور غیور احمد نہیں آیا..... مجھے تو اچھی طرح سے غیور احمد ہی یاد ہے بھاگ بھاگ کر کام کرتا تھا میرے۔“ ارشاد کا منہ کڑوا ہو گیا۔

”غیور کو اس کی بیوی ہی نے کر بھاگ گئی تھی..... اس لیے میں نے اس سے قطع تعلق کر رکھا ہے دس سال

سے البتہ فرزان میاں کی بیوی آئے دن میکے پہنچی ہوتی ہے..... آجائے گی کل تک مل لیجے گا۔“ دادی حیرانی سے ارشاد بیگم کو دیکھنے لگیں۔

”غیور کی بیوی غیور کو لے کر بھاگ گئی۔ کہاں سے بیاہ کر لائی تھیں اسے تم.....؟ ساس کے سوال پہ ارشاد بیگم نے ماتھے پہ ہتھیلی ماری۔

”تقدیر کی مار تھی اور کیا تھا.....“

”دوسری تو ٹھیک ہے ناں.....؟“

”اس سے بھی چار ہاتھ آگے ہے..... کن سوالوں میں پڑ گئیں آپ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، کھانا کھالیں اور یہ بتائیں پوتی کا کہیں کچھ سوچا..... یا.....“ دادی نے سر جھکائے بیٹھی زمین کی طرف بے ساختہ دیکھا پھر ضبط کر کے کہنے لگیں۔

”ابھی اس کی شادی نہیں کی..... شہر اسی لیے آئی ہوں..... یہاں کوئی اچھا سا رشتہ مل جائے تو اسے بیاہ دوں۔“

”میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی آپ کی مدد کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔“ ارشاد بیگم کو یا ساس پہ طنز کر رہی تھیں دادی نے برا نہیں منایا۔

”گاؤں میں اچھے رشتے نہیں ہیں.....“

”اور شہر میں بیاہ دیں گی تو گزارہ نہیں کر سکے گی، دیہاتی اور شہری ماحول میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ ارشاد بیگم کا طنز برابر جاری تھا شاید وہ زمین کے حسن سے جلن محسوس کر رہی تھیں اس کے حسن میں انہیں اپنی سوکن نظر آرہی تھی۔ جس کو مرے ہوئے بھی عرصہ گزر گیا تھا۔

”تو پھر کیا ہوا ماما..... دادی کی سوچ کچھ بری بھی نہیں..... زمین کچھ عرصہ ہمارے یہاں رک جائے گی۔“ شمع کی تجویز ارشاد بیگم کو سخت بری لگی اور وہ دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے سوچنے لگی۔

”ہاں میں نے تو یہاں ایدھی ویلفیئر کھول رکھا ہے تم اور تمہارے بچے کیا کم بوجھ تھے مجھ پر جو یہ دادی پوتی بھی چلی آئیں۔ بڑھیا تو سوال کر کر کے میرا جینا حرام کر دے گی۔ گھریلو معاملات میں مداخلت کرے گی علیحدہ اچھی بھلی پرسکون زندگی پر نہ جانے آفتیں نازل ہو رہی

گئی۔

”بڑی رہتیں کچھ دیر اور کیوں اٹھ گئیں اتنی جلدی طبیعت تو تمہاری ویسے ہی خراب ہے۔“ دادی نے قرآن کو بند کرتے ہوئے جزدان اس پر چڑھایا تو زہین بے دلی سے بولی۔

”نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ ساری رات جاگ کر ہی گزاری۔ بار بار تو یہاں لائٹ جاتی ہے نہ جانے یہ لوگ کس طرح کمروں میں بند ہو کر سوتے ہیں۔“ دادی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور پھر معدوم ہو گئی۔

”منہ ہاتھ دھو لو..... میں تمہارے بال باندھ دیتی ہوں.....“ زہین بے دلی سے اٹھ کر منہ دھونے چلی گئی۔ دادی نے زہین کے بال باندھے پھر اسے کپڑے بدلنے کا کہہ کر خود چٹپٹا کر لگیں۔

”ٹھیک تو ہیں میرے کپڑے بس میں نہیں بدل رہی۔“ زہین تسال سے دادی کے قریب بیٹھ گئی دھوپ پوری پھیل گئی تھی۔ جوس کے خالی ڈبوں اور ریپروں پہ ٹھیکیاں بھٹکنے لگی تھیں زہین کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو وہ کب کا یہ سب کچھ صاف کر دیتی مگر مجبوری تھی اسی گند میں بیٹھنا پڑ رہا تھا۔ بچوں کی جوتیاں خالی برتن گلاس چھپیاں ساری رات بکھری پڑی رہی تھیں۔ اب بھی اگر لائٹ نہ ہوتی تو شاید یہ لوگ سو کر نہ اٹھتے..... ارشاد بیگم بکھرے بالوں سے بنا دوپٹے کے جھانپاں لیتے ہوئے باہر آئیں تو ساس کو دیکھ کر شرمندہ سی ہو گئیں۔

”آپ لوگوں کو تو صبح سویرے اٹھنے کی عادت ہوگی مگر یہاں تو دن بارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھتا.....“ وہ بنا بنا کر دھونے ہی صوفے پر لٹٹی پالٹی مار کر بیٹھ گئی تھیں زہین کو وہ دن کے اجالے میں..... بے حد بد صورت دکھائی دے رہی تھیں چھوٹا قد، گہرا سونو لارنگ اور اوپر سے موٹا پا اور موٹے نقوش۔

”کیا نظر آیا تھا میرے باپ کو اس عورت میں.....؟“ زہین نے ایک پل کو سوچا پھر اس کی توجہ شمع کے بچوں پر پڑ گئی جو روتے بھٹکتے کمرے سے نمودار ہو رہے تھے اور جنہیں ساری رات شمع فیڈر ٹھونس ٹھونس کر سلاتی رہی تھی۔ شمع بھی بنا دوپٹے کے بکھرے بالوں

میں بجت چپ ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔“

صبا اور سمیرا کی بھی محبت شمع سے کم دکھائی نہیں دے دی تھی شام تک وہ دادی کو گھیرے میں لیے بیٹھی رہیں۔ حیرت کی بات تھی غیور جو گھر میں نہیں نکلتا تھا وہ بھی دادی سے گاؤں کے بارے میں جاننے کے لیے مشتاق نظر آ رہا تھا۔

”تم بہت کم بولتی ہو زہین، لگ ہی نہیں رہا کہ تم گاؤں سے آئی ہو..... اتنی اسارٹ اور خوب صورت جبکہ یہاں شہری لوگوں کو دیکھو..... جلے ہوئے رنگ اور موٹاپے کی طرف مائل وجود..... کیا کھاتی پیتی ہو تم..... تمہاری خوب صورتی کا کچھ تو راز ہوگا۔“

زہین تو ظہور کے سوالوں پہ بالکل نروس ہو گئی..... جب کہ ظہور کی بہنیں اور ماں کا ظہور کی باتوں پر جل جل کر برا حال ہو رہا تھا۔ دادی ہنسنے لگیں۔

”بھائی ہے تمہارا..... اور تم سے چھوٹا بھی ہے باتیں کرو تا تم اپنے بہن بھائیوں سے.....“ سب کو متوجہ پا کر دادی کے اصرار پر زہین نے گاہے بہ گاہے بس مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

رات گئے تک فرزبان بھی ان لوگوں کے درمیان بیٹھا رہا۔ پھر دادی عشا کی نماز کے لیے اٹھ گئیں وہ زہین سے باتیں کرتے رہے آہستہ آہستہ زہین کو ان کی باتوں اور چھیڑ چھاڑ میں مزہ آنے لگا اور اپنے پن کا احساس ہونے لگا۔ نہ جانے شب کا کون سا پہر تھا جب وہ لوگ سوئے، سمیرا اور صبا اپنے بچوں کو لے کر چلی گئی تھیں۔ صبح دادی نماز کے لیے اٹھیں تو انہیں گاؤں کی بہت یاد آئی اپنا بڑا سا کچا کچا محن اور اس کے وسط میں لگا نیم اور اس میں چڑیوں کی چھپا ہٹ کتنی رونق ہوتی تھی..... یہاں کتنی ٹھن اور بے سکونی کا احساس تھا۔ فرش پڑے جا بجا جوس کے خالی ڈبے، پاڑے اور نمکو کے خالی ریپر کتنے برے لگ رہے تھے۔ زہین کو تو صبح نماز کے بعد اٹھ کر صفائی کرنے کی عادت تھی یہاں صفائی تو کون کرتا نماز ہی کسی نے نہیں پڑھی تھی حتیٰ کہ ارشاد بیگم بھی پڑی سو رہی تھیں۔ دادی قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگیں زہین چپ چاپ آ کر دادی کے قریب بیٹھ

سے کچن کی طرف جا رہی تھی دادی کو بہت برا لگا اس نے اٹھنے کے بعد ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے اور بغیر دھوئے فیڈروں میں بچوں کو دودھ ڈال ڈال کر دے رہی تھی بچے دودھ منہ سے لگا کر چپ ہو گئے تھے شمع بھی آ کر صوفے پر پڑ گئی تھی یعنی ابھی دو گھنٹے مزید سستانے کا پروگرام تھا جب کہ دادی تو صبح ہی صبح آنو لے کا مربع اور ایک گلاس دودھ کا پی لیا کرتی تھیں مگر اب دادی کا کلیجہ بھوک کی وجہ سے منہ کو آ رہا تھا اور یہاں کسی کو احساس نہیں تھا۔

ظہور سو کر اٹھا تو حلوہ پوری لے آیا۔ ساتھ ہی لسی بھی بٹولا لیا تھا..... اور بڑے مزے سے جتنا دیا تھا کہ اسٹیل دادی اور زہین کے لیے بٹولا کر لایا ہے..... دادی حلوہ پوری تو کھاتی نہیں تھیں ایک گلاس لسی کا پی لیا۔ انتہائی ٹھنی اور بد مزہ لسی دادی کو سخت ابا کی سی آئی اور وہ کہے بتا رہ نہ سکیں۔

”تم دہی لے آتے تو میں تمہیں اس سے اچھی لسی بنا کر پلاتی..... یہ بھی کوئی لسی ہے میرا تو گلاس بند ہو گیا۔“

”یہاں تو ایسے ہی لوازمات ہوتے ہیں، یہ گاؤں تھوڑی ہے جو ہر چیز خالص مل جائے گی۔“ ظہور نے دادی کا حوصلہ بڑھایا تو ارشاد بیگم کا صبح صبح موٹا آف ہو گیا۔

”تم جا کر فرزبان کو اٹھاؤ آخروہ کب تک سوتا رہے گا۔ سب ناشتا کر رہے ہیں۔ وہ بھی ساتھ میں آ کر کمرے لے گا۔“

”ماما..... آج فرزبان تو آفس نہیں جائے گا آپ نے سنا نہیں، گورنمنٹ نے پیڑول مہنگا کر دیا ہے عوام سڑکوں پر نکل آئی ہے کئی پیڑول پمپ جلا دیے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں کہاں کھل رہے ہیں پیڑول پمپ جب تک مستقل عوام ٹھنڈی نہیں ہو جاتی ہماری تو چھٹیاں ہی چھٹیاں ہیں.....“

”اور آخر کتنے دن رہے گا یہ سب کچھ آئے دن تمہارے تو یہی ڈرامے ہیں میرے کرایوں کا آسرا نہ ہو تو بھوکے مر رہے ہوتے تم لوگ.....!“ ارشاد بیگم نے

غصے میں جتایا تو ظہور ہنسنے لگا۔

”یہ تو پوری قوم کا معاملہ ہے۔ فقط آپ کے گھر کی تو بات نہیں اور وہ جو کرایے آرہے ہیں وہ ابو کی ہی تو خریدی ہوئی پراپرٹیاں تھیں جن سے ہم لوگ فیض اٹھا رہے ہیں آخر ابو نے ہمارے لیے ہی تو وسیلہ چھوڑا ہے۔“ ظہور کے منہ پھٹ ہونے پر ارشاد بیگم پہلے ہی شاکی رہتی تھیں..... اوپر سے ساس کے سامنے ایسی باتیں ارشاد بیگم کا دماغ بھنا گیا۔

”اچھا..... جاؤ یہاں سے ماسی آگئی ہے..... وہ صفائی کرے گی.....“ ماسی کے ساتھ ایک عورت اور بھی آتی تھی۔ ارشاد بیگم اس سے پر تپاک ہو کر ملیں پھر اسے ڈرائنگ روم میں لے گئیں سوائے شمع کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ عورت کس سلسلے میں یہاں آتی ہے۔ پھر دن بھر دادی نے ایسی ہی چہل پہل دیکھی دادی تو یہی سمجھتی رہی تھیں کہ بھوکا اخلاق اور حسن سلوک اچھا ہے سبھی تو ہمسایاں اس کے گھر کے چکر کاٹی رہتی ہیں مگر دادی کو کیا پتا تھا یہ تو وہ ضرورت مند عورتیں ہیں جو ارشاد بیگم سے سود پہ رقم لے جاتی ہیں۔ منافع کا یہ دھندا ارشاد بیگم نے کب سے کھول رکھا تھا کوئی نہیں جانتا تھا البتہ اس نفع سے ارشاد بیگم نے اچھی خاصی رقم جمع کر لی تھی اور وہ جان پہچان والیوں کو ہی رقم دیا کرتی تھی یا اکثر کسی کی ضمانت پر..... اسی وجہ سے ارشاد بیگم کے گھر میں خواتین کی چہل پہل رہا کرتی تھی۔

رات کو روکا گھر میں آئی تو اس نے دادی اور زہین کو دیکھ کر ہرگز اچھنبے کا اظہار نہیں کیا بلکہ بڑھ کر سلام کیا۔

”یہ ضرور فرزبان نے پٹی پڑھائی ہوگی ورنہ..... یہ عورت..... اور میرے گھر میں کسی کو سلام کرے..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....“

”بھو تو بہت پیاری ہے تمہاری.....!“ دادی روکا کو دیکھ کر سمجھ گئی تھیں ارشاد بیگم کا منہ بگڑ گیا روکا لمحہ بھر کو رکی اور حسب معمول اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”خیر سے کتنے برس ہو گئے فرزبان کی شادی کو.....؟“

”چوتھا سال لگ رہا ہے.....“ ارشاد بیگم کے

جا لگیں گی۔“

”ایسا کون سا ایٹم بم ہے چہرے پاس جس سے میں چھت پہ لگ جاؤں گی؟“ ارشاد بیگم نے ٹھٹھول کیا۔

”بڑی خوش فہمی ہے آپ کو..... کہ آپ کا بیٹا دو بار باپ بننے بننے رہ گیا۔ مجھ سے سنیں..... میں تو آج تک یہاں اسی طرح رہ رہی ہوں..... جیسے باپ کی چھت کے نیچے ہی آپ لوگوں کی عزت کی خاطر..... حقیقت تو یہ ہے کہ آپ اپنے باپ کی عزت کی خاطر..... سنا آپ نے.....“ روحا کے الفاظ واقعی ایٹم بم کی طرح ارشاد بیگم کے سر پر گرے تھے۔ دادی کا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا یہاں تک کہ فرزان جو ابھی ابھی اندر داخل ہوا تھا واضح طور پر اس نے بھی اپنے متعلق روحا کی رائے سن لی تھی مارے ہنک اور شرمندگی کے اس سے آگے قدم اٹھائے ہی نہیں گئے۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو دلہن تم.....؟“ دادی ہمت کر کے بولیں تو روحا نے سلکتی نگاہوں سے ساس کی طرف دیکھا۔

”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ کوئی بھی بیوی اپنے شوہر پر بے وجہ الزام نہیں لگا سکتی۔ میں نے فرزان کے ساتھ شادی گھر بسانے کے لیے کی تھی..... میں چار سال سے ان ہنک آمیز رویوں کا سامنا کر رہی ہوں..... ورنہ کون سی کسر باقی ہے میرے اجڑنے اور ان کے اجڑنے میں صرف اپنے باپ کی عزت کا خیال ہے مجھے..... ورنہ نکلے کیا ہیں یہ لوگ میرے..... اور کان کھول کر سن لیں آج کے بعد میری ذات پر کوئی تہمت لگائی گئی تو میں..... برداشت نہیں کروں گی پوری دنیا کے سامنے آپ کے بیٹے کا پول کھول دوں گی مجھیں.....“ روحا نے کہا اس کے بعد کسی کے تاثرات نہیں دیکھے اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

”آخر حد ہوتی ہے برداشت کی بھی..... میں آخر کیوں برداشت کروں یا تو میرے شوہر نے مجھے عیش کرا رکھے ہوں، من چاہا کھانے پینے کو دیتا ہو سیر سپاٹوں کے لیے لے جاتا ہو میرے ناز خروے اٹھاتا ہو تو میں ان

بجائے شمع نے جواب دیا۔

”کوئی بال بچہ نہیں ہوا.....؟“ دادی کو حیرت ہوئی۔ شمع اور ارشاد بیگم چپ رہیں معلوم جو تھا نہیں کے بعد لامتناہی سوالات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا دادی انہیں خاموش پا کر خود ہی بھانپ لگیں..... اور گہری سانس کھینچ کر کہنے لگیں۔

”کسی ڈاکٹر وغیرہ کو دکھالیا ہوتا۔“

”وہ کس سلسلے میں.....؟“ ارشاد بیگم کی بے پروائی نے دادی کو بھونچکا کر دیا۔

”یہی علاج وغیرہ کے سلسلے میں.....!“

”علاج کی ضرورت تو تب آئے..... ناں جب بیگم صاحبہ بچہ پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ وہ تو سرے سے بچہ ہی پیدا نہیں کرنا چاہتی۔“ ارشاد بیگم کی آواز اتنی اونچی تھی کہ روحا اپنے کمرے میں بہ آسانی سن سکتی تھی۔ اپنے متعلق ایسی معلومات پہ روحا، دادی سے زیادہ بھونچکا ہوئی۔

”بچہ پیدا کیوں نہیں کرنا چاہتی..... اور کیا فرزان بھی ایسا ہی چاہتا ہے۔“ دادی کی حیرت بجا تھی۔

”اللہ بہتر جانے کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان کیا طے ہوا ہے بھی تو چار سال نکل گئے۔“ ارشاد بیگم کی تہمت پر روحا کی آنکھیں باہر کواٹل پڑیں۔

”تو کیا وہ اتنی مانتا ہے بیوی کی.....؟“ دادی نے پھر سوال کیا۔

”پورا زن مرید ہے..... جب جو حکم کرتی ہے فوراً پورا کرتا ہے۔“ دادی نے حیرت سے منہ میں انگلی لے لی۔

”تو تم نے سمجھایا نہیں بہو کو..... بیٹے کو.....“

”کیسے سمجھاؤں..... دوبار حمل ٹھہرا تھا باپ کے گھر جاتی ہے ختم کرا آتی ہے، بیٹے کو ہر دم دباتی رہتی ہوں ورنہ کون مرد ایسی اتنی بڑی زیادتی برداشت کر سکتا ہے۔“ روحا کی برداشت اس الزام پہ جواب دے گئی تو وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

”الزام وہ لگائیں جس کا کوئی سر پیر ہو..... سچ اگر میرے منہ سے نکل گیا تو اس جگہ نہیں ہوں گی چھت سے

لوگوں کی کڑوی کسلی سن بھی لوں جب میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے تو میں بھی قربانی نہیں دوں گی، معاملات بگڑتے ہیں تو بگڑ جائیں۔ میرے صبر اور خاموشی سے اب تک کون سا معاملہ درست ہوا ہے۔ ڈیڈی بستر سے لگ گئے میرے غم نے انہیں آدھا کر دیا اگر انہیں کچھ ہو گیا تو کیا میں ان لوگوں کے ساتھ رہ پاؤں گی ہرگز نہیں..... مجھے ڈیڈی کی زندگی، ڈیڈی کی محبت، ڈیڈی کے سہارے کی سخت ضرورت ہے..... میں انہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی کچھ نہیں..... آج میں نے جو کچھ کیا ہے بالکل ٹھیک کیا ہے..... ان لوگوں کے حاوی ہونے میں کوئی کسر نہیں رہی ہے۔ ڈیڈی صحیح کہتے ہیں میں جب تک انہیں منہ توڑ کر جواب نہیں دوں گی یہ مجھ پر یونہی حاوی ہوتے چلے جائیں گے۔“ روحا اپنی ذات کو دل ہی دل میں مضبوط کر رہی تھی۔



غم و غصے سے فرزان کی بری حالت تھی وہ گھر سے اگلے قدموں باہر نکل گیا تھا۔ روحا نے جوابات کہی تھی وہ معمولی نہیں تھی..... ایک بل میں اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں..... اسے روحا کو اس الزام کا منہ توڑ جواب دینا آتا تھا اور وہ اس کا جواب ضرور دے گا۔

”مگر یہاں تک نوبت ہی کیوں آئی.....؟“ اس کے اندر سے کوئی ٹپس رہا تھا۔ ”صرف ماما کی وجہ سے.....“

”نہیں صرف پیسے کی وجہ سے.....“

”پیسہ بھی تو ماما کا ہی ہے۔“

”کون سا پیسہ ماما کا۔“ فنانشلی طور پر آج میں جو اس قدر کھوکھلا ہو رہا ہوں کس کی پالیسیوں کی وجہ سے..... صرف اور صرف ماما کی پالیسیوں کی وجہ سے..... بینک کا تقاضا بڑھتا جا رہا ہے..... اگر فوری طور پر قسط ادا نہ کی تو بینک دوکان یا مکان میں سے کسی ایک پر قبضہ کر لے گا..... تب عزت خاک میں مل جائے گی۔ آج روحا سے تعلقات اچھے ہوتے تو روحا کے باپ سے فنانشلی سپورٹ لینے میں کس قدر آسانی ہوتی..... اور شاید تب پیسہ کمانا مشکل نہ ہوتا مگر آج میں روحا کو کس منہ سے اپنے

حالات سناؤں..... ماما نے تو روحا کو ہی منحوس گردان دیا..... اس مصیبت کی ذمے دار روحا ہے۔

”اگر کچھ ایسا دیا ہو گیا..... تو ماما، روحا کو گھر سے نکال دیں گی۔ روحا کی نظروں میں پہلے میں ذلیل و خوار ہو چکا ہوں، نہ مجھے بیوی ملی اور نہ پیسہ یہ کسی زندگی گزار رہا ہوں میں..... اور کس کے لیے گزار رہا ہوں اپنی زندگی.....“ رات کے ایک بجے فرزان نے واپس گھر کا رخ کیا تھا۔



”عجیب سے لوگ ہیں یہ..... مجھے تو یہاں بہت ٹھٹھن ہو رہی ہے دادی..... کیا شہر میں ان لوگوں کے علاوہ ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا.....؟“ زمین نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں دادی سے کہا تو وہ گہری سوچ سے چونک سی گئیں۔

”کس چیز سے ٹھٹھن ہو رہی ہے تجھے.....؟“ دادی نے زمین کی طرف دیکھا۔

”ہر وقت لڑائی جھگڑے سے..... صبح سنا نہیں آپ نے کس طرح ارشاد بیگم نے اپنی بہو کو کھری کھری سنائی ہیں۔“

”بہو کون سا کم ہے..... وہ بھی چوٹ پہ چوٹ سناتی ہے.....“ دادی نے بے توجہگی سے کہا پھر زمین کی طرف تنہائی انداز میں دیکھ کر کہنے لگیں۔

”وہ ارشاد بیگم نہیں ہے تمہاری ماں ہے۔“

”پتا ہے.....“ زمین ازلی بے پروائی سے بولی۔

”میرا یہاں دل نہیں لگ رہا..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔“ زمین کے بچکانا پن پہ دادی کو غصہ آ گیا۔ زمین کی نظریں جھک گئیں۔

”ہم یہاں دل لگانے نہیں آئے ہیں..... سر چھپانے آئے ہیں، گاؤں والوں سے منہ چھپا کر بیٹھے ہیں ہم یہاں..... اگر گاؤں میں ہوتے تو نہ جانے کون سی مصیبت ٹوٹ رہی ہوتی۔ مجھے تو رہ رہ کر فیکے کا خیال آرہا ہے..... کہیں اس کلمے کو اس ظالم نے جان سے ہی نہ مروا دیا ہو۔“ زمین سر جھکائے بیٹھی رہی ندامت و

خواری اس کے چہرے سے عیاں تھی دادی نے گہری سانس لے کر موضوع بدل دیا۔

”میں تجھے کسی اچھی ڈاکٹرنی کو دکھانا چاہتی تھی مگر..... میں کسی کو نہیں جانتی۔ مجھ سے بھول ہوئی جو میں نے تیری ماں کو یہ بتایا کہ تیری شادی نہیں ہوئی..... کیا حرج تھا بتا دیتی کہ تیری شادی بھی ہوئی تھی اور تجھے ایک مرا ہوا بچہ بھی ہوا تھا اور پھر تیرے شوہر نے تجھے چھوڑ دیا..... اتنی سی بات تھی کم از کم تیرا علاج تو ٹھیک طرح سے ہو جاتا..... اب یہ تیرے دن رات کمر کے درد نے مجھے مصیبت میں ڈال رکھا ہے..... کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آتا اوپر سے یہاں رہنا مجھے خود کسی عذاب سے کم دکھائی نہیں دے رہا۔“ دادی کے چہرے پر پریشانی اور بے زاری تھی۔

”آپ کا بھی دل نہیں لگ رہا ناں یہاں.....؟“ زہین یک دم بولی تو دادی نے مایوسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”زندگی کے دن پورے کرنے ہیں، دل کا کیا ہے نہ جانے اس نے تو کیا کیا دیکھنا ہے.....“ دادی کی آنکھیں بھر آئیں۔

”اس عمر میں ایسی در بدری پھر رزق بھی حرام نہ جانے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔“

”میں مطلب نہیں سمجھی.....“ زہین چونک گئی اور دادی کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

”سوائے فرزندان کے میں یہ بات اور کسی سے نہیں کرنا چاہتی..... مگر فرزندان کے گھریلو حالات بہت خراب ہیں اس کی بیوی اس کے ساتھ تعاون ہی نہیں کر رہی۔ ادھر ماں نے جنگ کا اعلان کر رکھا ہے..... اس گھر پر تو مصیبتیں ہی آتی ہیں جس گھر میں سود کھایا جاتا ہو..... وہاں امن سکون، محبت، اتفاق، رحم دلی کیسے ٹھہر سکتی ہے۔ یہ لوگ بہت گمراہ ہیں زہین..... تیری ماں جانتے بوجھے بہت بڑا گناہ کر رہی ہے اس گناہ سے بھی بڑا گناہ ہے یہ جس سے تو گزر کر آئی ہے۔ صرف لالچ کی خاطر..... زندگی کے وقتی عیش و آرام کو دیکھ رہے ہیں یہ لوگ قیامت کے دن نہ جانے اللہ ان کے ساتھ کیا

معاملہ کرے گا.....“ دادی نے آنسو پونچھے۔

”میں کچھ رقم باندھ کر لائی تھی..... ہم لوگ جتنے دن یہاں رہیں گے اپنے پیسوں کا کھانا کھائیں گے۔ سود کا ایک لقمہ بھی اس پیٹ میں چلا گیا تو قیامت تک یہ بدن جلتا رہے گا..... جنت حرام ہو جائے گی ہم پر..... ہم تو پہلے ہی بہت گناہ گار ہیں۔“ دادی رورو گراستغفار کر رہی تھیں کل انہوں نے واضح طور پر ارشاد بیگم کا دھندا دیکھا تھا۔

ارشاد بیگم کا معمول تھا لوگوں کو وہ رقم پر دس فیصد نفع رکھ کر ادھار رقم دیتی تھیں۔ مگر وہ عورت رورہی تھی اور ارشاد بیگم کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی ساری رقم ڈوب گئی..... کچھ نقصان ارشاد بیگم اپنے ذمے لے کچھ وہ باقی رقم وہ اتار دے گی اور نفع تو کچھ تھا ہی نہیں..... اس بات پر ارشاد بیگم نے عورت کے وہ لٹے لیے تھے کہ عورت رونادھونا بھول گئی تھی۔

”میں کاروبار کے لیے لوگوں کو رقم دیتی ہوں مگر کاروبار کے نفع نقصان کی مالک نہیں بنتی..... میرا اصول ہے مدت کا تعین کر کے رقم دیتی ہوں اور اپنا نفع وصول کر لیتی ہوں..... اگر تمہارے بیٹے کا نقصان ہو گیا ہے تو میں اس نقصان کی جیسے داریوں بنوں..... کیا نفع زیادہ ہو جاتا تو تو مجھے اضافی نفع دینے آتی..... کان کھول کر سن لے قہن ماہ سے ایک دن بھی زیادہ نہیں کروں گی..... جتنے دن بوجھیں گے نفع تیری طرف بنتا جائے گا۔“

”مگر..... باجی یہ تو سراسر سود ہے۔“

”ارے واہ..... آج تجھے سود کا پتا چل گیا..... جب تجھے نقصان ہو گیا تین سال سے تو..... برابر مجھ سے اس سود پر رقم لے جاتی تھی۔“

”میری مجبوری تھی باجی..... میں نے اپنی بیٹی کا بیاہ کرنا تھا..... مگر قسمت..... اجڑ کر وہ میری چوکھٹ پر آ بیٹھی۔ میرا بیٹا کہتا ہے ہم نے سود کے پیسے سے شادی کی تھی اس لیے ہماری بہن چارون بھی نہ بس سکی۔“

”اللہ..... اللہ..... تیرے بیٹا اتنا بڑا ملا تھا تو پھر شادی کے بعد رقم کیوں لینے آیا تو بھ کر لی تھی تو کیوں سود

مانگتے آیا۔“

”بس..... پاپی پیٹ بنا پیسے کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پیسے کے لالچ نے اس دلدل میں دھنسیا نہ ہاتھ میں کچھ رہا اور دنیا کا قرضہ ہوا سو علاحدہ.....“

”بس..... بس..... میں یہاں تمہاری بکواس سننے کے لیے نہیں بیٹھی ہوں..... سیدھے ہاتھ پیروں سے میرا نفع دے دینا ورنہ مجھے..... دوسرا راستہ بھی اختیار کرنا آتا ہے۔“

”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ ہمیں ایک پیسے کا بھی نفع نہیں ہوا..... الٹا نقصان ہی ہوا ہے..... آپ کی رقم بھی لوگوں سے پکڑ پکڑ کر پوری کی ہے۔ آپ سے پرانا لین دین ہے اس لیے۔ آپ نفع ہمیں معاف کر دیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“ اس سے قبل اس عورت کا داویلا اور آہ و زاری بڑھتی اور صوب کو پتا چلتا شمع نے ماں کا گھٹنا دبا یا ارشاد بیگم جب ہو گئیں وہ عورت چلی گئی تو ارشاد بیگم غصے میں بڑا بڑا نے لگیں۔

”مجھے دین کی سمجھ دینے آئی تھی جب تک نفع بٹتا رہا تب تک تو اس کی آنکھوں پر پی بندھی رہی جیسے ہی نقصان ہوا اسے اللہ یاد آ گیا..... اللہ کو سب پتا ہے کسی مجبوریاں ہیں کون ہے میرا کمانے والا..... بیٹوں کی آنکھوں پر تو چربی چڑھی پڑی ہے..... اپنے بوجھ کو خود ہی اٹھایا ہے ساری عمر ان کھٹوؤں کو بیاہ بیاہ کر الٹا گلے میں سانپ ہی ڈالے۔ فون ملا تو خالہ کو پوچھتی ہوں اس سے وہی ضامن بنی تھی ناں اس ملائی کی..... ایک کوڑی نہیں چھوڑوں گی اس پر.....! ارشاد بیگم کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

”اچھا..... آہستہ بولیں..... گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔“ دادی نے ساری بات سن لی تھی..... وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ گئیں ارشاد بیگم کی آواز اب بھی آرہی تھی۔

”مہمان آئے ہیں تو میں کیا کروں..... کیا اپنا کاروبار بند کر دوں..... یہ جو اتنی ذمے داریاں سر پر آئی کھڑی ہیں قبر میں سے اس کا بیٹا آ کر پوری کرے گا۔“

”خالہ آنٹی کا فون مل گیا ہے۔“ شمع نے آہستہ

سے کہا۔ ارشاد بیگم فون پر الجھنے لگیں اور دادی وہیں بیٹھ گئیں دماغ بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔

”جانتے بوجھتے ہوئے ارشاد اتنا بڑا گناہ کر رہی ہے..... آخر کس چیز کی کمی ہے اس کے پاس..... اتنا کچھ تو چھوڑ کر گیا تھا میرا بیٹا..... پھر یہ حلال حرام کی تمیز کیوں بھول گئی ہے۔“ بہو سے سخت کراہیت و نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

”دادی یہ سود کیا ہوتا ہے.....؟“ زہین بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

”کسی کو رقم، زیور، نقدی یا مکان وغیرہ دے کر اس پر نفع کی شرح اور مدت کا تعین کر لینا..... اسے سود کہتے ہیں۔ سود لینے والے اور دینے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ سود میں ستر گناہ ہیں سب سے چھوٹا اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے۔“ پھر دادی زہین کو ایک اور روایت سناتے لگیں۔

”ایک ماں کا بچہ سخت بیمار تھا اس نے منت مانی کہ اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو وہ اس کا پاخانہ کھائے گی..... وہ ٹھیک ہو گیا تو اس کو اپنی بات یاد آ گئی پاخانہ کھانا مشکل لگا بہت پریشان ہوئی کہ اب کیا کرے پھر کسی اللہ کے بندے سے سارا معاملہ بیان کیا اللہ کے بندے نے جواب دیا۔ کسی سود خور کے مکان کی کچھلی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر کھانا کھالے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا پاخانہ کھایا ہو۔“ دادی یہ کہتے کہتے لرزہ طاری ہو گیا زہین بھی پریشان نظر آنے لگی۔

”ہو سکتا ہے دادی..... یہ لوگ سود کے بارے میں نہ جانتے ہوں.....“

”سب کچھ جانتے ہیں یہ لوگ..... میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے..... ارشاد بیگم اپنی مجبوری ظاہر کر رہی تھی حالانکہ وہ قناعت کرتی تو حق حلال میں بڑی برکت ہے بہر حال اب ہم جتنے دن یہاں رہیں گے یہاں کا کھانا نہیں کھائیں گے جس قدر ہو سکا بچنے کی کوشش کریں گے باقی اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔“

دادی نے دل ہی دل میں طے کیا کہ وہ فرزندان سے اس معاملے میں ضرور بات کریں گی کیا وجہ ہے کہ ارشاد بیگم

ایسا کرتی ہیں کیا اس نے ماں کے خرچ میں تنگی دے رکھی ہے..... گھر کے آرام و سکون سے تو ایسا نہیں لگتا۔ دادی خود ہی ادھیڑ بن میں لگی رہیں..... فی الحال ارشاد بیگم کے گھریلو حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ کچھ مداخلت کر سکتیں ارشاد بیگم اور روحا کی سخت کلامی ہوئی تھی اور پھر اچانک روحا کے گھر سے گاڑی مع ڈرائیور کے آئی اور روحا بنا کچھ بتائے کاندھے پر پرس ڈال کر گھر سے نکل گئی..... روحا کے جانے کے بعد گھر میں ایک دم سکوت طاری ہو گیا تھا سابقہ چار دن سے ارشاد بیگم نے بھونک بھونک کر گھر کی چھت جو سر پر اٹھا رکھی تھی اب روحا کے جانے کے بعد خاموشی طاری ہو گئی تھی۔



ارشاد بیگم کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ بیٹا سب کچھ چھوڑ کر کمرے میں ہی بند ہو جائے..... کہاں تو وہ چار چار دن روحا کی شکل نہیں دیکھتا تھا اور کہاں چار دن سے مسلسل کمرے میں ہی تھا۔

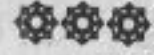
”حالانکہ ایک کوڑی کی عزت نہیں کرتی وہ اس کی..... مگر پورا دن مرید ہے اتنی بڑی گالی سننے کے بعد بھی اس کے گھٹنے سے ہی لگا بیٹھا ہے نہ جانے باپ بیٹی نے کون سا منتر گھول کر پلا رکھا ہے۔ ذرا غیرت نہیں جاگتی اس کی..... اس سے اچھا تو غیور احمد تھا کم از کم بیوی کے قابو میں تو نہیں تھا کوئی اور مرد اس کی جگہ ہوتا تو کب کا گھر سے نکال چکا ہوتا مگر یہاں تو تماشہ ہی نرالا لگ رہا ہے۔“

ارشاد بیگم کی گفتگو سے دادی کو سخت کوفت ہو رہی تھی..... زمین کو کہنے لگیں۔

”تم اندر شمع کے کمرے میں چلی جاؤ.....“

شمع خود باہر بیٹھی تھی البتہ اس کے بچے سارا دن ٹی وی کی اسکرین سے چپکے رہتے تھے۔ لائٹ جانے پر ہی اٹھتے۔ بھوک پیاس محسوس ہوتی تھی زمین نے جرج نہ کی اور چپ چاپ اٹھ کر شمع کے کمرے میں آگئی۔ ٹی وی میں تو اس کا کیا دل لگتا بے ترتیب کمرے کو سنبھالنے لگی حالانکہ آوازیں اندر بھی آرہی تھیں سب سے زیادہ ڈھٹائی تو فرزان کی تھی..... ماں سے گالیاں بھی سن رہا

تھا پھر بھی اندر ہی پڑا تھا باہر تو سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اندر دونوں میاں بیوی باہم خوش ہیں..... جبکہ روحا کے لیے دہری اذیت تھی فرزان کا انتقامی رویہ..... اور ارشاد بیگم کی بیہودہ گفتگو وہ کب تک برداشت کرتی۔ دونوں سے ہی لڑ کر گھر سے نکل گئی۔



”اتنا مہنگا موبائل کس کا مارا ہے پیارے.....“

”مارا نہیں ہے..... زمین پر پڑا ملا ہے۔“ علی

فرزان کی تاویل پہ اکرم اور شاہد دونوں..... قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

”تو پھر اسے پرنسپل کے آفس میں لے جاؤ نا..... تاکہ گمشدگی کا اعلان ہو سکے..... اور جس کی چیز ہے اسے مل جائے.....“ اب علی فرزان کو ساری بات سچ سچ بتانا پڑی۔

”تو یوں کہو نا.....! وہ پھر نہ۔“

”چودہ پندرہ ہزار کا بک جائے گا..... آدھا آدھا ہو گا۔“ علی فرزان کو یہ رقم بہت تھوڑی لگی۔

”مگر..... میں نے تو سنا تھا کہ یہ تیس ہزار کا موبائل ہے.....“

”ہاں..... تو یوز میں ہے ناں..... پیارے ڈبا کھلے ہی موبائل کی قیمت نیچے آ جاتی ہے۔ تیرے خیال سے یہ کیا نہیں میں ہی کہے گا..... بڑی اچھی رقم بتائی ہے ہم نے تجھے..... اگر تو اس سے زیادہ میں سچ سچ سکتا ہے تو تیری مرضی.....“ اکرم نے موبائل واپس علی فرزان کے ہاتھ پر رکھا تو علی فرزان نے ہاتھ میں نہیں لیا۔

”نہیں..... نہیں میں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا اور اگر میں اسے سچ سچ سکتا تو تم لوگوں کے پاس ہی کیوں آتا..... مجھے تو بس رقم چاہیے۔“

”اگر تجھے رقم کی سخت ضرورت ہے تو ہم تجھے دے دیتے ہیں مگر یہ اس طرح جلد بازی میں نہیں بک سکتا۔“

”مگر میں نے تو سنا تھا چوری کے موبائل کا بازار لگتا ہے جہاں ہزاروں موبائل کی خرید و فروخت ہوتی ہے.....“ علی فرزان کی انفارمیشن پر انہیں ہنسی آگئی۔

”چور بازار میں اسے بیچنے جائے گا تو پانچ ہزار

سے زیادہ کا نہیں بکے گا اسے تو ہم اپنے جیسے کسی یار کو بیچیں گے تاکہ نفع صحیح آ سکے۔“

”تو اس میں کتنا وقت لگ جائے گا۔“

”ہم نے کہا ناں..... وقت تو لگے گا اور اگر تجھے پیسوں کی اتنی ہی ضرورت ہے تو تو ہم سے لے لے لے..... باقی..... اسے فروخت کرنے کے بعد ہم خود رکھ لیں گے.....“ یہ تجویز علی فرزان کو بہت اچھی لگی اور ہل بھی۔

”ٹھیک ہے، تم مجھے پیسے دے دو۔“ اکرم نے شاہد کو اشارہ کیا۔

”یہ لو آٹھ ہزار ہیں رکھ لو..... نہ جانے ہمارے جیسے میں آٹھ ہزار بھی آسکیں گے یا نہیں.....! علی فرزان چپ رہا شاہد نے آٹھ ہزار روپے دے دیے۔ رقم اتنی زیادہ نہیں تھی مگر مجبوری میں بہتر تھی اس نے اسی ہفتے گاؤں جانے کا پروگرام بنالیا۔

رات کو وہ بتلون کی جیب سے پیسے نکال کر کتابوں کے بیچ میں رکھ رہا تھا بھی رضوان کی آواز آئی۔

”کیا ہوا ابھی تک سوئے نہیں تم.....“

”نہیں بس سو رہا تھا.....“ وہ جلدی سے بستر پر لیٹ گیا۔

”کیا ہوا تمہارا موبائل ملا.....؟“

”نہیں.....!“ رضوان غنودگی میں کہہ رہا تھا۔ ”سم تو میں نے بند کرادی ہے البتہ سیٹ..... میرا مہنگا تھا۔ کالج میں اگر ہوا تو یہاں سے باہر نہیں جاسکے گا۔“ رضوان نے یہ کہتے ہوئے کمرٹ بدلی تو علی فرزان کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ صبح ہی وہ شاہد اور اکرم کو مزید چوکنہ کر دے گا سوچتے ہوئے اس نے لائٹ آف کی مگر اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

”صبح دعا کے لیے صوفی پاپا کے پاس ضرور جاؤں گا..... ان کی دعا سے دل کو اطمینان نصیب ہو گا اور پریشانیوں سے بھی محفوظ ہوں گا.....“ کیا ہو گیا تھا اس کے ایمان کو وہ اللہ کو کیوں بھولتا جا رہا تھا..... اور روز بروز خدا سے دور ہو رہا تھا۔



”ہائے روحا..... کیسی ہوتی.....؟“ اس کی کالج فیلو کتنے عرصے کے بعد اسے ملی تھی اور وہ بھی کس قدر والہانہ انداز میں..... جبکہ وہ خود تو پہچان بھی نہیں پاتی تھی۔

”امبرین یوسف.....“ بڑی دیر کے بعد یادداشت میں آیا تھا امبرین ہمیشہ کی طرح ہنس مکھ اب بھی کھلکھلا رہی تھی۔

”یہاں اسپتال میں کیسے.....؟“ امبرین نے اچنبھے سے پوچھا۔

”ڈیڈی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ان کے چیک اپ کے لیے آئے تھے۔“

”ضرورت ہماری ہی ٹینشن ہوگی انہیں.....“ امبرین یہ کہہ کر ہنس دی۔

”یاد ہے ایگزمر کے دوران کس طرح روتی تھیں تم اور انکل بلے گاؤ کتنا وقت دیتے تھے تمہیں..... ٹیوٹر بھی اچھے سے اچھا لگاتے تھے تمہارے لیے مگر تمہاری کھوپڑی میں الجبر اور میتھ آتا ہی نہیں تھا اور بالآخر انکل نے تمہیں ادھوری تعلیم سے ہی اٹھالیا تھا۔ خیر سے شادی کے بعد تو ٹینشن نہیں دیتی ہو انہیں۔ بچے و بچے سناؤ کتنے ہیں۔“

”بچے نہیں ہوئے.....“ روحا کو جواب دیتے ہوئے بھی مسکی محسوس ہو رہی تھی..... جب کہ امبرین اپنے ساتھ دو پیارے سے گول مٹول بچے لیے کھڑی تھی۔

”تمہارے کتنے بچے ہیں.....؟“ روحا نے سوال بدلا۔

”تمہارے سامنے ہیں..... اور تیسرے کی تیاری ہے۔“ یہ کہہ کر امبرین نے بے ہنگم سا قہقہہ لگایا۔ صحت میں وہ پہلے بھی اچھی خاصی تھی اور اب تو اور بھی ڈبل ہو گئی تھی۔

”کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاؤ یار..... کیا پر اہلم ہے بچوں کے بنا تو زندگی بالکل ویران ہے۔ تمہارا میاں بچوں کے بنا خوش ہے تمہارے ساتھ.....“ امبرین کا یہ سوال کتنا عجیب تھا وہ بنا جواب دیئے امبرین کا منہ

دیکھنے لگی اب اسے کیا حالات بتاتی کون سا امبرین اس کی بیسٹ فرینڈ تھی..... اور بیسٹ فرینڈ تو اس کی کوئی تھی نہیں سوائے ڈیڈی کے وہ تھی ہی کس کے قریب امبرین ہونقوں کی طرح اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر ہنس پڑی۔

”لگتا ہے آج بھی وہی روحا عماد ہو تم..... جو ہر بات میں کہا کرتی تھی ڈیڈی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔“ یہ کہہ کر امبرین نے بہتہ لگایا گویا خود ہی مخطوط ہوئی ہو.....

”اپنی وے..... یہ بتاؤ سسرال کے ساتھ رہ رہی ہو یا تنہا.....؟“

”سسرال والوں کے ساتھ.....“ روحا نے سپاٹ سا جواب دیا۔

”چلو یہ بھی ٹھیک ہے..... ورنہ تو تمہیں تنہائی بہت محسوس ہوتی۔“ اتنے میں امبرین کا شوہر آ گیا۔

”میں اتنی دیر سے تمہیں اوپر ڈھونڈ رہا ہوں اور تم ہو کہ یہاں باتیں بگھا رہی ہو راہ چلتوں سے مراسم بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔“ امبرین نے جھٹ اپنے شوہر کے بازو پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ راہ چلتے نہیں ہیں، میری بہت پرانی دوست ہے یوں سمجھ لو اسکول میں ہم لوگوں نے ایک ساتھ ہی پڑھا تھا اور کچھ عرصہ کالج میں بھی ساتھ رہے ہیں، یہ روحا عماد ہیں جس کے بارے میں، میں اکثر آپ کو بتاتی ہوں..... امتحانوں کے خوف سے رونے والی یہی روحا

عماد تھی اور روحا یہ میرے شوہر ہیں شہر یار.....“ روحا اپنے متعلق اتنے گھٹیا تعارف پر زمین میں گڑ کر رہ گئی تھی شہر یار کو بہر حال کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا کر روحا سے ہیلو ہائے کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

”جلدی آ جاؤ..... اوپر آپا تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“

”شہری..... تو بس ایویں ہی ہیں..... بورنگ اور سنجیدہ..... میں ہنس مکھ تھی ناں اس لیے مجھے ایسا شوہر ملا سنا ہے جو لڑکیاں سنجیدہ ہوتی ہیں انہیں ہنس مکھ شوہر ملتے ہیں تمہارے شوہر کا مزاج کیسا ہے...؟“ امبرین کے بے محل سوال پر روحا کو سخت کوفت اور بے زاری نے آن

گھیرا تھا اگر اس کا شوہر آواز نہ دیتا تو دو گھنٹے اور سر کھاتی رہتی اس کے جانے کے بعد روحا نے گہری پرسکون سانس خارج کی۔

”آج بھی بالکل ویسی ہی ہے اوٹ پٹانگ اور خود خود کیا ہے۔“ یک دم اس کے قدم رک گئے اور سوچیں تھم گئیں دوسروں کی نظروں میں اس کا مورال کتنا گھٹیا تھا۔ امبرین اس کے متعلق کیا کہہ رہی تھی۔

واقعی اس کی زندگی ایسی ہی گزری تھی اور آج تک ایسے ہی گزر رہی تھی اپنے قدموں پر تو اس نے کھڑا ہونا سیکھا ہی نہیں تھا..... ڈیڈی کی محبت نے اسے اپنا چہ بنا دیا تھا..... وہ اپنا محاسبہ کرتے ہوئے سر ہٹیاں چڑھ رہی تھی۔



”کیسی باتیں کر رہی ہیں دادی آپ..... یہ گھر

آپ کا بھی ہے آپ یہاں نہ مہمان ہیں اور نہ ہی غیر..... پھر آپ نے ایسی بات کیوں کہی..... کس چیز کی تنگی ہے مجھے بتائیں میں لا کر دوں گا..... مگر اس طرح الگ سے آپ کو راشن لا کر دینا..... کتنا عجیب لگے گا.....

کیا ہم لوگ اس قابل بھی نہیں کہ چند دن آپ کی خدمت کر سکیں..... کیا ماما نے آپ کو کچھ کہا ہے.....؟“

فرزان کے اس قدر اصرار اور بحث پر دادی خود ہی مجبور سی ہو گئیں۔

”ایسا کچھ نہیں ہے..... مجھے عادت ہے اپنے ہاتھ کا پکا کھانے کی۔“

”تو اس میں سے لے کر پکا لیں ناں.....“ اب دادی کو مجبور ہونا پڑا۔

”پہلے مجھے یہ بتاؤ تم اپنی ماں کو کھلا خرچ نہیں دیتے.....؟“

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا..... اور ویسے بھی ماما تو خود ہر چیز کی مالک ہیں میں کیا خرچ دوں گا کراے کی مالک تو ماما ہی ہیں.....!“

”اگر اتنا کھلا خرچ ہے تمہاری ماں کے ہاتھ میں تو..... تو.....“ دادی یک دم کہتے ہوئے ہچکچا میں پھر توقف سے بولیں۔

”میں کہنا نہیں چاہتی کیونکہ اللہ بھی کسی کے عیب کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا..... مگر..... میں جاؤں ان پڑھ عورت ہوں دین کو نہیں جانتی..... مگر اتنا ضرور پتا ہے کہ اسلام میں سود حرام ہے جو سود کا کاروبار کرتا ہے وہ گویا اللہ سے براہ راست جنگ کرتا ہے..... اور اس پر اللہ کا غضب ہے جس نے ایسا کیا..... تمہاری ماں لوگوں کو سود پر رقم دیتی ہے، کیا تم یہ بات جانتے ہو؟“ دادی کی بات پر فرزان چپ ہو گیا اور تھوڑی دیر سوچ کر بولا۔

”میں جانتا ہوں..... ماما ایسا کرتی ہیں۔“

”تو تم نے اسے روکا کیوں نہیں.....؟“ دادی کی پریشانی اچانک بڑھ گئی۔

”اس لیے کہ.....“ فرزان سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کہتا ہے کہ وہ خود اس چیز کو غلط نہیں سمجھتا کیونکہ پورے

پاکستان میں بینکوں میں یہی رواج عائد ہے..... حالانکہ پاکستان اسلامی جمہوریہ ملک ہے مگر ٹوٹل نظام سودی ہے سب کچھ اسی طرح چل رہا ہے اور اب کوئی اسے معیوب بھی نہیں سمجھتا..... دادی دیہات سے آئی ہیں ناں..... اس لیے جدید دور کے تقاضوں سے نا بلد ہیں۔

”ماما خود سمجھدار ہیں..... میں ماما کو کیا کہہ سکتا ہوں.....!“ اس نے گویا اس موضوع پر مٹی ڈالنا چاہی مگر دادی بضد ہو گئیں۔

”کیوں نہیں کہہ سکتے تم..... تم پر یہ ذمے داری عائد ہے کہ تم روکو۔“ اب کیا بتاتا وہ خود ان چکروں میں پھنسا ہوا ہے..... ماما تو چھوٹا کام کر رہی ہیں وہ تو اس سے بھی بڑا دھندا کر رہا۔

”اس گھر سے بھی تو نحوست اور جھگڑا ختم نہیں ہو رہا جو ایسا رزق پیٹ میں جاتا ہے استغفر اللہ.....

استغفر اللہ میں بھی کہوں اتنی نفسا نفسی کیوں ہے یہاں..... یاد رکھنا، ہمیشہ مصیبتوں میں گھرے رہو گے کبھی نہیں نکل سکو گے.....“ فرزان کو دادی کی باتیں

بوجھ لگ رہی تھیں جلد از جلد موضوع بدل دینا چاہتا تھا مبادا ماما سن لیتیں تو جنگ کا طبل بج جاتا۔ روحا کے جانے کے بعد کچھ تو امن ہوا تھا اب یہ دادی ختم کرنے پر تلی تھیں۔

”اچھا..... میں آج ہی آپ کو سامان لا دوں گا، پر ماما کو آپ خود مطمئن کریں۔“

”جیتا رہ بیٹا..... اللہ تیرا گھر آباد کرے اور ہاں یہ تو بیٹا..... تو روحا کو اب تک کیوں نہیں لایا..... کتنے دن ہو گئے ہیں اسے...؟“

”خود گئی تھی خود ہی آجائے گی۔“ فرزان نے بے پروائی سے کہا۔

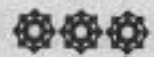
”عیش کے دن ہیں سکون سے گزارنے دیں۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا تو دادی کہے بنانہ رہ سکیں۔

”سچ کہہ رہا ہے بیٹا جب سے روحا گئی ہے تیری ماں تیری خدمتیں بہت کر رہی ہے۔ روحا کے سامنے تو تجھے پانی کو بھی نہیں پوچھتی اور گالیاں دیتی ہے علیحدہ اور اب کتنی مطمئن ہے کیا تو نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔“ فرزان اس بات پر ہنس دیا۔

”ماما نے ہی کی تھی..... بہت ارمانوں سے..... مگر سیٹھ عماد الدین نے ہر چیز میں فوقیت جما کر ماما کو اس قدر رنج کیا کہ روحا پسندیدہ بہو کے بجائے ناپسندیدہ بن گئی۔ یہ جنگ ماما کی روحا سے نہیں اس کے باپ سے ہے۔ قصور وار روحا بھی ہے، نہ ہی وہ اس معاملے کو سمجھنا چاہتی ہے اور نہ ہی اپنے باپ کو اپنی پشت پر سے ہٹانا چاہتی.....“

”اور سچ میں پس رہے ہو تم.....؟“ دادی کو فرزان پر ترس آیا۔

”نہیں، میں تو بہت مزے میں ہوں۔“ کچھ دن سے اس کا موڈ اتنا ہی خوشگوار تھا شاید اپنی حالت پر مطمئن ہونا آ گیا تھا۔



”کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تمہارا یہاں دل نہیں لگ رہا.....“ شمع نے اچانک پوچھا تو زبین چونک گئی۔ وہ بڑے انہماک سے فیکے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”ہمیں نہ پا کر ملکو نے کہیں فیکے کو جان سے نہ مار دیا ہو.....“ آخر اس نے فیکے کو کہاں غائب کیا ہوگا..... گاؤں والے تو یہی سمجھیں ہوں گے زبین پر جو جنات تھا

اس نے فیکے کو مار دیا ہے..... آخر گاؤں والے میرے ساتھ دادی کے بارے میں بھی تو سوچتے ہوں گے۔ نہ جانے میتو اور رانی کا کیا حال ہوگا اور چندا کس حال میں ہوگی گھر یونہی خالی پڑا ہوگا پہلے نہیں تو اب ضرور اس میں آسیب بس گیا ہوگا۔“

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا..... کیا ایکٹی وٹیز تھیں تمہاری وہاں..... میرا مطلب ہے گاؤں میں تم بیشتر وقت کیسے گزارتی تھیں کیا ٹی وی تھا وہاں.....؟“ زبین نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”تو پھر تم کیا کرتی تھیں.....؟“ شمع نے برا سامنے بنایا۔ اس کے خیال میں تو پینڈوؤں کو ضرورت سے زیادہ ٹی وی دیکھنے کا شوق ہوتا ہے مگر زبین نگاہ اٹھا کر بھی ٹی وی کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔

”ہمارے وہاں بہت سے گھروں میں ٹی وی تھا..... مگر مجھے شوق ہی نہیں ہوا کہ ڈرامے دیکھوں..... بس ہم سہیلیاں..... گھومنے پھرنے چلی جاتی تھیں یا پھر اپنے گھر کے کام.....!“

”گھومنے پھرنے.....؟“ شمع نے اچھا کیا۔ ”کہاں گھومتے پھرتے تھے تم لوگ.....؟“

”کھیتوں میں، ٹیوب ویل پر، باغوں میں اور اسکول کے پچھواڑے۔“ یک دم زبین کی زبان سل گئی۔

ماسٹر امام علی..... اور پھر ملکو..... یہ یادیں اتنی زہریلی اور پتھریلی تھیں کہ زبین کی روح تک گھائل ہو جاتی تھی وہ کن مرحلوں سے گزرتی گئی یہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”کل ہم لوگ گھومنے پھرنے چلیں گے بہت دن ہو گئے بچوں نے سیر بھی نہیں کی تم چلوگی میرے ساتھ۔“ شمع نے یہ کہتے ہوئے ٹی وی آن کیا اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ نیوز چینل پر گینگ ریپ کی خبر آرہی تھی پھر لڑکی کا بیان اور میڈیا کا لڑکی کو تحفظ دلانا..... لڑکی کسی دیہی علاقے کی تھی اس کے بعد مجرموں کو اسکرین پر دکھایا گیا۔ لڑکی کو یقینی تحفظ کا احساس دلاتے ہوئے وزیر اعلیٰ اور پولیس اہلکاروں نے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے

کی یقین دہانی کرائی۔

جس این جی او کے ذریعے لڑکی میڈیا تک پہنچی تھی وہ این جی او لڑکی کی جرأت اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کو زور شور سے سراہ رہی تھی۔ شمع کی دلچسپی نیوز سے زیادہ اپنے موبائل فون پر تھی بچے چونکہ سوچکے تھے اس لیے زبین نے اس خبر کو بڑے انہماک سے دیکھا اور سنا..... اس کے خیال میں تو ٹی وی پر بس ڈرامے یا فلمیں آتی تھیں ایسی خبر..... وہ اندر تک ہل کر رہ گئی تھی پھر اس کے بعد کے بعد دیگرے مختلف شہروں سے ایسی ہی خبریں دکھائی گئیں۔ شمع نے چینل بدل دیا اور انڈین ڈراما دیکھنے لگی مگر زبین کا ذہن الجھ گیا تھا ساری رات اسے نیند ہی نہیں آئی۔

اس کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ظلم ہوا تھا، ظالم دندناتا پھر رہا ہے اور وہ منہ چھپا کر بیٹھ گئی ایسی ہی سزا ملکو کو کیوں نہیں دی گئی، کیسے دی جاتی کیا اس نے آواز اٹھائی تھی۔

اس نے آواز کیوں نہیں اٹھائی..... وہ خود کو جواب دیتے دیتے تھک گئی..... اور پھر ایسا روز ہونے لگا زبین صرف خبریں دیکھتی تھی روزانہ کوئی نہ کوئی خبر ایسی ضرور ہوتی تھی جو اس پر بیت چکی تھی کوئی اس لڑکی کو برا نہیں کہتا تھا وہ تو مظلوم ہوتی تھی..... اور میڈیا اس کا ساتھ دے رہا ہوتا تھا۔ اگر وہ بھی اپنے اوپر ہونے والی زیادتی میڈیا میں جا کر بیان کرے گی تو کیا سب اس کا اسی طرح ساتھ دیں گے..... کیا ظالم کو سزا ملے گی۔ کیا وہ بھی سب کی نظروں میں اس طرح مظلوم کہلائے گی جس طرح یہ لڑکیاں..... کوئی انہیں برا نہیں کہتا سب کی ہمدردی ان لڑکیوں کے ساتھ ہوتی ہے کیا اسے بھی اسی طرح ہمدردی اور تحفظ ملے گا۔

”اگر یہ سب مظلوم ہیں..... تو میں بھی مظلوم ہوں۔ مجھے بھی انصاف چاہیے کیا اس طرح کھوٹی ہوئی عزت واپس آجائے گی؟“

”یوں..... چھپ کر بیٹھ جانے سے بھی تو نہیں آئے گی۔“

”آخر کون کرے گا اس ظالم کا ستیاناس...!“

”ملکو کی گاؤں میں صدیوں سے جھوٹی عزت شان بان بنی ہوئی ہے اسے کون بے نقاب کرے گا...؟“

”زبین.....“ شمع کی آواز پر وہ اچھل پڑی۔

”کہاں کھوٹی رہتی ہو ہر وقت..... دادی کب سے تمہیں کھانے پر آوازیں دے رہی ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی شمع نے اکتا کر ٹی وی بھی آف کر دیا۔

”کہاں تو تم ٹی وی نہیں دیکھتی تھیں..... اور اب نیوز سے تمہارا پیٹ نہیں بھرتا۔“ زبین کھوئے کھوئے سے انداز میں ٹی وی کی طرف دیکھنے لگی۔ شمع چار بچوں کی ماں تھی اور چلتی ماں کی بیٹی تھی۔ زبین کی غیر معمولی حرکت پر چونک گئی۔

”کیا بات ہے زبین..... اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“ زبین نے کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ وہ شمع سے بات کرنے پر دل ہی دل میں آمادہ ہو چکی تھی۔

”گاؤں یاد آتا ہے یا کوئی محبت کرنے والا.....؟“

شمع کا لہجہ شرارتی سا ہوا تو زبین نے سر اٹھا کر خالی نگاہوں سے شمع کی طرف دیکھا اس کا چہرہ بالکل سیاٹ تھا لیکن وہ جو کہہ رہی تھی اسے سن کر شمع کے چہرے کے کئی رنگ بدلے۔ حالانکہ زبین کا انداز بلا تمہید بالکل سادہ تھا۔

”ماجی یہ جو لڑکیاں ہیں جن کی عزتیں لٹ جاتی ہیں یہ ٹیلی ویژن تک کیسے پہنچتی ہیں...؟“

”کیوں..... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”کیونکہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے..... اور میں بھی اس ظالم کو ہتھکڑیاں ڈالونا چاہتی ہوں، بڑی سے بڑی سزا دلوانا چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر زبین پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی جب کہ شمع کا سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔

جاری ہے



ناولٹ

کچی گاگرٹوٹ گئی

میمونہ خورشید علی

قطع 5

گھر میں جو یہ سب کچھ منگوایا جا رہا ہے.....؟“ فرزان کی شکل نظر آتے ہی ارشاد بیگم کا پھٹنا لازمی تھا۔ آخر کو سب کچھ فرزان ہی تو لا کر دے رہا تھا۔
”کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بس شہری اور دیہاتی

”اے لو، یہ نیا پنکا..... پہلے تو بن بلائے سر پر نازل ہو گئیں اور اب زبردستی بے ہوئے گھر میں گھس کر اپنا گھر بسا رہی ہیں۔ آخر کتنے دن کا ارادہ ہے بڑھیا کا یہاں رہنے کا جو اتنا راشن منگوایا۔ آخر کس چیز کی کمی تھی میرے



زمین کو کون بیاہنے آئے گا۔“

”یہ ہمارا سر درو نہیں ہے، دادی جانیں اور ان کے مسائل۔ تجھے بھوک لگ رہی ہے کچھ کھانے کو دیں۔“

”کب سے انتظار کر رہی ہوں شمع کا۔ بچوں کو سیر کرانے کے لیے لے گئی تھی، اندھیرا پھیل رہا ہے اور ابھی تک نہیں آئی۔ ساتھ میں اس گنوار کو بھی لے گئی تھی جو انسانوں کو ایسے دیکھتی ہے جیسے کسی اجنبی مخلوق کو دیکھ رہی ہو۔“

”اور دادی.....؟“

”ہوں گی اپنے کمرے میں۔“

”میں ذرا دادی کو بل اور یہ بقیہ پیسے دے آؤں۔“

پھر آتا ہوں۔“ فرزان یہ کہہ کر دادی کے کمرے میں چلا گیا۔ ارشاد بیگم کا ذہن ساس کے وسائل اور اثاثوں کی طرف چلا گیا۔

”ضرور بڑھیا کے پاس مستحکم روپے کی آمد کا ذریعہ ہے تبھی تو جب سے آئی ہیں لال، ہرے نوٹ دکھا رہی ہیں۔ کبھی پوتا پوتی کو دے رہی ہیں تو کبھی پوت بہو کو سلامی۔ اور اب یہ روزمرہ کے اخراجات۔ آخر ایسا کون سا ذریعہ ماش ہے جس سے دادی پوتی کی گزر بسر ہو رہی ہوگی۔ ایک گھر تو سنا تھا ہے جس میں یہ لوگ خود رہائش پذیر تھیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بڑھیا کھرچ کر مستقل ادھر ہی آگئیں ہو۔“ یہ خیال آتے ہی ارشاد بیگم کے چاروں طبق روشن ہو گئے۔

”اس طرح تو بہت بھاری رقم ہوگی بڑھیا کے پاس۔ تبھی تو شمع سے کہہ رہی تھیں۔ زمین کو کچھ شاپنگ بھی گرا دے۔ گویا یہ بات ہے۔ ذرا کان کلائی تو لوں۔“ یہ خیال آتے ہی ارشاد بیگم ساس کے کمرے کی طرف آئیں۔ جہاں سے فرزان اور دادی کی آوازیں آرہی تھیں۔

”جیتا رہ بیٹا، دادی نے سلام پھیر کر فرزان کا شکریہ ادا کیا۔“

”چیک کر لیں۔ سارا سامان مکمل ہو گیا ہے یا کوئی چیز رہتی ہے۔“

”بس مجھے روغن بادام اور لادینا اور یہ دیسی گھی تو

فرق ہے۔“ فرزان نے اپنی طرف سے ماں کو مطمئن کرنا چاہا لیکن ارشاد بیگم اور بھی مشتعل ہو گئیں۔

”یہ فرق دیہات سے چلنے سے پہلے سمجھ لینا چاہیے تھا اگر شہری خوراک راس نہیں تو کیا مجبوری ہے..... اپنا بوریا بستر سمیٹیں اور جائیں یہاں سے۔ فالتو نہیں ہیں ہمارے پیسے جو ڈبل ڈبل راشن منگوائیں۔“

”آپ سے کس نے کہا..... دادی نے جو کچھ منگوایا ہے آپ کے خرچ میں سے منگوایا ہے۔“

”تمہارے پیسے میرے پیسے، دو تو نہیں.....؟“

ارشاد بیگم کچھ چڑچڑی سی ہوئیں تو فرزان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”نہ تو یہ سب کچھ میرے پیسوں سے آرہا ہے اور نہ ہی آپ کے پیسوں سے۔ دادی اپنے پیسوں سے منگواتی ہیں۔“

”اوہ..... تو گویا پوٹلی باندھ کر لائی ہیں بڑھیا۔“

ارشاد بیگم کی لالچی طبیعت ہری بھری سی ہو گئی۔ ”مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ سوائے دیسی گندم کے آٹے کے اور تو کوئی ایسی چیز نہیں جو بڑھیا کو تکلف پہنچاتی ہو پھر اتنا تام جام پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”منشی ڈالیں..... جیسے دادی خوش ہیں ٹھیک ہے، ہمارا کیا جارہا ہے۔“ فرزان ہر طرح سے پہلو بچا رہا تھا۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے کہ ہمارا کیا جاتا ہے۔ چلو اچھا ہی ہے اپنا خرچ خود برداشت کریں گی۔ میرے اوپر تو پہلے ہی بہت بوجھ ہے مگر پھر بھی میں پوچھوں گی تو

سہمی..... مہمان کا یوں مسلط ہونا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے وہ زندگی بھر کے لیے یہیں پڑاؤ ڈال دیں۔“

”آپ کو تو بس پونہی وسوسے آتے رہتے ہیں۔ دادی کی عمر اب باقی ہی کتنی ہے۔ آج مریں کل دوسرا

دن۔ رہ گئی زمین اس کے بارے میں تو وہ بتا ہی چکی ہیں کہ وہ اس کی شادی کرنے کے لیے آئی ہیں۔“

”ہاں، ہاں تو شادی کیا ہوا میں ہی ہو جائے گی۔ اچھا خاصا خرچ آئے گا اس پر اور

پھر رشتے..... رشتے کیا آسمان سے ٹپک رہے ہیں۔ اچھی بھلی پڑھی لکھی لڑکیوں کو تو کوئی نہیں پوچھتا تو اس گنوار

پھر تمہارے لیے تو حیات محمد بہت کچھ چھوڑ کر گیا تھا۔ ایسے فعل کی تو بھوکے مرتے بھی اجازت نہیں ہے۔
”میں تو کہتا ہوں آپ اس موضوع کو نہ ہی چھیڑیں تو اچھا ہے۔ چند دن کے لیے آپ آئی ہیں۔ خوانخواہ گھر میں فساد برپا ہو جائے گا۔“

”ہو جائے فساد۔۔۔۔۔ کم از کم اس فساد کے بعد دائمی امن تو آئے گا۔ سکون تو آئے گا پورے گھر پر خوشی چھائی ہوئی ہے، سب ختم ہو جائے گی۔ مجھ سے ہوسکا تو میں ضرور ارشاد کو کہوں گی۔ مانے گی ٹھیک ہے ورنہ دل میں تو برا جانوں گی ناں۔“ ارشاد بیگم تلمٹاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئیں۔

”تو یہ بات تھی جو بڑھیا پانی تک بھی باہر سے منگوا رہی تھی۔“ ارشاد بیگم کو خجالت بھی تھی اور غصہ بھی تھا۔ سارا طعناور اور حیثیت و کوڑی کی ہو گئی تھی۔

دو تین دن سبھی نے محسوس کیا کہ ارشاد بیگم کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ وہ کسی سے کوئی بات ہی نہیں کر رہیں۔ ادھر شمع عجیب تذبذب کی حالت میں تھی۔ زمین راز اٹکنے کے بعد بالکل گرم صحنہ ہو گئی تھی، شمع نے کئی بار کمر بندے کی کوشش بھی کی مگر زمین پھر اس موضوع کی طرف نہ آئی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پہ ہر وقت خوف نظر آنے لگا تھا۔ نہ جانے جذبات کی کون سی رو میں بہک کر اس نے شمع کے سامنے یہ سب کچھ اگل دیا تھا۔

”داوی کو پتا چل گیا تو وہ جیتے جی مرجائیں گی۔ گھاؤں سے چھپ کر تو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ یہاں سے نکلیں گے تو کوئی دوسرا ٹھکانا بھی نہیں ہوگا۔“ زمین دل ہی دل میں خود کو مضبوط کر رہی تھی۔ اتنے میں شمع کمرے میں آگئی۔

”اقبال کے بعد سے تو میں ایسے رنگ پہنتی نہیں، ایسا کرو کہ یہ سوٹ بھی تم رکھ لو۔ تم پہ بہت نیچے گا۔ داوی کو بھی بہت پسند آیا ہے۔“

”مگر یہ تو آپ نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔۔۔۔۔؟“
زمین بے دلی سے سوٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ گھرے فیروزی اور آتش لکڑ کا سوٹ تھا تو بہت پیارا مگر زمین تو خود سادے کپڑے پہنتی تھی۔ اور یہ عذر اس نے کبھی بھی دیا۔

”اللہ ہی دیکھی نہیں لگ رہا۔“ فرزان ہنسنے لگا۔
”جیسا بھی آپ کھا چکی ہیں۔ ویسا تو میں آپ کو کھانے سے نہیں لاکر دے سکتا۔“ داوی نے گہری سانس لی۔

”وہاں گاؤں میں اپنے جانور تھے، گھر کا دودھ تھا اور مکھن بالائی، ویسی بھی سب اسی میں سے ہو جاتا تھا۔ اس زندگی کے دن گزارنے ہیں۔ ڈالڈا بھی کھانے سے گلا بند ہو جاتا ہے۔ کئی روز ہو گئے دوالے لے کر بھی تھک گئی۔ گلا ہی نہیں کھلتا۔“

”اللہ کرے آپ کو یہ بناوٹی دیکھی بھی راس آجائے۔ نہ بھی آیا تو کھانا تو یہی پڑے گا۔ آپ کے پاس آپشن تو کوئی ہے ہی نہیں۔“ داوی چپ سی ہو گئیں۔
ارشاد بیگم کی توجہ جانوروں کی طرف تھی۔

”کتنے جانور تھے آپ کے پاس؟“ فرزان نے ارشاد بیگم کے دل کی بات پوچھ لی۔

”تین جانور تھے۔ فی الحال کسی پہ چھوڑ کر آئے ہیں۔“ داوی نے سنبھل کر جھوٹ بولا۔ ”واپس جائیں گے تو دیکھیں گے۔ گھر اور جانور کس حال میں ہیں۔“
”کیا ضرورت ہے آپ کو جانے کی۔ اب آپ ادھر ہی ٹھہر جائیں۔ زمین کی شادی کے بعد تو آپ بالکل تنہا رہ جائیں گی۔“

”یہاں رہنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ہمیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔“ داوی اپنی طرف سے ہمدردی کر رہی تھیں۔

”اب تو آپ کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اب تو آپ آرام سے رہ سکتی ہیں۔“

نہ جانے فرزان اس قدر کیوں قائل کر رہا تھا۔ ارشاد بیگم کو دل ہی دل میں غصہ آنے لگا۔

”اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمہاری ماں یہ دھندا کرتی ہے۔ تو میں ہرگز یہاں نہ آتی۔“ یکدم ارشاد بیگم نے کیا سنا تھا کہ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

”سود بہت بری لعنت ہے۔ ہو سکے تو اپنی ماں کو سمجھاؤ اس سے نیچے۔ دنیا میں چار دن اچھے گزر جائیں بھی تو کیا۔ آخرت میں جواب کون دے گا اور

”نہیں شمع باجی..... نہیں۔“ زبین اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے دیوار سے جا لگی۔ ”مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہتی۔“

”تم خواستواہ ڈر رہی ہو زبین تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا اور ایک بات بتاؤں تمہیں..... یہ راز تم کتنا ہی چھپا لیتیں۔ اس نے ضرور سامنے آنا تھا۔ یہ جو ہر وقت تمہاری کمر میں در در ہوتا ہے۔ اس درد نے تمہارے بیک راؤنڈ کو ضرور سامنے لانا تھا۔ تمہیں اپنا علاج کرانا چاہیے زبین۔ میں نے اپنی لیڈی ڈاکٹر کو تمہاری ساری ہسٹری بتائی ہے۔ ان کا خیال ہے تمہارا ابارشن دوبارہ ہوگا۔ اگر نہیں ہوا تو تم مہلک بیمار یوں میں مبتلا ہو جاؤ گی۔ اب بتاؤ..... ایسے میں تمہارا راز دین رہ سکتا تھا؟“ زبین ہچکیوں سے زانو پر سر رکھے رو رہی تھی۔

داوی کو لگا جیسے ان کے پیروں تلے سے کسی نے زمین کھینچی ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ چوکھٹ بھی نہ تھا مکیں اور زمین پہ ڈھیر ہو گئیں۔

”بس کرو زبین اور اب کتنا رو لگی۔ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے ہوتا وہی ہوتا ہے۔ اس میں خدا کی رضا تھی اور خدا کی رضا میں راضی ہونا ہی انسان کی خوبی ہے۔ داوی کا انتقال ہوئے بیس دن ہو گئے ہیں۔ اور بیس دن سے تمہاری آنکھ سے آنسو نہیں سوکھے۔ دادی عمر بھر کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ ان کی جدائی تو ساری عمر کتنی ہے اور ساری عمر ہی رونا آئے گا۔ آخر کو انہوں نے تمہیں ماں، باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ تم بھلا انہیں کہاں بھول سکتی ہو مگر اب خود کو سنبھالو..... مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ انہیں اب ثواب کی ضرورت ہے، یہ آنسو انہیں تکلیف پہنچائیں گے۔ تمہیں ان کے لیے ذریعہ ثواب بننا ہے مگر یوں رو دھو کر نہیں۔ زندگی کو ہنسی خوشی گزار کر..... میں ہوں نا تمہاری ماں۔ بہت بڑی ذمہ داری سونپ گئی ہیں اماں جی مجھے۔“ یہ کہہ کر ارشاد بیگم نے زبین کو سینے سے لگا لیا۔ زبین بلک بلک کر رو پڑی۔ ارشاد بیگم دلا سہ دیئے لگیں۔

”کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ یہ گھر

شمع باجی سوٹ تو بہت اچھا ہے مگر شادی شدہ عورتوں کے لیے زیادہ مناسب ہے۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی تو شمع کو ہنسی آ گئی۔

”تم کون سا شادی شدہ عورتوں سے کم ہو۔“ شمع کے طنز یہ زبین کی سٹی گم ہو گئی۔ دادی کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے شمع کے لفظ سے تو دل کر چوکھٹ تھا م لی۔ زبین کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا اور ہونٹ بالکل سفید۔ وہ شمع کی طرف ہاتھی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اور عاجزی و آہستگی سے کہنے لگی۔

”خدا کے واسطے شمع باجی..... اس روز جو کچھ بھی میرے منہ سے نکلا تھا وہ سب.....“

”سب کیا؟“ شمع نے دلچسپی سے زبین کی طرف دیکھا۔ زبین کے لب آپس میں پیوست ہو گئے اور آنکھیں بھر آئیں۔

”میں آپ کی منت کرتی ہوں، آپ اس بات کا چرچا کسی سے مت کیجئے گا۔“ وہ گویا گڑ گڑا رہی تھی۔

”لو..... ہم تو تمہاری مدد کا سوچ رہے تھے۔ اور تم ہو کہہ تھیا ر ڈال رہی ہو۔“ اس سارے جملے میں زبین کا ذہن ”ہم“ پہ جا کر اٹکا تھا۔

”ہم.....؟“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

”ہاں، میں اور مانا.....!“ شمع کی بے پروائی دیدنی تھی۔ دادی کے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا پر سماعتیں ابھی سن رہی تھیں۔

”کیا.....!“ زبین کی ہلکی سی چیخ نکلی۔ ”آپ نے انہیں بھی بتا دیا۔ یہ آپ نے کیا کیا شمع باجی۔!“ زبین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”دیکھو ایسے معاملات دبانے کے نہیں ہوتے۔ بہت اچھا کیا کہ تم نے مجھے بتا دیا۔ اس میں تمہارا قصور تھوڑی تھا۔ یہ تو ایک خوفناک حادثہ تھا جو خدا نخواستہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح اگر جرم کو چھپایا جائے تو مجرموں کو اور شہ ملتی ہے اور جرم پھیلتا ہے۔ تم اس واقعے کو منظر عام پہ لا کر نہ صرف اپنے لیے انصاف لے سکتی ہو بلکہ اپنی جیسی بہت سی لڑکیوں کی عزت کی حفاظت بھی کر سکتی ہو۔“

لگا ہوا ہے لیکن آنکھ کھل بھی سکتی ہے۔“ شمع نے ماں کو ڈرایا۔

”اگر اس کی آنکھ کھل بھی جائے تو وہ ہمارا کیا کر لے گی۔ اس وقت وہ ہمارے رحم و کرم پہ ہے۔ ہم جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

”کچھ ویسا نہیں ہوگا۔“ ظہور یکدم بیچ میں آکر بولا۔ اس کے ساتھ فرزان بھی تھا۔ شمع اور ارشاد بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔

”جو کچھ بھی دادی چھوڑ کر گئی ہیں سب کچھ زمین کا ہے۔ دادی کی خواہش تھی کہ زمین کی شادی ہو جائے اور ہم ضرور دادی کی خواہش پوری کریں گے۔“

”اے، ہے..... ذرا دیکھو تو اسے۔ زمین سے لگلا نہیں اور آیا ہے بڑا سر بیچ بن کر۔ تم ابھی بچے ہو تمہیں نہیں پتا کہ معاملات کیا ہیں۔“ ارشاد بیگم نے بیٹے کو رعب سے ڈپٹا۔

”معاملات کچھ بھی ہیں مگر ان چیزوں پہ ہمارا کوئی حق نہیں۔ اگر ہم یہ لیں گے تو ابو کے حصے میں سے زمین کو بھی حق دینا پڑے گا۔“ ظہور کے فلسفے پہ ارشاد بیگم کو غصہ تو بہت آیا پھر کڑوا گھونٹ پی کر بولیں۔

”میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی اور تم کیا زبان سی کر کھڑے ہو۔ تمہارے سامنے وہ اس قدر زبان درازی کر رہا ہے اور تم سے یہ نہیں ہوتا کہ اس کا منہ ہی توڑ دو۔“

”ظہور بالغ اور باشعور ہے ماما..... میں اسے ہٹ دھرمی سے نہیں روک سکتا۔“ ارشاد بیگم تلملا کر رہ گئیں۔

”تو گویا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ہٹ دھرمی کر رہی ہوں۔“

”فی الحال ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ڈرائنگ روم میں اب بھی آپ کی جان پہچان کی عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ کچھ تلخ وترش سنیں گی تو کیا کہیں گی۔ ساس کا ابھی چہلم بھی نہیں ہوا اور آپ بڑا رے کی باتیں کرنے لگی ہیں۔“ فرزان کی دلیل یہ ارشاد بیگم کے ہونٹ سل گئے۔ گویا ان کے پاس اب کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگیں۔

”نہ جانے اس منحوس نے ایسا کون سا جادو کرایا ہے

تمہارا ہی ہے۔ جس طرح میری باقی بیٹیاں ہیں۔ آج سے تم میرے لیے اسی طرح ہو۔“ آنسوؤں کا سیلاب تھا جو منہ کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ رو رو کر بے مال زمین صدے سے بے ہوش ہو گئی۔

”افسوس تو اس بات کا ہے کہ میرے گھر میں موت واقع ہو گئی اور بہو نے آکر دنیا دکھاوے کے لیے ہی جھوٹ موٹ کے دوا آنسو بھی نہ بہائے۔ گلی محلے کے لوگ تھو تھو کر رہے تھے مجھ پر..... اب کیا میں اسے اس گھر میں سمھنے دے دوں گی۔ جس نے میری اس قدر جگ ہنسائی کرائی۔ طلاق نہ دلوائی ہو اسے تو ارشاد نام نہیں ہے میرا۔“

”دادی کا ابھی چہلم بھی نہیں ہوا ہے ماما! اور آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ کم از کم کچھ تو خیال کریں۔“ شمع نے دبے دبے لفظوں میں ماں کو روکنا چاہا تو ارشاد بیگم ہنک کر بولیں۔

”ارے کون سا سالہا سال سے وہ یہاں رہ رہی تھیں۔ کون سا وہ میری سگی ساس تھیں۔“ ارشاد بیگم ساس..... اچانک نمودار ہوئیں اور اچانک اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اللہ کی حکمت میں کون دخل دے سکتا ہے۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ اچھی خاصی عمر تھی۔ اللہ نے مٹی سمیٹ لی۔ نو جوان آنا فنا چلے جاتے ہیں۔“ ماں کی سفاک اور بے رحم گفتگو پہ شمع کو ٹھیک ٹھاک حیرت ہوئی پھر وہ اگلے ہی پل سر جھٹک کر بولی۔

”میں تو بھی تھی آپ کو زمین سے حقیقی محبت ہو گئی ہے..... مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نظر آ رہا ہے۔“ بیٹی کے درست خیال پہ ارشاد بیگم ہنس دیں۔

”چہلم ہو جائے بڑھیا کا..... فرزان سے کہا ہے میں نے مجھے گاؤں لے کر چلے۔ سنا ہے چالیس مرلے کا گھر ہے جو یہ لوگ وہاں چھوڑ کر آئی تھیں۔ رجسٹریاں دیکھ لی ہیں میں نے۔ بڑھیا مرتے مرتے اچھا خاصہ اثاثہ چھوڑ کر گئی ہیں۔ بیس پچیس تو لے تو سونا ہی ہے جو صندوق سے برآمد ہوا ہے۔“

”آہستہ بولیں..... زمین کو بے شک نیند کا انجکشن

”خدا کے واسطے ماما..... تکلیفیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں۔ ہمیں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ کل کو ہم کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں تو یہی لوگ ہمارا مذاق اڑا رہے ہوں گے جن پر آج ہم ہنس رہے ہیں تب ہمیں کیسا لگے گا۔ کبھی سوچا ہے آپ نے.....؟“ وہ نہایت چڑچڑے سے انداز میں بولا تو ارشاد بیگم کو چپ ہونا پڑا یہ کہہ کر۔

”اللہ نہ کرے..... ہم پہ برا وقت آئے۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔“ ماں کی بڑبڑاہٹ فرزان نے بخوبی سنی تھی اور جل کلس کر وہاں سے پلٹ گیا تھا۔

”کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑتا مگر برے وقت سے پناہ مانگنی چاہیے۔“

اور برا وقت تو سر پر کھڑا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا۔ وہ اپنی سوچوں سے تھک گیا تھا۔ آخر یہ معاملہ ڈسکس کرے تو کس سے کرے۔ بینک نوٹس پہ نوٹس بھیج رہا تھا اور اب جو آخری نوٹس عدالت سے آیا تھا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ بینک کا چالیس لاکھ کا ڈی فالٹر ہو گیا تھا۔ بینک اس کی پراپرٹی پہ قبضہ کرنے والا تھا۔ وادی کا چالیسواں ہونے میں ابھی دن باقی تھے۔ علاقے میں ان کی اچھی خاصی حیثیت اور ویلہ تھی۔ چند دن میں اس ویلہ کو خاک میں مل جانا تھا۔ اگر چالیسویں تک بینک نے مہلت نہ دی تو واقعی سب کچھ خاک میں مل جانا تھا۔ اس نے بے چین ہو کر ٹپکتے ہوئے تھیلی پہ مکا مارا۔

”کیا تھا اگر جھوٹی انا اور ریا کاری کے لیے اتنا بڑا قدم نہ اٹھایا جاتا۔ میرا کی شادی تب بھی ہو جاتی..... پر ماما کو سمجھاتا کون.....؟ آخر کون سا راستہ نکالوں۔ اگر اس پراپرٹی کا نام لیتا ہوں جس کا ماہانہ کرایہ آرہا ہے تو بینک کا تو قرض اتر جائے گا لیکن کرایہ بند ہونے کی صورت میں گھر میں فاقے ہونے لگیں گے اور ماما جو ماہانہ اپنے پیروں کو نیاز میں پہنچاتی ہے اگر وہ بند ہو گئیں تو ماما جینا حرام کر دیں گی سوائے اس کہ عارضی طور پر ہی سہی ہم سب کرایے کی کوٹھی میں فی الحال رہائش پذیر ہو جائیں اور کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔“

اس نے وکیل سے مشورہ کرنے کے بعد بس یہی

تم پر کہ تمہیں بھی مجھ سے زبان چلانا آگئی ہے۔“ روحا کا خیال آتے ہی ارشاد بیگم کے مردہ وجود میں جان سی پڑ گئی۔

”ساس بہو کے تعلق پہ تم مجھے کیا نصیحت کرو گے۔ دیکھ لیے کر تو تم نے اپنی بیوی کے..... وادی ساس کا انتقال ہوا اور وہ آکر نہیں جھاکی۔ پیچھے تو اس کا ہے ہی کون ایک گھمنڈی باپ کے علاوہ.....!“

”آپ یہ بتائیں ہم میں سے کسی نے اسے اطلاع دی تھی.....؟“ فرزان نے بڑے سنبھل کر پوچھا تھا۔

”اے لو..... نزالی سنو۔ میت پہ بیٹھ کر روتے یا ٹیلی فون گھماتے۔ اسی شہر میں مر گڑ رہی تھی وہ مہینہ ہونے کو آیا ہے کیا اسے اطلاع ہی نہیں ملی ہوگی؟“

”میں نہیں جانتا اس بات کو۔“ فرزان یکدم اکھڑ سا گیا۔ ارشاد بیگم چونک گئیں۔

”بہر حال میں اتنا جانتا ہوں وہ لوگ اس شہر میں نہیں ہیں۔ عماد الدین کو ہارٹ افیک ہوا ہے۔ بائی پاس کے لیے روحا انہیں لندن لے کر گئی ہوئی ہے۔“

سمجھ کی چٹاری کا سن کر ارشاد بیگم کے کچھے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔

”اللہ کی لاشی بے آواز ہے جو کسی کو سستا ہے اس کے آگے ہی آتا ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑا میں پھر بیٹے سے مخاطب ہو کر بولیں۔

”اس کا مطلب ہے وہ تم سے رابطے میں تھی۔ تو تم نے ضرور اطلاع دی ہوگی اسے۔ کیا پھر اس نے مجھے تعزیت کا فون.....؟“ ارشاد بیگم نے جرم مسلط کرنے کی ایک اور شق نکالی۔

”میں نے کل فون کیا تھا اسے اور یہ اطلاع مجھے کل ہی ملی ہے۔ باپ کی طبیعت سنبھل جائے گی تو وہ ایک دو دن میں فون کر لے گی۔“

”کون بیٹھا ہے۔ اس سے تعزیت وصول کرنے کے چاؤ میں۔ اللہ وہ گھڑی لائے کہ وہ تعزیت قبول کرے۔ بڑھے کے پاس دولت بہت ہے، اپنی عمر بڑھانے کے لیے بائی پاس کرائے گیا ہوگا۔ ہارٹ افیک وارث افیک تو بہانے ہیں۔“

وہ خالی ہاتھ کھڑا تھا۔ کتنا کڑا وقت تھا..... چوری کا مال بھی کام نہ آسکا۔ بابو کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ فوری طور پر انہیں شہر لے جائیں۔ اب بابو کو مرنے کی دیکھا نہیں جاسکتا تھا کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بے بے نے اپنے بندے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔
”یہ میں نے آسیہ کے لیے بچا کر رکھے تھے مگر اس کڑے وقت میں اس سے بڑا آسرا ہوگا۔“
”مگر بے بے.....“

”ناں پتر..... دودن سے میں دیکھ رہی ہوں تو نے پیسہ پانی کی طرح لٹایا ہے یہ بھی تیرا بڑا احسان ہے۔ آخر تو پڑھ رہا ہے نوکری تو کر نہیں کر رہا۔ ہم تو تیرا احسان نہیں اتار سکتے۔“ اس کے وجود پہ منوں بوجھ آن پڑا سر جھک گیا، جو تلوں سے نگاہ ہی نہ ہئی..... کیا جواب دیتا، کیا کہتا۔
”لے جا انہیں بچا دے۔ آسیہ کی قسمت میں ہوا تو اس کا بیاہ ہو جائے گا۔ ورنہ اسی آگن میں بوڑھی ہو جائے گی۔“ بے بے کے آنسو اس کے وجود پہ پھر کی طرح پڑے تھے۔ اس نے وہ بندے جیب میں رکھ لیے۔
”سنا ہے یہاں ایک سار بیاج بھی دیتا ہے۔ کیوں نہ بیچنے کے بجائے گروی رکھوا دوں۔“

”ناں، ناناں۔ پتر! اس سے بہتر ہے تیرا بابو یو ہئی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دے..... پر میں اس پہ بیاج کا پیسہ نہیں لگاؤں گی۔“ پھر بے بے نے حیرت سے اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

”علی زمان پتر! بیاج کے بارے میں تو سب کچھ جانتا ہے..... پھر بھی تو نے ایسی بات کی۔“ علی زمان گڑبڑا گیا اور کچھ شکوہ کناں انداز میں بولا۔

”برے وقت میں اللہ نے بھی حرام کو حلال کو.... بتایا ہے۔ کیا اللہ کو نہیں پتا کہ ہم فاقوں مر رہے ہیں۔ کہاں سے کرائیں بابو کا علاج؟“ وہ اللہ سے ناراض تھا۔

”ناں پتر! ابھی ہمارے یہ ایسا وقت نہیں آیا۔ اور اگر آ بھی گیا تو ہم موت کو گلے لگالیں گے پر ایسا نہیں کریں گے۔ جانے تو کیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ میں نے تو اس سے بھی کڑا وقت دیکھا ہے۔ پر اللہ سے کبھی شکوہ نہیں کیا۔“

”لکا لکا تھا۔ ماما کی جڑی جمع رقم دے کر عارضی طور پر وہ ایک کوٹال بھی دیتا تو تین ماہ کے بعد سود سمیت قسط تیار تھی اب وہ سود بھرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ جب سے یہ معاملہ شروع ہوا تھا۔ کاروبار بالکل ٹھپ ہو گیا تھا۔ بقول ماما یہ سب روحا منحوس کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اس کا پاؤں ہی بھاگوان نہیں تھا۔

”بھاگوانی تو ہر انسان کی قسمت کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ صرف ایک روحا کی بدولت سب کی قسمتیں ٹھپ ہو گئیں۔ یہ کتنی فضول بات ہے۔ دادی ٹھیک کہتی تھیں اور یہ سچ ہے، سود کی لعنت بہت بری ہے۔ اس سے لال مزید کچھ برباد ہو، مجھے یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا..... مگر ماما کو کون سمجھائے گا اور ان سے گھر خالی کون کروائے گا۔“ یہاں آنے پر فرزان پھر بال نوچنے لگا تھا۔

اسی اثنا میں موبائل فون بجایا..... نمبر دیکھ کر فرزان کی ساری تھکن ساری الجھن منٹوں میں غائب ہو گئی۔ اس وقت ثنا ہی وہ واحد سستی تھی جو اسے ہر قسم کا سکون فراہم کر رہی تھی۔ ذہنی اور جسمانی..... سکون..... ثنا کی قربت میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہمسفر روحا تھی..... مگر..... دکھ سکھ کی سا بھی ثنا بن جائے گی یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

ثنا کے ساتھ اس کا رشتہ ہی کیا تھا۔ محض دوستی کا اور یہ دوستی تمام حدود عبور کر چکی تھی۔ حلال و حرام کی تمیز دونوں کے مابین ختم تھی۔ اور یہ اب عام رواج تھا..... کوئی کسی کو نہیں ٹوکتا تھا پھر اسے کون کیا کہتا۔ ایک گناہ سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ دوسرے گناہ میں غرق ہو چکا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی..... وہ سکون کے لیے ثنا کا ہی در لکھنٹا تھا۔ اب بھی اسے ثنا کی قربت کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔ مس کال اسکرین پہ براجمان تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ اسکرین پہ رکھ دیے اور اس کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگا۔

آٹھ ہزار لے کر جب وہ گاؤں پہنچا تو بابو کی حالت اتنی خراب تھی کہ انہیں فوری طور پر اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ دودن میں ہی آٹھ ہزار کا کچھ پتانہ چلا۔ تیسرے دن

کا عقیدہ، ایمان، جو ڈمگ گیا تھا۔

صوفی درویش بابا نے کہا تھا کہ اب زندگی میں اسے کبھی مایوسی نہیں ہوگی..... مگر ناکامی اور مایوسی تو اس کے گرد پھیلی جارہی تھی۔ بے بے کے کہنے سے وہ گھر سے نکل تو گیا مگر مسجد میں نہ گیا۔ اور باہر برگد کے درختوں کے سائے میں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے یہی معمول بنالیا۔ نماز کا وقت ہوتا تو گھر سے نکل جاتا۔ کبھی یونہی ٹہلتے ٹہلتے گھر واپس آ جاتا۔ کبھی کھیتوں میں چلا جاتا اور کبھی نہر کے کنارے بیٹھا رہتا۔ نہ وہ آسیر سے بات کرتا تھا اور نہ ہی بے بے سے۔ سارا دن گھر میں افسوس کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔

آج صبح جب وہ منہ دھو رہا تھا تو ڈاکیا اس کے نام کا خط ڈال گیا۔ اس نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لیٹر کاغذ سے تھا۔ اس نے جلدی جلدی لیٹر کھولا۔ پرنسپل نے اسے کالج میں غیر حاضری اور مشکوک سرگرمیوں کی بنا پر طلب کیا تھا۔

”کون سی مشکوک سرگرمیاں.....!“ وہ اپنے ذہن پر بوجھ ڈالنے لگا۔ وہ رضوان کے موبائل کی چوری تو یکسر بھول گیا تھا۔ اندیشہ یہی گزرا..... شاید آج کل دہشت گردی کی وجہ سے داڑھی والے طالب علموں کو خصوصی نگاہ میں رکھا جا رہا ہے۔ کالج انتظامیہ کو اس پر شک نہ ہو گیا ہو۔ اگلے روز وہ کالج میں تھا۔ پرنسپل صاحب نے چوری کے الزام میں اسے ڈس مس کرنے کا نوٹس دے دیا تھا۔ اس پر چوری طویل بحث اور بیانات کے بعد ثابت ہوئی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ جو موبائل وہ شاہد اور اکرم کو بیچ کر جا رہا ہے وہ موبائل وہ اپنے استعمال میں رکھیں گے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی جگہ پر رہتے ہوئے رضوان اپنے موبائل کو پہچان نہیں پاتا۔ اسی بات پر چھینا جھٹی ہوگئی اور نوبت گالم گلوچ سے ہاتھ پائی پہنچ گئی اور معاملہ ایک دوسرے کو مارنے تک پہنچا۔ اس صورت حال میں دونوں فریقین کو جب پرنسپل کے آفس میں طلب کیا گیا تو شاہد اور اکرم کے پاس اپنی خلاصی کے لیے سوائے علی زمان کا نام لینے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

رضوان کا اس بات پر یقین کرنا محال تھا کہ علی زمان

”پھر تجھے کیا ملا ہے؟“ وہ سرخ چہرے اور ناراض آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تو پہلے بھی غریب تھی اور آج بھی غریب ہے۔“

”ہاں..... غریب تو میرا مقدر ہے۔ تو شاید ٹھیک ہی کہہ رہا ہے مگر علی زمان پتر، ہمارے پاس صرف دنیاوی دولت ہی تو نہیں ہے۔ ایمان کی دولت تو ہے ناں ہمارے پاس۔ ہم اس اللہ کے بندے ہیں جس نے ہمیں خود اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ پتر! اللہ چاہتا تو ہمیں حیوان بھی بنا سکتا تھا پر اس نے ہمیں انسان ہی بنایا۔ پھر مسلمان گھرانے میں پیدا کیا اور سب سے بڑھ کر اپنے محبوب ﷺ کا امتی بنایا۔“ یہ کہتے ہوئے بے بے کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ بے بے ہمیشہ ہی ایسی باتیں کیا کرتی تھی۔ یہ بے بے کی ہی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ پانچ وقت کا نمازی ہر برائی سے مبرا مومن مسلمان تھا..... مگر آج اسے یہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ بے بے کو کہے کہ وہ چپ ہو جائے پر بے اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ اس کی بے زاری پورے وجود سے عیاں تھی۔ اتنے میں ڈاکٹر نے آکر ایسی ہولناک خبر سنائی کہ وہ دم بخود رہ گیا۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے پر جب بے بے کو دیوار پر ہاتھ مارتے دیکھا کہ وہ اپنی کلائیوں میں پڑی کالج کی چوڑیاں توڑ رہی ہے تو وہ سر تاپاؤں کا نپ گیا۔ بے بے کو سنبھالتا آیا سوکھ ادھر بابو کی جہیز و تدفین کی تیاری بھی اسی کے سر پر تھی۔ بے بے نے غم سے نڈھال ہونے کے باوجود لوگوں کو خبر ہی نہ ہونے دی اور سارے انتظام چکے چکے کر لیے۔

بابو کی موت کے بعد وہ بالکل غمگن ہو کر رہ گیا تھا۔

بے بے دیکھ رہی تھی وہ علی زمان جسے اس نے سات سال کی عمر میں مسجد کا راستہ دکھایا تھا جو کوئی بھی نماز قضا نہیں کرتا تھا۔ پچھلے چند دن سے بالکل بھی نماز نہیں پڑھ رہا تھا۔ بے بے تو یہی بھی صدے سے نڈھال ہے پر وہ دل ہی دل میں اللہ سے ناراض تھا... اور اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ اللہ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

کچھ تھا ایسا جو اس کے اور اللہ کے تعلق میں حائل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کیا تھا جو اسے اللہ سے دور کر رہا تھا۔ اس

ملائمت سے کہہ رہی تھی۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ میں اس طوفان کو نہیں روک سکتا۔ مجھے کچھ دن کے لیے ہی سہی غائب ہونا پڑے گا لیکن ماما کو وہی طور پر تیار کرنے کے لیے مجھے ایک مجبوری کا خط بینک کے کسی بھی اقدام سے پہلے ماما کو بھیجنا ہوگا۔ تاکہ وہ پہلے سے ہی تیار ہو جائیں اور بینک کی کارروائی کے دوران داویلا مچا کر اہل محلہ کو اکٹھا نہ کریں۔“

”اس کے لیے تمہیں چاہیے کہ تم پہلے ہی کرایے کی کوٹھی کا انتظام کرو اور خط میں انہیں پتا وغیرہ بتا دو تاکہ یکبارگی جو دربدری کا احساس انہیں ہو وہ فی الوقت قہم جائے اور انہیں بیٹھنے کے لیے ٹھکانا میسر آجائے۔ ورنہ وہ چند عورتیں کہاں ماری ماری پھریں گی۔ ویسے بھی تمہارا چھوٹا بھائی ظہور، بقول تمہارے نہایت بے پروا اور غیر ذمے دار لڑکا ہے۔“ ثنا کی بات فرزان کی خوب اچھی طرح سے سمجھ میں آئی اور وہ ثنا کے ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔

”جج میں بار تم نے آئیڈیا بہت اچھا دیا ہے۔ ایسا کرنے کے بعد میرے دل پہ زیادہ بوجھ بھی نہیں رہے گا۔“

”تمہارے دل پہ بوجھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ یہ جو کچھ بھی برباد ہوا ہے یہ تم نے نہیں کیا۔ تمہاری ماں کی غلط پالیسیوں اور طرز زندگی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ تم اپنے دل پہ کیوں بوجھ رکھ رہے ہو۔“ ثنا کی باتیں واقعی اسے ہمت دل رہی تھیں۔

”اور یہ قدم تمہیں جلد از جلد اٹھانا پڑے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو تم گھر میں پڑے ہو اور پولیس گھر خالی کروانے آجائے۔“ یہ کہہ کر ثنا خود ہی ہنس دی۔ فرزان نادام سا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے، میں آج ہی جانے کی تیاری کر لوں گا۔“ وہ اٹھنے لگا تو ثنا نے محبت و نرمی سے اسے واپس لٹا دیا۔

”کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ فرزان کی آنکھوں میں واری سے دیکھ رہی تھی۔

ایسا کر سکتا ہے لیکن انہوں نے پرنسپل کو یقین دلایا کہ وہ اس آٹھ ہزار میں بچ کر گیا ہے۔

اب علی زمان کی طلبی ضروری ہو گئی تھی۔ وہ پرنسپل کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ دائیں طرف رضوان اور بائیں طرف شاہد اور اکرم تھے۔ وہ کیا کہتا کہ اس نے یہ موبائل شاہد اور اکرم کو نہیں بیچا تھا..... یا چوری کر لیا تھا۔ موبائل میں اکرم اور شاہد نے بے منت کی ادائیگی کی ریکارڈنگ کر رکھی تھی۔ جس کے بعد کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔ اسے بھی پرنسپل نے یہی دکھایا تھا۔ شاہد آٹھ ہزار ہزار کے نوٹ گن کر اسے دے رہا ہے۔ وہ تو اس وقت اس قدر حواس باختہ تھا کہ اس نے اس حرکت کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔ پیسے لے کر اس نے جیب میں رکھے تھے اور اکرم اور شاہد سے ہاتھ ملا کر جا رہا تھا۔ پرنسپل نے نہ صرف اسے بلکہ اکرم اور شاہد کو بھی کالج سے نکال دیا تھا۔ انہوں نے جرم کو تقویت دی تھی..... بجائے اس کے وہ پرنسپل کو آکر فوراً بتاتے۔ انہوں نے تیس ہزار کے موبائل کو آٹھ ہزار میں خرید کر بھرمنا نہ فعل کیا تھا۔ اکرم اور شاہد کو ذرا برابر بھی پروا نہیں تھی۔ ایک سفارشی فون انہیں واپس لاسکتا تھا..... مگر اس کے پیچھے تو کسی کی بھی سفارش نہیں تھی۔ وہ رو..... کر گڑگڑا کر پرنسپل سے مہلت مانگ سکتا تھا لیکن اس فعل کے بعد شرمندگی و مذمت اور افسوس نے اسے کچھ بھی نہ کرنے دیا اور وہ سر جھکائے ہوئے آفس سے نکل آیا۔ رضوان نے اس سے کوئی بات نہیں کی وہ اپنا موبائل پانے کی خوشی میں اپنے دوستوں میں لگن ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ امیر باپ کا بیٹا تھا، دونوں کی کمپنی اہم تھی ہی کتنی..... فقط روم میٹ ہی تو تھے۔ مزاجوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔

وہ کالج سے باہر نکل آیا اور اپنا سامان لے کر فٹ ہاتھ پہ بیٹھ گیا۔ اب اس کی برداشت جواب دے چکی تھی۔ سر زانو پہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر وہ رونے لگا۔

”سوائے اس کے تم اس شہر سے فی الحال چند روز کے لیے ہی سہی چلے جاؤ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔“ ثنا، فرزان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے نرمی اور

”تم کیا سمجھتے ہو۔ میں تم جیسے کنگال کو اپنے گلے کا ہار بناؤں گی۔ یہ تمہاری بھول ہے مسٹر فرزان۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تم اپنے کروڑ پتی سر کے اکلوتے داماد ہو۔ آج نہیں تو کل تمہیں اس ساری دولت کا مالک بننا ہے۔ میں ہرگز بھی تمہیں روحا سے پیچھا چھڑوانے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ مجھے روحا سے دلچسپی نہیں، اس کے باپ کی دولت سے دلچسپی ہے۔ وہ باپ بٹی پاکستان آجائیں، تمہیں میں سیٹھ عماد الدین کے گھر بھیجوں گی۔ تم سیٹھ عماد الدین سے اپنے کیے کی معافی مانگو گے، ان کی دلجوئی کرو گے۔ ان کے دل میں پھر ان کے گھر میں اور پھر ان کے کاروبار میں اپنی جگہ بناؤ گے۔ بھی تو ثنا تمہارے ساتھ عیش کی زندگی گزار سکے گی اور روحا کو ایسا ہی رہنا چاہیے۔ گھمنڈی اور بد اخلاق تاکہ وہ کبھی تمہاری توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔ جو کچھ ثنا نے تمہیں دیا ہے روحا وہ تمہیں کبھی نہیں دے سکے گی۔“

”اے..... کہاں کھوئی ہوئی ہو۔“ ثنا کو طویل خاموش پا کر فرزان نے آنکھیں کھولیں اور اس کے گال کو چھوا۔ ثنا یکدم چونک گئی اور مسکرا کر بولی۔

”ہیں نہیں..... بس تمہاری باتیں اتنی الجھا دینے والی ہوتی ہیں کہ میں اب بھتی چلی جاتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں فرزان کی ہنسی بھی شامل تھی۔

فیکے کو ملکوں نے شہر بھجوا دیا تھا اور اسے مکمل اپنی حراست میں لے رکھا تھا۔ ملکوں فیکے پہ مختلف قسم کے تشدد کر کے یہ اگلوانے میں ابھی تک ناکام تھا کہ اس نے زہین اور اس کی دادی کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ چونکہ فیکا خود بھی نہیں جانتا تھا اس لیے ملکوں کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ ادھر افروز اور پیر علی نے فیکے کی گمشدگی پہ کھرام مچا رکھا تھا۔ سارے گاؤں کو یہی حیرت تھی اچانک سیدھا سادہ سافیر کا کہاں غائب ہو گیا۔

”آج سے پہلے تو گاؤں سے کوئی اس طرح غائب نہیں ہوا۔ ضرور زہین کے آسیب نے فیکے کو غائب کر دیا ہوگا۔“ افروز کی ایک ہی منطق تھی۔ پیر علی بیوی کی منطق پہ زچ ہو گیا تھا۔

جب تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ تم میرے مہمان ہو۔“ فرزان اس احسان اور محبت پہ نہال ہی تو ہو گیا۔ ثنا کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لیں اور جذب سے کہنے لگا۔

”تم نے میری ساری پریشانیاں ختم کر دی ہیں ثنا۔ قسم سے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا عورتیں اتنی ذہین بھی ہوتی ہیں۔ ماما گو کہ بہت ہوشیار ہیں لیکن صرف اپنے مفاد کے بارے میں ورنہ وہ کسی کا بھلا نہیں کر سکتیں۔ روحا نہایت بے وقوف اور گھمنڈی عورت تھی۔ جو واش روم میں جانے کا مشورہ بھی اپنے باپ سے لیتی تھی۔ ایسی عورت بھلا میرے دکھ سکھ کیا سنتی اور کیا ریلیف دیتی مجھے..... نری ٹینشن ہوتی ہیں ایسی خواتین بہت اچھا ہوا کہ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی۔ اب مجھے اس کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ اور ماما جو ہر وقت محاذ کھولے رکھتی تھیں۔ اب میری بڑی بڑی غلطیوں کو بھی نظر انداز کر دیتی ہیں۔ اکثر جب میں صبح گھر جاتا ہوں تو ماما مجھ سے یہ تک نہیں پوچھتیں کہ میں ساری رات کہاں رہا جبکہ شادی کے بعد جب میں کمرے میں جاتا تھا تو ماما کو دورے پڑنے لگتے تھے۔ کوئی ایک رات بھی انہوں نے مجھے روحا کے ساتھ ڈھنگ سے گزارنے نہیں دی۔ صبح دن نکلتا تو یہی کہتی نظر آتیں۔ زن مرید کمرے میں پڑا رہتا ہے۔ گھر کا ماحول خراب کر رکھا ہے۔“

”چلو اب کم از کم تمہارے باہر رہنے سے گھر کا ماحول تو ٹھیک ہوا۔“ ثنا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”اور اب مکمل گھر سے غائب ہو جاؤ گے تو ماحول بالکل فریش ہو جائے گا۔“ نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔ فرزان کا ذہن روحا کی طرف چلا گیا۔

”گھمنڈی عورت.....! اس نے مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اصل میں ساری خرابی کی وجہ صرف ماما ہی نہیں روحا بھی ہے۔ میں ان مسائل سے جان چھڑوا لوں پھر میں روحا سے بھی مستقل پیچھا چھڑوا لوں گا۔“ فرزان نے یہ الفاظ نہایت غصے اور سختی میں کہے تھے۔ ثنا کے دل کو کچھ ہوا اور وہ فرزان کا دل اپنی چکنی چیزیں باتوں سے بہلانے لگی پر اس کا دل خود الجھ رہا تھا۔

”بھلیے لو کے..... زمین کے جن نے کیا دادی
زمین کو بھی غائب کر دیا ہے۔“ وہ چڑ کر کہتا تو افروز
بچانے کی کوشش کرنے لگتی۔

”وہ دونوں دادی پوتی بہت ہوشیار تھیں بھاگ گئی
یہاں سے۔ مجھے لگتا ہے وہ کسی دوسرے پنڈ میں چلی
گئی ہیں۔“

”آس پاس کے سارے ہی پنڈ کھنگال ڈالے
تھیں۔ کہیں اتا پتا نہیں ملا ان کا۔ آسمان نے اٹھالیا زمین
کے گئی، سمجھ نہیں آتا۔ بسا بسا یا گھر، یوں بے فکری سے
چھوڑ کر دادی پوتی چلی کہاں گئیں۔“ پیر علی اپنی الجھن میں
گرفتار تھا۔

”ٹھیک ہے، ایک نہ ایک دن تمہیں بھی یقین
آجائے گا میں جو کہتی ہوں سچ ہے کہ نہیں بے چارہ بھولا
بھالافیکا۔ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگا۔“ افروز
محبت جتانے لگی تو پیر علی نے جل کر بیوی کی طرف دیکھا۔
”یہ دعا کر کہ وہ زندہ ہو..... یوں اس طرح جوان
بندے کا غائب ہو جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔“

”پیر علی..... پیر علی، ملکو تجھ سے ملنے آیا ہے۔“
سارا دن گاؤں کے مرد اور عورتیں ان سے ملنے آتی
رہتی تھیں۔ فیکے کے غائب ہو جانے کا افسوس سبھی کو تھا۔
لیکن ملکو جیسے انسان کو بھی فیکے جیسے کیڑے مکوڑے کی پروا
ہوگی۔ پیر علی نے سوچا ہی نہیں تھا وہ تہ بند سنبھالتا ہوا
جوتوں کے ہی دروازے کی طرف لپکا۔ ملکو گھر میں داخل
ہو رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد ملکو نے پیر علی سے فیکے کے
بارے میں پوچھا تو غم و بے بسی سے پیر علی کا سر جھک گیا۔
ملکو اس کے غم اور صدمے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو
زمین کی خیر خبر لینے آیا تھا۔ ادھر ادھر نگاہ ڈال کر ملکو نے
کہا۔

”سنا ہے تو نے اس کا بیاہ بھی کر دیا تھا۔ اس کی زانی
کیا تیرے گھر میں رہ رہی ہے.....؟ پیر علی کو زمین کے ذکر
پر غصہ آ گیا۔

”بھاڑ میں گیا بیاہ اور زانی..... ہم تو اس کا بیاہ
کر کے ہی پچھتائے۔ جس دن سے اس کا بیاہ کیا تھا
معبیتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا تھا۔“ یہ کہہ کر پیر علی رونے

لگا۔ ”اور پھر اچانک ایسی مصیبت آئی کہ وہ گھر سے غائب
ہو گیا۔ ہم تو یہی سمجھے کہ زمین کے گھر چلا گیا ہوگا۔ لیکن نہ
جانے وہ کہاں گیا کچھ پتا ہی نہ چلا۔“

”اور اس کی زانی.....؟“ ملکو نے کھوجنے والی
نگاہیں پیر علی کے چہرے پر ڈال دیں۔

”پتا نہیں کہاں چلی گئیں..... ان دونوں دادی پوتی
کو بھی بہت ڈھونڈا مگر کچھ پتا ہی نہیں چلا۔“

”ان کے رشتے داروں میں پوچھا ہوتا۔ آس
پڑوس کے پنڈ میں یا کوئی شہر میں رہتا ہو۔ جس کے پاس
وہ چلی گئیں ہوں۔“ ملکو مکمل تحقیق کر رہا تھا۔

”ہم نے تو کبھی کسی کو شہر سے ان کے گھر آتے

جاتے نہیں دیکھا۔ بچپن سے جوان ہو گئے ہم..... ہم نے
کبھی زمین کی دادی کو ایک رات بھی پنڈ سے باہر گزارتے
دیکھا ہو۔ کوئی نہیں اٹھا اس کا۔ یہی پڑی رہتی تھی۔ نہ جانے
اب کہاں دفنان ہو گئی۔“ پیر علی کی بے چینی اور بے بسی
پہ ملکو کو پورا یقین ہو گیا کہ وہ زمین کے بارے میں کچھ نہیں
جانتا۔

”فقیر علی کی تھانے میں رپورٹ لکھوا رکھی ہے میں
نے۔ پولیس ڈھونڈ رہی ہے اسے۔ فقیر علی مل جائے گا تو
ان کا بھی اتا پتا معلوم ہو جائے گا۔“ تھانے کی رپورٹ پہ
ملکو ذرا سا چونکا پھر تہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”اوہ، جھلیا آج تک ان پولیس والوں نے کبھی
گاؤں کا بھلا کیا ہے جواب تیرے کام آئیں گے۔“ وہ خود
کو مطمئن کر رہا تھا یا پیر علی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ یکدم پیر علی
کہنے لگا۔

”اب وہ والی بات نہیں رہی ہے۔ ایس ایچ او اور
انسپکٹر بڑی دلچسپی لے رہے ہیں اس کیس میں انسپکٹر کہہ رہا
تھا اگر بندہ بازیاں نہ ہوا تو ڈی آئی جی نے پورے عملے کو
معطل کر دینا ہے۔ یہ تو ان کی وردی کا سوال ہے۔“ ملکو
کے چہرے کا رنگ متغیر سا ہوا اور وہ باعجلت گھر سے نکل
گیا۔

”اللہ کرے تیرا بھائی مل جائے۔“ نہ جانے کس
دل سے ملکو نے یہ بات کہی تھی۔ پر اس سے وہاں ٹکانہ گیا
اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

میں بولی۔ ”کتنی بار انسپکٹر نے تجھ سے پوچھا تھا تجھے کسی شک ہے تو بتا دے۔“

”تو گویا میں سیدھا ملکوکا نام لے دوں۔“ پیر علی ہاتھ ہی نہیں دے رہا تھا۔

”تجھے کس نے کہا ہے کہ تو اس کا نام لے۔ تو صرف آج کا واقعہ سنا جا کر۔ جس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ فقیر علی کا افسوس کرنے نہیں آیا تھا۔ اس کی زبانی کا پوچھنے آیا تھا۔ وہ پولیس والے ہیں خود ہی راستہ نکال لیں گے۔“ افروز کی بات کچھ کچھ پیر علی کی سمجھ میں آرہی تھی۔



زمین آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہی تھی۔ شمع نے زبردستی دو ہفتے کا ڈاکٹر کا کورس مکمل کرایا تھا جس سے اس کی کمر کا درد بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ اب پہلے کی طرح رونق آئی جا رہی تھی۔ بردادی کے غم سے وہ اب بھی مجسم غمناک تھی۔ کم صدم ہی اکیلے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ دادی اپنا کیا کچھ چھوڑ کر چلی گئی تھیں اسے بالکل خیال تک نہیں تھا۔ ارشاد بیگم نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا۔

”زمین کو میں نے بچا ہوا ہے ناں..... بیاہ لوں گی۔ کسی بھی غریب فقیر کو دیکھ کر..... پھر بچہ کچھ میرا۔“ وہ لپچائے ہوئے انداز میں گاؤں والے گھر کی رجسٹریاں دیکھ رہی تھیں۔

”بہت زعم تھا بڑا دھیا کو حلال کی کمانی کھانے اور کھلانے کا۔“ بوقت سے کام کروا رہی تھیں۔ اس پہ انہیں اللہ یاد نہ آیا۔ چلی تھیں میرے عیبوں کو میرے بچوں کے سامنے کھولنے۔ چلو..... یہ باب تو بند ہوا اور اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ پر میں اس کا پتا جلد ہی صاف کروں گی۔ روشن بیگم کو بلایا ہے میں نے کوئی بھی رشتہ بے آئے نکاح کے تین بول پڑھا کر چلتا کروں گی۔“ زمین نے اتفاقاً یہ الفاظ سن لیے۔ وہ بتی وق رہ گئی۔ وہ کم عمر بھی تھی اور کمزور اور تنہا بھی کیا کہتی۔ کہاں جاتی، سوائے اس گھر کے تو کوئی سہارا نہیں تھا۔ شمع کو اس نے صرف یہیں تک بتایا تھا کہ اس کی عزت تار تار ہوئی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ وہ بتا ہی نہ پائی تھی۔ کاش دادی بتا دیتیں کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ کس طرح بتائے گی اور کیا وہ لوگ اس کا

”تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے پیر علی..... تو نے ملکوکو یہ کیوں نہیں بتایا کہ پہلے زمین اور اس کی دادی غائب ہوئی ہیں۔ گاؤں والوں نے ان کے جانوروں کو زنجیروں سمیت پھرتے دیکھا تھا۔ جب فیکے کو پتا چلا تو وہ خود ان جانوروں کو گھر واپس باندھنے گیا تھا۔ اس کے بعد فیکا واپس نہیں آیا اور یہی بیان تو نے انسپکٹر کو بھی لکھوا رکھا ہے۔“

”ملکو کو سیدھی بات بتانے میں تجھے کیا فائدہ تھا۔“ پیر علی، افروز سے چڑ گیا۔

”اس کا نام ملکو ہے ملکو۔ گاؤں والوں کی طرح سیدھا سادہ آدمی نہیں ہے وہ کہ یہ قیاس کرے کہ فیکے کو بھوت لے گیا ہوگا۔ بھوت نے فیکے جیسے لاغر اور کالے کا کیا کرنا تھا۔ بھوت کو لے جانا ہوتا تو اس کی زبانی کو لے کر جاتا۔ پروہ بھی اکیلے غائب نہیں ہوئی اپنی دادی کے ساتھ غائب ہوئی ہے۔“

”ملکو بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ بے شک وہ ہماری مدد نہ کرے مگر اس فکر میں تو جتلا ہوگا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ وہ فیکے کو نہ سہی ان دادی، بیتی کو دھوڑنے کی ضرورت کو پیش کرے گا۔ جو فیکے سے پہلے غائب ہوئی ہیں۔“

”تو نے دیکھا نہیں اس کی دیکھی۔ فقیر علی سے زیادہ اس کی زبانی میں تھی۔ نہ جانے کیا چکر ہے مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“ پیر علی سر تھام کر بیٹھ گیا۔ افروز ہمدردانہ انداز میں شوہر کے نزدیک ہو کر بیٹھ گئی۔ اور چپکے سے بولی۔

”یہ بات بھی تو انسپکٹر کو ضرور بتا دینا کہ اس طرح ملکو آیا تھا اور وہ فیکے کی زبانی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ملکو صحیح آدمی نہیں ہے۔ کہیں کچھ اس نے تو گزبڑ نہیں کر رکھی۔“ افروز کے قیاس پہ پیر علی یکدم اچھل سا گیا۔ زندگی میں پہلی بار افروز نے کوئی گہری اور سنجیدہ بات کی تھی۔

”نہیں..... نہیں میں پولیس کے آگے ملکو کا نام نہیں لے سکتا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان لوگوں سے دشمنی لینا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”تو تجھے کس نے کہا ہے کہ تو سیدھا جا کر ملکوکا نام لے دے۔“ افروز چڑ گئی اور شوہر کو بھڑکانے والے انداز

”میری بلا سے جہنم میں جائے۔۔۔ پر میں اسے ایک
پل اپنے گھر میں نہیں رکھوں گی۔“

”صبر کریں ماما! حوصلہ کریں۔“
”ارے کیسا حوصلہ۔۔۔ ایسے ہی کل کو کوئی اجڑا ہنوار
آ کر ہمارے گلے پڑ گیا تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری
اس کالونی میں۔ نہ جانے کس اٹھائے گیرے سے نکاح
پڑھوایا ہوگا اس کا۔“ ارشاد بیگم کا غصہ کم ہی نہیں ہونے میں
آ رہا تھا۔

”چلی تھی پولیس میں اپنی مظلومیت کا پرچا
کنوانے۔ میڈیا سے اور تنظیموں سے ہمدردیاں لینے۔
یوں ملتے ہیں انصاف۔۔۔ اندر خانے تو دیکھو کیا گل
کھلا رکھے ہیں۔ اگر نکاح اسی سے پڑھوا رکھا ہوا جس نے
عزت کی حیثیت کی ہوگی تب کیا ہے اس کے پاس۔ ہے
پھر وہ مظلوم۔۔۔! پھر کیوں نہ گھر بسالیا اس کے ساتھ۔۔۔
یہاں کیوں آئی۔ مجھے اس لڑکی کے عزائم صحیح نہیں لگ
رہے ہیں شمع۔۔۔ ہٹ جاؤ تم میرے سامنے سے۔ اس
سے تو میں ابھی سارا بچ اگلا کر رہوں گی۔ ضرور کام کراتی
ہوگی یہ وہاں۔ جب کسی نے مارنے کی دھمکی دی ہوگی تب
یہاں بھاگ آئی ہے۔ ہنو میرے آگے ہے۔“

”ماما! پلیز ریلیکس۔ آپ کا بی بی شوٹ کر جائے گا
پلیز! ساری بات ایک طرف۔ یہ سوچیں کہ زمین لاوارث
ہے اور اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ عیش و عشرت کی
زندگی گزار سکتی ہے۔ آپ بے وقوفی کر رہی ہیں اسے
یہاں سے نکالنے کی۔“ یکدم ارشاد بیگم کے اعصاب
ڈھیلے پڑ گئے، شمع کو حوصلہ ہوا۔

”پلیز! ریلیکس۔۔۔۔۔ ٹھنڈے دل سے سوچیں جو
وقت گزر گیا ہے وہ تو نہیں آتا لیکن جو وقت آنے والا
ہے۔ اسے ہم ہاتھ سے کیوں گنوائیں۔ زمین گنوار ہے اور
بزدل بھی۔ وہ یہ سب کچھ ہم سے کبھی نہیں مانگے گی۔ اسے
تو صرف تحفظ چاہیے۔ صرف ایک تحفظ کے عوض ہم سب
کچھ اس کا لے سکتے ہیں۔“ ارشاد بیگم کی سمجھ میں شمع کی
بات آگئی تو وہ نڈھال سی ہو کر صوفے پہ بیٹھ گئیں۔ پھر
بہت دیر کے بعد تفکر بھرے لہجے میں بولیں۔

”پراس پہ نگاہ رکھنا ہوگی تمہیں۔ وہ ہمیں ہاتھ بھی

”ہاں یہ کیا۔۔۔؟ اچانک رجسٹریوں کے اندر
نکلنا تو ارشاد بیگم چونک گئیں۔ ارشاد بیگم
لیکن کچھ سمجھ لیتی تھیں۔
”شمع دیکھنا یہ کیا ہے؟“ شمع نے ہاتھ میں پرچا پکڑا
تو وہ ان روئی۔

”تو نکاح نامہ ہے ماما۔۔۔۔۔ زمین کا نکاح نامہ۔
کسی نے اس کا نکاح ہوا ہے۔“ شمع نے تعجب سے
ماں کو دیکھا اور پھر کہنے لگی۔

”ادامہ دادی تو کہتی تھیں کہ وہ زمین کی شادی کرنے
کی طرف سے یہاں شہر۔۔۔ آئی ہیں مگر زمین تو شادی شدہ
ہے۔ شمع کے الفاظ ارشاد بیگم کے دماغ پر ہتھوڑے کی
طرح لگنے لگے اور وہ سیکنڈوں میں ہی معاملے کی تہ تک
پہنچ گئیں۔

”اور۔۔۔۔۔ تو اب میں سمجھی کہ قصہ کیا ہے۔ ضرور
بڑھیا لے پوتی کا عیب دبانے کے لیے کسی سے نکاح
پڑھوا رہا ہوگا اور پھر پول نہ گل جانے کے ڈر سے پوتی کو
یہاں بھاگ آئی۔ کل کو اس کا ختم اسے ڈھونڈنا ہوا
یہاں تک۔ آگیا تو مصیبت کس کے سر پر آئے گی۔“ یکدم
ارشاد بیگم کو جلال آ گیا۔

”یہ دھڑکا تھا بڑھیا کو بھی تو صدمہ لے بیٹھا
ابھی۔“

”ات تو یہی ہے۔۔۔۔۔ دادی گئیں تو زمین کے
صدمے سے ہی ہیں۔“ شمع کو اچانک ہمدردی ہوئی تو
ارشاد بیگم کو صدمہ آ گیا۔

”اس وقت تو موت نہ آئی بڑھیا کو جس وقت پوتی
نے گل کھلایا تھا۔ اب ہمیں پتا چلا تو وہ صدمہ نہ
سہا سہا۔ میں ابھی اور اسی وقت اس کلمہ ہی کو اس گھر سے
نکال رہی ہوں۔“

”ابھی، ارشاد بیگم کے عزائم جان کر دیوار سے لگ
گئی اور تھر تھر کانپنے لگی۔ شمع نے فوراً ماں کو پکڑا۔
”کیا ظلم کر رہی ہیں ماما۔ وہ بے چاری کہاں جائے

کی

کے چکر ہی ختم نہیں ہوتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم سے چھپ کر بیوی سے مراسم بنارہا ہو۔“ شمع کی یہ بات ارشاد بیگم کے دماغ میں گولی کی طرح لگی۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ سن سی ہو گئیں۔ پھر جیسے ہوش سا آیا تو بگڑ کر بولیں۔
”نمبر دو اس کا..... ابھی پوچھتی ہوں کہاں ہے۔“
شمع نے نمبر ملا کر ماں کو دے دیا۔

”تمہارا فون بج رہا ہے فرزان.....“ ثناء نے فون اٹھا کر فرزان کو دیا تو اس نے ٹی وی کی آواز کم کر دی۔

”ماما کا فون ہے۔“ وہ ثناء کی طرف دیکھنے لگا۔
”ہاں، تو بات کر لو ان سے۔ یہی موقع ہے صحیح بات کرنے کا۔“ ثناء کانوں میں آدیزے ڈالتے ہوئے کہنے لگی تو فرزان ڈبل ماسند ڈھالت میں نظر آنے لگا۔

”میں سوچ رہا تھا بجائے ماما کے شمع آپا سے بات کر لیتا ہوں۔“

”کم آن۔“ ثناء اس کی بڑولی سے بے زار نظر آنے لگی۔ ”فی الحال تم اپنی ماں کو سلی دو کہ تم دوسرے شہر میں ہو اور شام تک گھر آ رہے ہو۔ شام تک بہن کو فون کر دینا۔“
”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے فون اٹینڈ کیا۔

”کیسی ہیں ماما آپ..... ٹھیک ہیں؟“

”میں نے فون کر لیا تو تمہیں میری خیر خیریت یاد آ گئی۔ دو دن سے کہاں غائب ہو؟“

”بس..... وہ ایک پریشانی آ گئی تھی اچانک۔ جس کی وجہ سے مجھے اسلام آباد آنا پڑا۔“

”کیسی پریشانی؟“

”بس آپ دعا کریں۔ معاملہ درست ہو جائے۔“

”ارے کیا معاملہ..... کیا کہہ رہے ہو تم.....؟“

ارشاد بیگم کو یکدم بے چینی نے آن گھیرا۔

”میں آؤں گا تو آپ کو بتاؤں گا۔“

”تم مجھے ابھی بتاؤ..... کیا پریشانی ہے تمہیں؟“

”اب میں فون پہ اتنی لمبی بات نہیں کر سکتا۔ بس

آپ دعا کریں۔ ہم ہر طرح کے نقصان اور خسارے سے بچ جائیں۔“

”ہائیں، نقصان، خسارہ..... کیا بول رہا ہے

تو.....؟“ ارشاد بیگم اتنا بولی ہو گئیں۔

دکھا سکتی ہے۔“ شمع ہنس دی۔ یکدم زمین اتنی قیمتی ہو گئی تھی کہ ارشاد بیگم کو اس کے بھاگ جانے کی فکر لاحق ہو گئی۔

”کچھ نہیں ہوتا۔ اور وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ آپ اپنا موڈ ٹھیک کریں۔ میں اسے بلا کر لاتی ہوں۔“ شمع اندر کمرے میں آئی تو زمین کا رنگ زرد پڑ رہا تھا اور وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

”ماما کو ایسا ہی غصہ آتا ہے۔ تم ڈرو نہیں، آفرآل وہ تمہاری بھی ماں ہیں۔ ماما ہم پہ بھی تو غصہ کرتی ہیں۔ کیوں گھبرا رہی ہو تم۔ کم آن! ماما کی تو عادت ہے۔ خود کو نارمل کرو۔ کچھ نہیں ہوتا۔ ماما جیسا کہہ رہی تھیں ایسا کچھ نہیں کریں گی۔ بے فکر رہو تم۔ بس اگر تمہیں اس گھر میں خوشی خوشی رہنا ہے تو جیسا ماما کہتی ہیں ویسا ہی کرنا ہو گا۔“ شمع سمجھاتے ہوئے اسے ماں کے پاس لے آئی۔ ارشاد بیگم صوفے کی پشت پہ سر ڈالے پڑی تھیں۔ اسے سامنے دیکھ کر سیدھی ہو گئیں۔ زمین کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔

”شمع ٹھیک کہتی ہے۔ بس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“ ارشاد بیگم دل ہی دل میں مسکرائیں۔ پھر نرمی سے شمع سے کہنے لگیں۔ ”میری طبیعت صحیح نہیں ہے مجھے آرام کرنا ہے۔ تم لوگ جاؤ.....“ شمع زمین کو لے کر واپس آ گئی۔

”دو دن ہو گئے ہیں کچھ ہے اپنے صاحبزادے کی فکر آپ کو.....؟“ شمع نے ناشتا کرتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ تو ارشاد بیگم بے پروائی سے بولیں۔
”ظہور ابھی تو ناشتا کر کے گیا ہے تمہارے سامنے۔“

”میں ظہور کی بات نہیں کر رہی۔ فرزان کی بات کر رہی ہوں۔“

”گیا ہو گا کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر۔“

ارشاد بیگم کی بے پروائی عروج پر تھی۔

”کچھ زیادہ ہی شہر سے باہر کام نہیں ہونے لگے

ہیں اس کے..... اچانک کون سا ایسا بزنس کر لیا جو شہروں

”میں ابھی دوبارہ فون کرتا ہوں ساری ڈیٹیل بتاتا ہوں آپ کو۔“ فرزان نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی اور فون بند کر دیا۔

”مائی گاڈ.....!“ فرزان نے گہری سانس خارج کی۔ ثنا اس کے پہلو میں آئی تھی اُسے حوصلہ دینے لگی۔

”اب دو گھنٹے کے بعد فون کر کے تم اپنی بہن کو ساری بات بتا دو گے۔“

”مگر ابھی کراپے کی کوٹھی کا تو بندوبست تو ہوا نہیں۔“ فرزان پریشان نظر آنے لگا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں جا رہی ہوں اچھے پوش علاقے میں رہائش کا بندوبست کرا دیتی ہوں۔“

”مگر ایڈوائس کے بغیر کون رہائش دے گا۔“

”ذرا ذرا سی باتوں کی فکر کرتے ہو تم۔ اتنا تو مال ہوگا تمہاری ماں کے پاس کہ ایڈوائس کی مدد میں فوری ادا کر سکیں۔“ یہ کہہ کر ثنا گھر سے نکل گئی۔ فرزان شش و پنج میں بیٹھا رہا۔

”تین بج گئے ہیں اور اس نے ابھی تک فون نہیں کیا۔“

”تو تم ہی ملا لو۔“

”کئی بار ملا چکی ہوں... مگر فون بند ہے۔“ شمع نے اطلاع دی تو ارشاد بیگم کو خلیجان ہونے لگا۔

”نہ جانے کس پریشانی میں ہے میرا بچہ۔ تم اس ظہور کو تو فون ملاؤ۔ گھر پہ کوئی بھی آفت آجائے اسے پروا ہی نہیں ہوتی۔ بس اپنی ضرورتیں پوری کرنے کا پتا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ میرا دل نہ جانے کیوں ہول رہا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔“

”بے فکر رہیں کچھ نہیں ہوتا۔ ظہور ابھی آ رہا ہے اور میں دوبارہ فون کرنی ہوں فرزان کو۔“ ابھی شمع ہی رہی تھی کہ شمع کا فون بج گیا۔ فون فرزان کا ہی تھا۔

”فرزان کا فون ہے۔ آپ بات کریں گی یا میں کروں؟“ یہ کہتے ہوئے شمع نے فون آن کیا تو فرزان شمع سے مخاطب ہو کر بولا۔

”شمع آپا میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں اور جو

بیٹے نے بھی۔ گردن پہ چھری چلی تو ظہور کے..... آخری
اولاد تھی اس لیے۔ کیا میرا کوئی حصہ نہیں تھا اس گھر میں۔
کیا حق بنا تھا آپ کا بیٹی بیاہنے کے لیے دوسری اولاد کے
سر سے چھت چھیننے کا۔ مجھے میرا حصہ چاہیے..... حق
چاہیے مجھے میرا۔ میں یہ گھر سب سے پہلے چھوڑ کر جا رہا
ہوں مگر اپنا حصہ آپ سے وصول کر کے رہوں گا۔“ ارشاد
بیگم سکتے کی سی کیفیت میں صوفے پہ بیٹھی تھیں آنکھیں
چھت سے جا لگی تھیں۔ ماں کی یہ حالت دیکھ کر شمع بھائی
پہ چلائی۔

”اس مصیبت کے وقت تمہیں ہمارا سہارا
بنا چاہیے۔ تم کس طرح ہمیں چھوڑ کر جاسکتے ہو۔ پھر کیا
حق بنا ہے تمہارا حصہ مانگنے کا۔ شرم نہیں آتی تمہیں ایسے
وقت میں ایسی باتیں کرتے ہوئے۔“ ظہور نے شمع کی
ایک نہیں سنی اور وہ گھر سے اپنا سامان نکالنے لگا۔ یکدم
ارشاد بیگم صوفے پہ گریں اور ڈھیر ہو گئیں۔
”ماما..... پاپی خود کو سنبھالیں۔“ شمع چلاتے
ہوئے ماں کی طرف بڑھی۔

گھر سے سارا سامان جا چکا تھا بس کچھ قیمتی چیزیں
تھیں جنہیں لے کر ارشاد بیگم دگر فزنی بیٹھی تھیں۔ شمع،
صبا، سمیرا، ماں کی تسلی اور دلاسے کے لیے ارد گرد ہی بیٹھی
تھیں۔ ارشاد بیگم کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے
رہے تھے۔

”اب بس بھی کریں ماما، دو دن ہو گئے ہیں آپ کو
روتے ہوئے۔ مصیبت سر پر آئی کھڑی ہے۔ سوائے اس
کے کہ ہم اس گھر کو چھوڑ دیں اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔“
”وہ مجھ سے بات کرتا تو میں کوئی نہ کوئی دوسرا راستہ
نکال لیتی مگر اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا..... کچھ نہیں
سنا اور اتنا بڑا فیصلہ کر دیا۔ ایک ایک اینٹ کو اپنی محبت سے
سیچا تھا میں نے۔ کیسے، کیسے، اس گھر کو چھوڑ کر چلی
جاؤں۔“ ارشاد بیگم یہ کہہ کر بھوٹ بھوٹ کر رونے
لگیں۔ بیٹیوں کے بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کئی دن سے میں دیکھ رہی تھی کہ فرزان آپ سے
بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ کچھ پریشان بھی تھا۔ پھر اچانک

بات میں آپ سے کر رہا ہوں وہ تسلی سے سنیں پھر ماما کو
بتائیں۔“ ارشاد بیگم کو فون جھپٹنے کی بے چینی تھی۔ شمع نے
رکنے کا اشارہ کیا اور فرزان کی بات سننے لگی۔ شمع، فرزان
کی بات سن رہی تھی اور اس کے چہرے کے زاویے متغیر
ہو رہے تھے۔ ارشاد بیگم کا دل ہول رہا تھا۔ پانچ منٹ کے
بعد فون بند ہو گیا۔ شمع کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور منہ اتر
گیا تھا۔ اتنے میں ظہور بھی آ گیا۔

”ارے کچھ بتاؤ گی بھی یا یونہی منہ لٹکا کر بیٹھی
رہو گی۔ خدا کے واسطے شمع جو کچھ بھی ہے مجھے بتا دے۔ میرا
دل بند ہو جائے گا۔“

”میں یہ سوچ رہی تھی بات کرنے سے پہلے سمیرا اور
صبا کو بھی بلا لیتی ہوں۔“

”کیوں..... ایسا کون سا نذرانہ آئے والا ہے.....
“ ارشاد بیگم سنتا نہیں۔ شمع نے توقف کیا اور پھر
ظہور کی طرف منہ کر کے کہنے لگی۔

”فرزان کہہ رہا تھا۔ سمیرا کی شادی پہ بینک سے جو
قرض لیا تھا وہ بینک کو لوٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔
روز بروز بینک کا دباؤ بڑھتا چلا گیا اب فوبت بیا گئی ہے کہ
بینک کو جو پراپرٹی شوکرانی تھی، بینک وہ قرضے کی مدد میں
لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ اس
نے بہت ہاتھ پاؤں مارے یہاں تک کہ سفارش کے لیے
اسلام آباد تک آیا ہے مگر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر گھر خالی نہ کیا
تو کرپشن اور غبن کا الزام آ جائے گا۔ اس لیے میں جلد
از جلد یہ گھر خالی کرنا ہو گا۔“

”کیا.....؟“ ارشاد بیگم کے سر پر چھت آن گری۔
”پھر ہم جائیں گے کہاں.....؟“ ظہور جذباتی
ہو کر بولا تو شمع کہنے لگی۔

”فرزان نے فی الحال کرایے کی رہائش کا
بندوبست کر دیا ہے۔“ پھر اپنا فون ظہور کی طرف کرتے
ہوئے بولی۔ ”ایڈریس ایس ایس ایس کیا ہے اس نے،
پڑھ لو۔“ ظہور ایڈریس دیکھنے لگا پھر اس نے غصے سے فون
صوفے پہ پھینک دیا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ تھا تمہارا کماؤ کیوت۔ اب ہو گیا سکون۔ بنی
بنائی چیز کو گنوا کر عیش کی زندگی تم نے بھی گزار لی اور اس

دادی کا حادثہ ہو گیا۔ شاید اسی وجہ سے.....“

”مت نام لو اس بے غیرت کا میرے سامنے۔ میں تو اس کی شکل تک نہیں دیکھوں گی۔ کما کر تو کیا کھلاتا.....“ التاسر سے چھت ہی چھین لی۔“ حالانکہ سب کیا دھرا ارشاد بیگم کا تھا مگر وہ الزام بیٹے کو دے رہی تھیں۔

”میں تو اس کی شادی کر کے ہی پچھتائی، جادو سے اس کی عقل بھی باندھ دی اس ڈائن نے۔ عماد الدین اور اس کی بیٹی کو جب پتا چلے گا تو ان کی بغلیں بج جائیں گی۔ ہائے کیسے جگ ہنسائی کا موقع دے دیا کم بخت نے۔ ہرگز گھر میں گھسنے نہیں دوں گی اسے۔ مجھ پہ کڑا وقت آن پڑا تو وہ دوسرے شہر میں جا کر بیٹھ گیا۔ اگر اتنا ہی ہمدرد اور غم گسار تھا ہمارا تو اس وقت اسے ہمارے پاس ہونا چاہیے تھا۔ مگر دیکھو جس فرزان کے میں گن گایا کرتی تھی جس کے پیچھے میں غیور احمد کو بھی بھول گئی، اس لخت جگر نے میرے ساتھ ایسا کیا۔ ہمارا بھرم ختم کر دیا میرا..... کمبخت ایسی شادی کی تھی کہ ہاتھ سے جاتا ہی جا رہا ہے۔“

”یہ تو اچھا ہی ہے کہ رو جا بھائی اس وقت اس شہر میں نہیں ہیں.....“ ورنہ ماما تو نہ جانے کیا کر دیتیں“ شع نے دل ہی دل میں ہول کر سوچا۔ ظہور بارن پہ بارن بجا رہا تھا۔

”رات بہت ہو گئی ہے اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔“ صبا نے ماں کو اٹھایا۔ ارشاد بیگم کے دونوں داماد بھی سامنے ہی کھڑے تھے۔ وہ شکستہ قدموں سے گھر سے باہر نکلیں۔ روتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

”بس کریں ماما! اس ڈرامے کو لوگ دیکھیں گے تو واقعی سمجھ جائیں گے کہ ہم یہاں سے دیوالیہ ہو کر جا رہے ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت بھرم باقی رہتا ہے اسے تو نہ ختم کریں۔“ ظہور بری طرح جھنجھلا رہا تھا۔ ظہور شروع سے ایسا ہی تھا۔ ارشاد بیگم کو چپ ہونا پڑا۔ یہ بڑی بات تھی کہ اس نے ایسے وقت میں ان کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ ورنہ وہ پہلے ہی دن حصہ مائلنے کھڑا ہو گیا تھا۔ ارشاد بیگم اور ان کی بیٹیاں جانتی تھیں..... اس کی کھوپڑی گھومتی تھی تو کوئی منہ نہیں لگتا تھا۔ پہلے ارشاد بیگم کی گاڑی نکلی پھر باقی لوگ

UrduPhoto.com

بھی فرضی اسپتال کا نام لے دیتی ہوں۔“
 ”ہاں..... تاکہ وہ لوگ مجھے ڈھونڈنے نکل جائیں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہاری بات بھی کرا دوں گی۔ تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ تمہاری ٹانگ میں فریکچر ہوا ہے۔ تم کچھ دن یہیں رکو گے۔ کسی فرضی دوست کی تمہارے گھر والوں سے بات کرا دیتے ہیں کہ تم اس کے یہاں ٹھہرے ہو اور بس..... ہفتے دو ہفتے میں گھر والوں کا غصہ کم ہوگا۔ اس طرح تمہیں ہمدردیاں بھی ملیں گی اور تمہاری واپسی کا کوئی نہ کوئی راستہ بھی نکل آئے گا۔“ فرزان اس تجویز پر راضی ہو گیا۔ ثنائے گھرفون ملایا فون شیخ نے اٹھایا تھا۔

”میں جناح اسپتال اسلام آباد سے بول رہی ہوں، ڈاکٹر شہناز! فرزان حیات محمد آپ کے کیا لگتے ہیں.....؟“ ثنائے کچھ اس پیشہ دارانہ انداز میں کہا کہ شیخ کے سچے لگ گئے۔

”کیا ہوا ہے فرزان کو.....؟ فرزان میرا بھائی ہے۔“

”گھبرائیے نہیں۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“
 ”ہائے اللہ..... وہ خیریت سے تو ہیں۔ ماما..... ظہور،“ شیخ نے چلانا شروع کر دیا۔ گھر میں بھگدڑ مچ گئی۔

”ثنائے ریسور فرزان کے کان سے لگا دیا۔“
 ”ماما..... فرزان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اسلام آباد سے فون ہے۔“

”پھر..... مر گیا وہ؟“
 ”ہائے اللہ نہ کرے.....“
 ”تو پھر کیوں شور مچا رکھا ہے.....؟“
 ”ماما، وہ دوسرے شہر میں اکیلا ہے نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا۔ اسے ہماری ضرورت ہے۔“

”مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ ارشاد بیگم کا خراٹ لہجہ ابجرا۔ ”بے شک وہ وہاں مرجائے۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنے نہیں جاؤں گی۔ کس کا فون ہے؟ اسے کہہ دو، وہ ہمارا کچھ نہیں لگتا۔“ شیخ یقیناً رورہی

مختلف سواریوں میں ان کے تعاقب میں چلے۔ اس سارے حادثے میں زمین نہایت سراسیمہ اور خاموش تھی۔

”مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ لوگ کرایے کی کونشی میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ اب تمہیں اطمینان ہو جانا چاہیے۔“
 ثنائے فرزان کو مطمئن کر رہی تھی۔
 ”تمہیں نہیں پتا ثنائے ماما نے کتنا ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہوگا۔ ان کا بس نہیں چل رہا ہوگا کہ میں سامنے آ جاؤں اور وہ مجھے شوٹ کر دیں۔ نہ جانے اب تک کتنی گالیاں کوسنے انہوں نے مجھے دے لیے ہوں گے اور کوئی بعید نہیں میرے سب بہن بھائی میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔“

”مگر تم کسی کا کچھ لے کر تو نہیں بھاگے۔ جو کچھ بھی کیا ہے تمہاری ماما کا کیا دھرا ہے۔“
 ”مگر وہ لوگ تو یہی سمجھ رہے ہوں گے نا کہ میں لے کر بھاگ گیا ہوں کوئی بعید نہیں ماما نے یہ الزام بھی روجا کے سر پر رکھ دیا ہو۔ ویسے بھی ان کے خیال سے روجا کا منحوس پن ہماری زندگیوں میں مشکلات ہی پیدا کر رہا ہے۔ بھلا کون سا وہ رہ رہی سی وہاں.....؟“
 ”اوہ..... ہو..... گویا بیوی سے ہمدردی ہو رہی ہے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے جذباتی ہو کر کہیں ماما روجا کے باپ کے گھر نہ چلی جائیں۔“
 ”تم ایسا کیوں نہیں کرتے، روجا سے اس کے باپ کا حال احوال لے لو۔ اس طرح ان کی آئندہ پلاننگ کا بھی پتا چل جائے گا۔“

”کمال کرتی ہو تم۔ ابھی گھر کا پھنڈا سلجھا نہیں اور میں روجا سے مراسم بڑھانے چل پڑوں تاکہ کل کو روجا وادی کا افسوس کرنے ماما کے پاس پہنچ جائے اور ماما کا اور روجا کا.....“

”بس، بس، بس..... ایک آئیڈیا ہے۔ اس وقت تمہیں کچھ ایسا کرنا ہے جس سے تمہیں ہمدردی حاصل ہو۔ میں فون پہ تمہارے گھر پہ اطلاع کرتی ہوں کہ تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور تم فلاں فلاں اسپتال میں ہو۔ کسی

جائے گا۔“ یہ کہہ کر شا کمرے میں نہ رکی اور باہر نکل گئی۔
فرزان ایسے ہی لیٹا رہا۔

”جتنی اچھی ہے شا، میرا کس قدر خیال رکھتی ہے۔
محض دوستی ہی تو ہے ہمارے مابین..... اسے پھر بھی میری
پریشانیوں کی فکر ہے۔ اور روحانیوی ہو کر..... کتنے مزے
میں لندن میں بیٹھی ہے۔ دنیا میں اسے اپنے باپ کے سوا
کسی سے محبت نہیں ہے۔ پھر میں اس سے بات کر کے کیا
کروں گا۔“ وہ قطعی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شام کو شام جب
گھر آئی تو وہ لیپ ٹاپ پر اپنا وقت گزار رہا تھا۔
”گلتا ہے مسز سے بات ہوئی ہے۔ جیفری فریش نظر
آ رہے ہو۔“

”کم آن شا، میں ایسی عورت کو ایسے وقت میں یاد
بھی نہیں کرنا چاہتا جس نے پلٹ کر میرے متعلق جاننے
کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کی زندگی کا محور اس کا باپ ہے
اور کوئی نہیں۔“

”اور یہی تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔“
”کیا مطلب؟“ شا کے منہ پر فرزان یکدم
چونک گیا۔

”ظاہری بات ہے جتنی توجہ اور محبت اس کا باپ
اسے دیتا ہے اگر تم اسے اس سے زیادہ دو..... تو وہ تمہاری
ہو جائے گی۔ اس وقت حد صرف تمہاری بیوی کو تمہاری
ضرورت ہے بلکہ تمہارے سر کو بھی تمہاری ہمدردی کی
ضرورت ہوئی اور تم یہ وقت گزار رہے ہو۔“

”مجھے کوئی لالچ نہیں ہے اس کی دولت کا.....!“
فرزان دو ٹوک انداز میں بولا۔

”مگر یہ سوچو اس کے سوا تمہارے پاس کوئی آسانی
کا راستہ بھی نہیں ہے۔“ شا کی بات فرزان کے دماغ میں
کیل کی طرح چھپی اور وہ الجھ سا گیا۔

”ٹھیک ہے، میں یہ نہیں کہتی کہ تم اپنی غیرت وانا کا
سودا کر کے ان کی چوکھٹ پہ جا کر جھک جاؤ، ابھی وقت
ہے۔ تم اپنے وقار سے مرسم بڑھا سکتے ہو..... جتنا وقت
گزرے گا تمہارے پول کھلتے چلیں جائیں گے۔ تمہاری
ماں کا دروازہ تم پہ بند ہو چکا ہے، تم اس وقت کو ہاتھ سے نہ
گنواؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نہ ادھر کے رہو اور نہ ادھر کے۔“

”جس نے اس مصیبت میں ہمیں اکیلا چھوڑ دیا۔
میری تو دعا ہے زندگی میں کبھی مصیبتیں اسے اکیلا نہ
چھوڑیں۔“ یہ کہہ کر ارشاد بیگم نے شمع کے ہاتھ سے فون
جھپٹا اور کچھ بولنا چاہا لیکن لائن کٹ چکی تھی۔ ارشاد بیگم
نے غصے سے فون پھینچ دیا۔ اور شمع کی طرف غصے میں دیکھ کر
بولیں۔

”میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں
ہے۔ تمہیں یاد ہے تمہیں میرے ساتھ چلنا تھا۔
وہاں کالونی میں کتنے لوگوں کے پاس اپنی رقم مری پڑی
ہے، وہ رقم نکلوانے جاتا ہے۔“ شمع نے آنسو صاف کرتے
ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”گھر کیا بدل لیا میں
نے، لوگ پیسہ لوٹاتے ہوئے غرانے لگے ہیں۔ یہی ڈرتھا
مجھے کہ گھر تو جا ہی رہا ہے۔ رقم بھی مر جائے گی اور وہی ڈر
سامنے آ گیا..... مگر میرا نام بھی ارشاد نہیں جو ایک ایک پائی
بیان سمیت وصول نہ کی ہو۔“

”کیا زمین گھر میں اکیلے رہے گی۔“ چلتے ہوئے
شمع کو خیال آیا تھا۔

”کون اٹھا کر بھاگ رہا ہے اسے تمہارے بھی تو
بچے ہیں گھر میں۔ بچوں کو سمجھا دو اچھی طرح۔ گھر سے باہر
نہیں نکلنا۔ نیا علاقہ ہے نئی جگہ ہے۔ ویسے بھی یہاں تو
آدم زاد کوئی نظر نہیں آتا۔ صبح شام گاڑیاں آتی جاتی دھتی
ہیں۔“ شمع، زمین اور بچوں کو سمجھا کر گھر سے نکل گئی۔
ارشاد بیگم پہلے نکل چکی تھیں۔

”ہونا تو یہی تھا۔ اب فکر مند ہونے کا کوئی فائدہ
نہیں ہے۔“ شا، فرزان کو حوصلہ دے رہی تھی جو سخت مایوس
نظر آ رہا تھا۔

”سچ تو ہے کہ گھر میں بند رہ کر میں بھی سخت
اکتا گئی ہوں۔ کیوں نہ کہیں گھومنے چلیں۔“

”تم چلی جاؤ..... میں بھلا کہاں جاسکتا
ہوں.....؟“ یہ کہہ کر فرزان بیڈ پر گر گیا۔

”اوکے، میری ایک دوست کا فون آیا تھا۔ مجھے
وہاں جانا ہے۔ تم مووی وغیرہ دیکھو۔ یا پھر ایسا کرو میری
غیر موجودگی میں اپنی بیوی سے باتیں کر لو۔ کچھ دل بہل

فرزان کا منہ کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”اگر ہمیں کرایے کے گھر میں ہی رہنا تھا تو کوئی چھوٹا موٹا گھر بھی لیا جاسکتا تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی کی نمائش ضرور کرنا تھی۔ کہاں سے بیس ہزار ماہانہ بھرے جائیں گے۔ ماما کا کل کرایہ ہی چالیس ہزار آتا ہے۔ بیس ہزار کرایے کے دے کر بجلی اور گیس کے بل اور کھانے پینے کے اخراجات ماما کسی طرح سے بھی پورا نہیں کر سکتیں۔ پھر ماما کے پیروں فقیروں کا جو حصہ ہے اگر ہر ماہ تین چار ہزار کا ان پہ خرچ نہ کریں تو ماما کی تو عبادت ادھوری رہ جاتی ہے۔ ایسے میں ماما تو ایک ایک روپے کو سوچ سمجھ کر اور جتا جتا کر خرچ کریں گی اور زندگی تنگ ہوگی ہمارے لیے۔“

ظہور، شمع سے الجھ رہا تھا۔

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ماما تو اپنی ساری اولاد سے بدظن ہو چکی ہیں۔ کل میرے بچوں کو بھی بری طرح ڈپٹ رہی تھیں۔ اگر ماما کا روٹہ ہنوز ایسا ہی رہا تو مجھے تو خود کچھ سوچنا پڑے گا۔“ شمع و لگرفتہ تھی۔

”ہاں، سوچ لینا۔ چھوڑ گیا ہے ناں تیرا میاں، بہت دولت..... زندگی میں تو اس نے اولاد پہ ایک روپیہ بھی خرچ نہ کیا اور تجھے اس کے جھکے کا سوال کر رہا ہے۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“

”میں خوب اچھی طرح سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم ہو ہی دولت کے پجاری۔ ایک سے بڑھ کر ایک مفاد پرست۔ تمہیں ماں کی قربانیاں یاد نہیں..... بس اپنی خواہشات کا پتا ہے۔ میرا گھر چلا گیا۔ لوگوں کو ادھار دیا پیسہ مر گیا۔ یہاں تک کہ ساری اولاد میں جو سب سے لائق تھا وہ دغا دے گیا۔ اور اب بھی تمہیں مجھ سے شکایتیں ہیں۔“

”شکایتیں ہمیں نہیں آپ کو ہیں ہم سے۔ حالانکہ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے آپ کو اس کا گریبان پکڑنا چاہیے..... مگر دن رات کی اذیت ہمارے لیے۔“ ظہور بھی غصے میں آ گیا۔ زہین ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھی۔ ماں بیٹوں کا جھگڑا دیکھ کر باہر نکل گئی۔

”تو چلے جاؤ یہاں سے۔ کس آس میں بیٹھے ہو.....؟“

”سوچیں ہم لوگ بھی چلیں جائیں گے تو کون رہ

”نشا کا کیا ہے۔ وہ تو غریب سی لڑکی ہے۔ وہ تمہاری مدد تو کر سکتی ہے مگر تمہیں فیوچر نہیں دے سکتی۔ اور جس شان سے تم زندگی گزار چکے ہو، اس سے نیچے آنا تمہارے لیے قدرے مشکل ہوگا۔ ویسے یہ تمہارا نجی معاملہ ہے۔“ یہ کہہ کر نشا کچن میں چلی گئی۔ فرزان سوچنے پہ مجبور ہو چکا تھا اور پھر بالآخر اس نے روحا کو پاس فون کھڑکا دیا۔

”کیسی ہو روحا.....؟“ وہ دبے دبے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ روحا کو تعجب ہوا اور وہ شکایتا بولی۔

”بڑی جلدی خیال آ گیا میرا۔“

”چلو مجھے تو خیال آ ہی جاتا ہے۔ تمہیں تو یہ بھی توفیق نہ ہوئی۔“ وہ الناس سے شرمندہ کرنے لگا۔

”کیسے فون کیا؟“ روحا کا لہجہ یکدم اجنبی ہو گیا۔

”انکل کی طبیعت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔ اب کیسی طبیعت ہے ان کی.....؟“

”اب وہ بہتر ہیں۔ ہم لوگ یہاں اسلام آباد میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ اگر میں کراچی آئی تو دادی کا افسوس کرنے ضرور آئی۔“ روحا کی اطلاع فرزان کو بہت خوشگوار لگی۔ ”اور میرا کسی سے ایسا تعلق نہیں تھا کہ میں فون یہ افسوس کر سکتی۔ تم سے بات ہو گئی تھی۔ اس لیے اس تکلف کی میں نے ضرورت نہیں سمجھی۔“

”بہت اچھا کیا تم نے جو کسی سے بات نہیں کی۔“

”کیا مطلب.....؟“ اس کی خوشگوار ریت پہ روحا کو

لہجہ بڑھا ہوا۔

”نہیں، میں تو ماما کے مزاج کے پیش نظر کہہ رہا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ کس جگہ رہائش ہے تم لوگوں کی کیونکہ آج کل میں اسلام آباد میں ہی ہوں، آیا ہوا ہوں تو انکل کی طبیعت ہی پوچھتا چلا جاؤں گا۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ روحا کے دل میں ننھا سا دھپ چلا اور وہ ایڈریس بتانے لگی۔

اس سے قبل روحا کوئی اور سوال کرتی۔ فرزان نے فون کاٹ دیا۔ صبح کی پہلی فلائٹ سے اسے اسلام آباد جانا تھا۔ نشا اپنے مشن کی کامیابی پہ دل ہی دل میں خوش تھی۔

غزل

صوفی شہر مرے حق میں دعا کیا کرتا
خود تھا محتاج عطا، مجھ کو عطا کیا کرتا
اپنی آواز کے سنائے سے ہول آتا تھا
میں بیابانِ تمنا میں صدا کیا کرتا
سانس لیتے ہوئے سینے میں جلن ہوتی ہے
میں ترے شہر کی شاداب فضا کیا کرتا
مقتسب، جرم مرا دیکھ کے خاموش رہا
خود خطا کار تھا احکام سزا کیا کرتا
اس فضا میں تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
میں یہاں جرات پرواز بھلا کیا کرتا
خود خاموشی کے صحراؤں میں گم تھا محسن
کوئی اس بے خبر جاں سے گلہ کیا کرتا

شاعر: محسن احسان

مرسلہ: جمیلہ بلوچ، لوہی

غزل

پیار کی راہ میں ڈر لگتا ہے
بڑا مشکل یہ سفر لگتا ہے
یہ اداسی کا فہم ہے شاید
پھیکا پھیکا سا قمر لگتا ہے
شب کا منظر ہے تری زلفوں میں
رخ پہ اک رنگ سحر لگتا ہے
بڑی خاموش ہے اس گھر کی فضا
کوئی آسیب ادھر لگتا ہے
طاہر فکر کو از فرش تا عرش
ایک لمحے کا سفر لگتا ہے
میں وہ انسان گزیدہ ہوں جسے
اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے
روز کہتا ہوں غزل میں یادِ روز
مجھے پیارا یہ ہنر لگتا ہے

شاعر: یادِ روز

مرسلہ: ماریہ عباسی، کراچی

جائے گا آپ کے پاس۔ کیوں کرتی ہیں آپ ایسی باتیں۔“

”چلی جاؤں گی اپنے پیروں کے آستانوں پہ.....
اور عمر بھر کے لیے وہیں ڈیرا ڈال لوں گی۔ کم از کم اس
زندگی سے تو جان چھوٹے لگیں۔“ اتنے میں ڈور بیل بجی۔
ظہور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ارشاد بیگم لال، بھھوکا چہرہ
لیے صوفے پہ ڈھے گئی۔ شمع پر مردہ سی ماں کی خدمت
کرنے لگی۔ اتنے میں ایک اچھی عمر کی اپ ٹوڈیٹ عورت
گھر میں داخل ہوئی۔ ان کے چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ
تھی اور ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔

”ہمارے پڑوس میں آنا مبارک ہو آپ کو۔“ وہ
خاتون سلام کے بعد شائستگی سے بولیں تو شمع نے انہیں
بٹھالیا۔

”مجھے تو کل ہی کامران نے بتایا کہ ماما! پڑوس والی
کوٹھی میں نئی فیملی آئی ہے۔ جب سے سوچ رہی تھی کہ چکر
لگاؤں مگر فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہ آپ کی مدر ہیں؟“
خاتون نے شمع سے ارشاد بیگم کے بارے میں پوچھا۔ جو
خاموشی سے دیدے بھاڑے عورت کو تک رہی تھیں۔
”جی.....“ شمع نے جمل ہوتے ہوئے کہا۔

”ماشا اللہ بہت اچھی فیملی ہے آپ کی۔“ عورت
خواتنواہ تعریفیں کرنے لگی۔ ارشاد بیگم جوں کی توں بیٹھی
رہیں۔ تو عورت کو اپنا بیٹھنا عجیب سا لگا۔
”اچھا میں چلتی ہوں۔“ وہ انھیں تو شمع جلدی سے
بولی۔

”ارے آپ بیٹھیں۔ پانی وانی تو پیئیں پہلی بار آئی
ہیں۔“

”کوئی بات نہیں اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ میرے
پاں کل خواتین کا میلاد شریف ہے۔ میں تو پیغام دینے آئی
تھی۔ کل آپ سب لوگ ضرور آئیے گا۔ پاکستان کی نامور
نعت خواں خواتین ہمارے یہاں آتی ہیں۔ آپ لوگ بھی
آکر ضرور لطف اندوز ہوئیے گا۔“

”ضرور، ضرور، کیوں نہیں۔“ شمع نے عقیدت سے
کہا اور خاتون کو باہر دروازے تک چھوڑنے آئی۔

”آج ان کے یہاں جاؤ گی، کل انہیں بھی بلانا

ہوئی۔ جو ہٹا بیگم اور لیس بتا کر گئی تھیں وہ ان کی بالکل ساتھ والی کوٹھی تھی۔

جب وہ لوگ پہنچیں تو محفل میلاد عروج پر تھی۔ اکثر خواتین کی نگاہیں زمین پر ستائشی انداز میں اٹھ اٹھ کر پلٹ رہی تھیں۔ سلام اور تبرک کے بعد وہ لوگ وہاں سے نکل کر آگئیں۔ زمین اور شمع کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ جن آنکھوں نے زمین کو دیکھا ہے وہ اس کے حسن پہ مر مٹی ہیں۔ تیسرے ہی روز بیگم اور لیس، بیگم ارشاد کے گھر میں تھیں۔ کچھ پشیمان اور شرمندہ دبے دبے لہجے میں اپنا مدعا بیان کرنے لگیں۔

”اصل میں بات یہ ہے کہ مجھے کہتے ہوئے شرمندگی بھی ہو رہی ہے اور افسوس بھی مگر میرے بیٹے نے کہا ایک بار جا کر میں پیغام دوں۔ پھر ماننا یا نہ ماننا آپ لوگوں کی اپنی مرضی۔“ ارشاد بیگم کو بیگم اور لیس کی حرکت پہ غصہ بھی آیا اور کوفت بھی ہوئی۔

”بہن میں آپ کی مشکل آسان کر دیتی ہوں۔ میری بڑی بیٹی شمع تو چار بچوں کی ماں ہے اور دوسری بھی شادی شدہ ہے۔“ اس بات پہ بیگم اور لیس ہنس پڑیں اور کھسیا کر بولیں۔

”آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھیں۔ میں کوئی رشتہ لے کر تھوڑی آتی تھی۔ میرا بیٹا تو ٹی وی ڈائریکٹر ہے۔ آج کل وہ مخصوص کمپنیوں کے ایڈیٹر رہا ہے۔ اکثر بڑی کمپنیوں کے کمرشلز اسے ہی ملتے ہیں۔ وہ نئے نئے چہروں کی تلاش میں رہتا ہے۔ کل گھر سے نکلتے ہوئے اس نے آپ کی چھوٹی صاحبزادی کو دیکھا تو مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں یہ تجویز آپ تک پہنچاؤں کہ آپ کی بیٹی کمرے کے سامنے آگئی تو تہلکہ مچا دے گی۔“ ارشاد بیگم کے سر پر دھماکا سا ہوا تھا۔ بیگم اور لیس فوراً معافی طلب لہجے میں بولیں۔

”ہو سکتا ہے آپ کو یہ بات اچھی نہ لگی ہو..... لیکن میں آپ کو بتاؤں اس فیملڈ میں بہت اچھے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں آرہی ہیں۔ خاص طور پر کمرشلز میں تو کچھ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ تو صرف ماڈلنگ ہے۔“ ارشاد بیگم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ بیگم اور لیس نادامی ہو گئیں۔

بڑے گا۔ یہاں کھانے کے لالے پڑ رہے ہیں اور یہ نبھائے گی تعلق.....!“ شمع واپس آئی تو ارشاد بیگم بڑبڑا رہی تھیں۔

”میں کون سا جاہی رہی ہوں۔ محض اخلاقاً کہہ دیا تھا میں نے تو۔“ شمع کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نہ جانے ارشاد بیگم کے دل میں کیا خیال آیا۔ شمع کو اچانک بلا کر کہنے لگیں۔

”کل بیگم اور لیس کے ہاں میلاد کا جو پیغام ہے۔ اسے مس نہیں کرنا بلکہ ایسا کرنا، زمین کو بھی ساتھ لے جانا۔ اب نئے علاقے میں آئے ہیں تو تعلق تو بنانا ہی پڑے گا۔ کھانا دانا نہ کھانا پہلے ہی آ جانا۔ آخر پتا تو چلے یہاں آس پڑوس کے لوگ کیسے ہیں۔“ شمع نے ماں سے بحث نہیں کی اچھی طرح سمجھ گئی ماں کا مقصد اپنے کاروبار کو نئی جگہ پہ ترویج دینا ہے۔ چپ چاپ حامی بھری۔ زمین گو کہ جانے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن شمع نے کہا۔

”تمہارے نہ جانے سے فرق تو کوئی نہیں پڑتا مگر ماما کہہ چکی ہیں۔ خواہ وہ ان کا موڈ خراب ہوگا اور میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں۔ تمہیں اگر اس گھر میں رہنا ہے تو ماما جو کہیں بس وی کرتی رہو۔ ویسے بھی آج کل ماما بہت ڈسٹرب ہیں۔ ان کے مزاج کے خلاف کچھ ہوگا تو اس کا مطلب ہے گھر میں لڑائی۔“ شمع تیار ہوتے ہوئے زمین سے کہہ رہی تھی۔ ناچار زمین کو بھی تیار ہونا پڑا۔ جب سے وہ شہر آئی تھی پہلی بار کسی کے ہاں جا رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ سادگی سے ہی تیار ہوئی۔ کالے رنگ کے کڑھائی والے سوٹ میں ہلوس انگوٹھے والی گولڈن چنل پہنے زمین کمرے سے باہر نکلی تو ارشاد بیگم اور شمع اس کے قیامت خیز حسن کو دیکھ کر سحر زدہ سی رہ گئیں۔ ارشاد بیگم نے تو کچھ نہ کہا۔ البتہ شمع نے دل کھول کر اسے سراہا۔ زمین کو بھلا اس ستائش سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اسے نوٹ کر داوی یاد آئیں اور اس کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے جو یوں اس کے بننے سنورنے پہ فریفتہ بھی ہوتی اور غصہ بھی کرتی تھیں۔ داوی اس طرح چھوڑ کر چلی جائیں گی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے چپکے سے سر جھکا کر آنسو پونچھ لیے۔ شمع چھوٹے بچے کو ساتھ لے کر زمین کے ہمراہ

کیمبرے کے لیے برقیٹ ہے۔ آپ بے فکر رہیں، جب وہ اسکرین پر آئے گی تو تہلکہ مچا دے گی۔“ ارشاد بیگم کی رضا مندی ملتے ہی کامران آڈیشن کی تیاری میں لگ گیا۔ سب سے پہلا مرحلہ اسے کسی اچھے پارلر میں لے جانا تھا۔ شمع کے ہمراہ کامران اسے پارلر میں لے گیا۔ اندر جانے کے بعد زمین پریشان سی ہوئی۔

”باجی..... آپ مجھے یہاں کیوں لائی ہیں.....؟“ وہ شمع سے پوچھ رہی تھی۔

”بے وقوف تمہیں گھر میں سمجھایا بھی تھا کہ تمہیں ٹی وی پہ لایا جا رہا ہے۔ تم ٹی وی پہ نظر آؤ گی۔ اس کے لیے ہی یہ سب تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

”مگر میں نے ٹی وی پہ نہیں آنا.....!“ زمین رو پڑی، شمع پریشان ہو گئی۔

”تم نے گھر میں تو انکار نہیں کیا اور تم یہاں آ کر یہ ڈرامے کر رہی ہو۔ بند کرو یہ ڈراما۔ لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں اور تم نے میرا ہاتھ کیوں پکڑ رکھا ہے۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔“ زمین آنسو صاف کرنے لگی۔

”گھر میں، میں نے آپ کی ماما کی وجہ سے نہیں کہا تھا۔ دراصل مجھے ان سے ڈر لگتا ہے..... لیکن میں ٹی وی پر نہیں آؤں گی۔ یہی غم تو دادی کو مجھ سے دور لے گیا۔“ زمین دبے دبے لہجے میں سسک رہی تھی۔ شمع نے دانت کچکچائے۔

”بے وقوف لڑکی، ٹی وی یہ تم ساری دنیا کو یہ تھوڑی بتانے جا رہی ہو کہ تمہارے ساتھ کیا حادثہ ہوا ہے۔“ شمع سرگوشی میں چلائی۔ زمین سوالیہ انداز میں شمع کی طرف دیکھنے لگی۔ شمع چاہتے ہوئے بھی ماتھے پہ حسب عادت ہتھیلی نہ مار سکی کہ یہاں کا ماحول بہت اپ ٹو ڈیٹ تھا۔

”تم اتنی خوبصورت ہو کہ ٹی وی والے تمہیں دکھا کر اپنے برائے فروخت کریں گے۔“ شمع نے کہا پھر خود ہی الجھ گئی۔

”ٹی وی تو دیکھتی تھی ناں تم.....؟“

”ہاں، کبھی کبھی.....!“

”اس میں ڈراموں کے بیچ میں جو وقفہ آتا ہے اس میں طرح طرح کے اشتہار آتے ہیں۔ بوتل کا، ٹوتھ

”میں نے تو کامران کو پہلے ہی کہا تھا۔ فیملی پردے والی معلوم ہوتی ہے۔ تم یہ پیغام مت بھجواؤ مگر بس آج کل کی اولاد اپنی من مانی ہی کراتی ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔“ بیگم ادریس ایسے نگاہیں کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

پچھلے کئی دن سے نقصانات کی بنا پہ جو بھونچال ارشاد بیگم کے دماغ میں آ رہا تھا یکدم ختم گیا..... اور کئی گھنٹے وہ یونہی گم صم سی بیٹھی رہیں۔ جو سوچ ان کے ذہن میں اس وقت جمی تھی اس نے تمام اعصاب ریلیکس کر دیے تھے۔ زمین کی شکل میں ان کی لاٹری نکل آئے گی انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ زمین کا آڈیشن ضرور دلوانا ہے اور پھر جب اس ارادے کا اظہار نہایت راز سے شمع کے سامنے کیا تو شمع اچھل پڑی۔

”کیا کہہ رہی ہیں ماما آپ.....!“ شمع کوماں کا ارادہ ناگوار گزرا تھا۔

”نہیں، نہیں۔ یہ کام ٹھیک نہیں ہے اگر یہی پروپوزل آپ کی سگی بیٹی کو ملتا تو کیا آپ یہ آفر جب بھی قبول کر لیتیں۔“

”وہ یہ تب کی بات تھی۔ تم فضول بحث نہ کرو۔ ویسے بھی بقول تمہارے ٹی وی سے متاثر ہو کر زمین نے اپنا پول تمہارے سامنے کھولا تھا۔ اس کا مطلب ہے اس آفر سے اسے خود کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ ارشاد بیگم خوش ہی بہت تھیں۔ شمع نے ماتھا پیٹ لیا۔

”کیا ہو گیا ہے ماما آپ کو۔ وہ بات کچھ اور تھی۔ زمین بالکل جاہل ہے۔ معمولی پانچ کلاسیں پڑھ لینے سے وہ میڈیا میں مقبول ہو جائے گی، یہ کیسے ممکن ہے۔“ ارشاد بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔

کامران اور بیگم ادریس کے لیے یہ یقین کرنا محال تھا کہ... ارشاد بیگم یہ آفر قبول کر لیں گی۔ اب کامران خود ان کے خدشات دور کر رہا تھا۔

”اس فیلڈ میں تعلیم یا لب و لہجہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اگر آپ کی بیٹی پڑھی لکھی نہیں ہے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کی بیوی، فکر اور چہرہ ہنڈرڈ پرسنٹ

سے پیٹ بھی بڑھ جاتا ہے اور وزن بھی۔ اور میں نے دیکھا ہے تم زیادہ تر رونی ہی پسند کرتی ہو۔ فروٹ وغیرہ کھایا کرو جس سے خون بنتا ہے۔ بالکل پیلی زرد ہو رہی ہو۔“ یہ کہہ کر ارشاد بیگم کچن سے نکل گئیں۔ زمین حیرت سے انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

رات جب وہ بستر میں لیٹی تو باوجود جھکن کے اسے بہت دیر تک نیند ہی نہ آئی۔ تصویریں بناتے وقت کامران نے کئی بار اس کے جسم پر ہاتھ لگایا تھا۔ وہ کبھی چہرے پر ہاتھ لگا لگا کر دائیں بائیں کر رہا تھا کبھی ہاتھ اٹھوا رہا تھا کبھی ٹانگ آگے پیچھے خود کچڑ کر رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ بہت برا اور بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ کس راستے پہ چل پڑی تھی۔

”کیا دادی ہوتیں تو وہ یہ سب کرتی۔ کیا ہونے جارہا ہے میرے ساتھ.....؟“ اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔

”تمہیں اس گھر میں رہنا ہے تو نامہ کی ہر بات ماننا ہوگی۔“ شمع کے الفاظ اس کے ارد گرد گونج رہے تھے۔ گہری سانس بھر کر اس نے اپنے انقباض ڈھیلے چھوڑ دیے۔ جیسے خود کو وقت کے دھارے سے چھوڑ رہی ہو۔ صبح وہ دیر تک سوتی رہی۔ باہر ڈیرینک روم سے آوازیں آرہی تھیں جب اس کی آنکھ کھلی۔ کامران اس کی تصاویر لے کر آیا تھا۔ شمع اور ارشاد بیگم تو پہچان ہی نہ پائی تھیں کہ یہ زمین ہے۔

”زمین کہاں ہے..... اسے بھی تو بلوائیں۔ ذرا اپنی تصویریں دیکھے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ اب وہ زمین نہیں زیب ہے۔“ شمع اتر کر بولی۔ کامران ہنس پڑا۔

”ویری سویٹ نیم..... میڈیا میں تو واقعی ایسے ہی نام چلتے ہیں۔ چلیں زیب جی کو بلوائیں۔“

”وہ ابھی سو رہی ہے۔“ شمع کی اطلاع پہ کامران قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”گویا ابھی سے بڑے آرٹسٹوں والے نخرے..... ابھی تو بہت مرحلے باقی ہیں۔“ کامران نے کئی پتے کھیلے تھے اور وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ان نخروں

پیٹ کا، صابن کا، شیمپو کا۔ ان میں جو خوبصورت خوبصورت لڑکیاں آتی ہیں، تم بھی ان اشتہاروں میں اسی طرح آؤ گی۔ کہاں پھنسوا دیا مانے۔ بہتر ہوتا کہ کامران صاحب تمہیں خود سمجھاتے۔ بہر حال اب فضول سوال مت کرو۔ یہاں یہ لوگ تمہارے چہرے، ہاتھ پاؤں اور بالوں کو مین ٹین کریں گے آئی مین تمہیں اور بھی نکھار دیں گے اور بھی خوبصورت بنادیں گے، سمجھیں! اور اب ان لوگوں سے فضول سوال مت کرنا۔ چپ چاپ جو کریں کرواتی رہنا۔ ٹھیک ہے بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”آئیے میم.....“ ایک خوبصورت اور بے حد ماڈرن لڑکی نے آکر کہا تو زمین نے گھبرا کر شمع کا منہ دیکھا۔ شمع نے خواجواہ دانت دکھلائے اور زمین کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کامران صاحب نے آپشنل فون کیا ہے آپ کے لیے۔ نئے چہرے متعارف کرانے میں کمال حاصل ہے انہیں۔ نام کیا ہے آپ کا؟“ اس سے قبل کہ زمین بولتی۔ شمع جلدی سے بولی۔

”زیب“

”ویری ٹائسی“ لڑکی اپنی ہمراہی میں اسے اندر لے گئی۔ شمع نے گہری سانس خارج کی۔ پھر جلدی جلدی موبائل پر ماں سے بات کرنے لگی اور ماں کو صورتِ ماں بنانے لگی۔ ابھی بوتیک بھی جانا تھا۔ اس کے بعد اسٹوڈیو..... شمع کا سارا دن زمین کے ساتھ بلکان ہونے میں گزرا۔ رات گئے وہ گھر لوٹیں تو بہت تھک چکی تھیں۔

”میں تو یہ ڈیوٹی ہرگز نہیں نبھا سکتی۔ آپ کو شوق ہے تو ڈیوٹیاں آپ ہی نبھائیں۔ سخت تھک گئی ہوں میں۔“ شمع پاؤں پیار کر بستر پر پڑ گئی۔ جھکن سے تو زمین کا بھی برا حال تھا اور بھوک علیحدہ لگ رہی تھی تو تکلف کیے بنا وہ کچن میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور رونی پہ سالن ڈال کر کھانے لگی۔ ارشاد بیگم نے شمع سے دن بھر کی معلومات لیں اور تسلی کر لی لیکن جب زمین کو روٹیاں کھاتے دیکھا تو یکدم بے چین ہو گئیں۔

”اے لڑکی..... تم اس طرح یکدم پیٹ بھاڑ کر نہ کھایا کرو۔“ زمین کا لقمہ رک گیا۔ ”زیادہ رونی کھانے

اٹھیں۔

”ہوسکتا ہے آگے اس سے بھی زیادہ ہو جائے۔“
جس غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنی سے کانٹریکٹ تھا ارشاد بیگم
اندازہ بھی نہیں لگا سکتی تھیں کہ زمین اس سے بھی کمبیں
زیادہ کمالے گی۔

”ٹھیک ہے، میں اسے بھیج دوں گی لیکن پہلی بار
ہے ناں تو میں چاہتی ہوں ہم میں سے نہ سہی۔ آپ ساتھ
چلی جائیں۔“ ارشاد بیگم نے بیگم ادریس کے سامنے
خواہش کا اظہار کیا تو بیگم ادریس ہنس دیں۔

”میں تو مسز ارشاد بہت بڑی رہتی ہوں۔ کامران کی
مسز خود اس فیلڈ سے وابستہ ہے۔ آج کل وہ نجی چینل پہ
مارننگ شو کر رہی ہے لاہور سے۔ میں اس سے کہہ دیتی
ہوں۔ تھوڑا وقت نکال کر اس ایڈ کی تیاری تک آجائے اور
ایک دو شو گلگت میں بھی کر لے کیونکہ وہ لاہور میں ہوتی
ہے۔ کامران خود بھی لاہور میں رہتا ہے۔ ماشاء اللہ تین
بچے ہیں کامران کے۔ اگر آپ کو پریشانی ہے تو بس میں
اتنا ہی کر سکتی ہوں۔“ اتنی تفصیل سننے کے بعد ارشاد بیگم
شرمندہ ہو گئیں اور پیچھے سانس کر رہی۔

انگلینڈ کی فلائٹ سے زمین، کامران کے ہمراہ وی
آئی بی سیٹ پہ بیٹھی ہوا کے دوش پہ اڑ رہی تھی۔ یہ پہلی
اڑان تھی جو اسے پستی سے بلند یوں پہلے جا رہی تھی۔
اور ارشاد بیگم نے اسے خوب اچھی طرح سمجھایا تھا کہ کسی کی
باتوں میں نہ آئے۔ صرف کام سے مطلب رکھے۔ اسے
اچھا سا موبائل سیٹ لے کر دیا تھا تا کہ وہ رابطے میں رہ
سکے۔ اس کی زندگی کیا تھی محض کٹہ پتلی۔ زمین نے جہاز کی
سیٹ سے سر نکال لیا تھا۔

ڈوریل بچی تو روحا کے دل کو اچانک کچھ ہوا۔ وہ عماد
الدین کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ انجان بنی رہی مگر کان
باہر ہی لگے تھے۔ اس کے دل کو پکا یقین تھا کہ یہ فرزان ہی
آیا ہوگا۔ تھوڑی دیر میں ملازم نے آکر بتایا۔

”کوئی فرزان صاحب آئے ہیں۔“

”فرزان.....؟“ عماد الدین کے چہرے پہ
ناگواری پھیل گئی۔

کامطلب کیا ہے۔ اتنے میں زمین خود ہی آتی نظر آئی۔ تو
کامران اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

”آؤ ذریب! اپنی تصاویر دیکھو۔ کیا پر سنیلٹی لگ
رہی ہے تمہاری۔“ زمین نے آگے بڑھ کر میز پہ سے
تصویریں اٹھائیں اور گنگ رہ گئی۔ وہ ان تصویروں میں
خود کو پہچان ہی نہ پائی تھی۔

”بس اب فٹ تیار کرو۔ میرے پاس زیادہ
وقت نہیں ہے۔ ایڈ کی تیاری کے لیے مجھے گلگت جانا ہے
اور تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تمہارے ساتھ اکیلی
نہیں جاسکتی۔“ ارشاد بیگم درمیان میں بولیں تو کامران
ہنس دیا۔

”آنٹی آپ تو خواخواہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہاں
ہماری پوری ٹیم ہوگی اور اس فیلڈ میں تو بیرون ملک بھی جانا
پڑتا ہے۔ آپ مجھ پر اعتماد کر سکیں گی تو یہ آگے بڑھ سکے
گی۔“ ارشاد بیگم فکر مند نظر آنے لگیں۔

”ایسا تو نہیں..... کہیں یہ ہمیں دھوکا دے رہا ہو۔“
ارشاد بیگم کی بڑبڑاہٹ کامران نے واضح طور پر سنی تھی۔

”اگر آپ لوگوں کو مجھ پہ اعتماد نہیں تو آپ میرے
ساتھ چلیں۔ ہاں..... اور رہ گئی دھوکے کی بات..... تو یہ رہا
ایگریمنٹ پیپر۔ اسے آپ نسلی سے پڑھ لیں۔ اس پہ
زمین یا آپ کے سائن کے بعد ہی میں کوئی عملی قدم
اٹھا سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر کامران وہاں سے چلا گیا۔ شیخ نے
وہ ایگریمنٹ پیپر ماں کو پڑھ کر سنایا جو خالصتا پر ویشل
تھا۔ جس میں کئی شکیں تھیں اور کئی تحفظات تھے۔ ارشاد
بیگم کو کچھ نسلی سی ہوئی۔

”مگر اس میں معاوضے کے بارے میں تو نہیں لکھا
کہ وہ کتنا معاوضہ دے گا۔“

”لکھا تو ہے مایا پورے ایک سال کا کانٹریکٹ
ہے۔ یہ معاہدہ ایک ہی کمپنی کے ساتھ ہے۔ کمپنی ایڈ کی
مقبولیت کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ معاوضہ دے گی۔
اور پہلی بار میں پچاس ہزار ملیں گے اور ہر تین ماہ کے بعد نیا
ایڈ تیار ہوگا۔“

”پچاس ہزار.....!“ ارشاد بیگم کی آنکھیں چمک

کر رہا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے روحانے یہ نہ سوچا کہ یہ بیچ تو اس نے خود بویا تھا اگر وہ سمجھ داری اور قوت برداشت کا مظاہرہ کرتی اور کچھ قریانیاں دیتی تو باپ کی لمحہ بہ لمحہ نہ تو سپورٹ کی ضرورت پڑتی اور جیسے تیسے اس کا گھر بھی بس جاتا..... مگر وہ اپنے معیار سے نیچے نہیں آئی تھی اور اب جب فرزان اس کی طرف بڑھ رہا تھا تو باپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

”کیا بات ہے روحا، انکل کی طبیعت کیا ٹھیک نہیں ہے تم اس قدر چپ چپ ہو.....؟“ روحانے چہرہ اٹھا کر فرزان کی طرف دیکھا اور شکوہ کنناں لہجے میں بولی۔

”کاش تم آج سے پہلے بھی مجھ سے اس طرح ملتے بولتے... میرا حال احوال لیتے تو نوبت اتنی سرد مہری تک نہ آتی۔“ روحا کی شکایت پر فرزان نے دل ہی دل میں گہری سانس بھری۔ پھر وہی شکایتوں کی لسٹ اور نازخروں کی باتیں۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو روحا میرے گھریلو معاملات کو۔ یہ سچ ہے میں نے ہمارے ساتھ مل کر تمہارے ساتھ بہت زیادتیوں کی ہیں، مجھے اس چیز کا شدت سے احساس ہے۔“ فرزان کے یہ الفاظ روحا کے لیے بالکل نئے اور نرالے تھے۔

”میں نے اپنا بہت وقت ضائع کیا ہے روحا۔ مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔ میں تمہارے ساتھ نئے سرے سے زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی روحا؟“

”کس قدر بدل گئے ہو تم.....!“ حیرانی سے روحا کہہ بیٹا نہ رہ سکی۔

”ہاں..... وقت انسان کو بدل دیتا ہے۔“ وہ ذرا مظلوم سا بیٹا۔

”اور وہ لوگ جو تمہارے اور میرے بیچ میں تھے؟“ روحانے اسے اچھی طرح سے ٹٹولنا چاہا۔

”ان سب کی اپنی زندگی ہے روحا، سب لوگ اپنی زندگی میں مگن ہیں۔ تنہا ہوں تو صرف میں... یا..... تم۔“ روحا چپ سی ہو گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ فرزان سدھر گیا ہے۔

”ڈیڈی وہ آپ کی عبادت کے لیے آئے ہیں۔“ روحا دبے دبے لہجے میں کہنے لگی تو عماد الدین نے بیٹی کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں بولے۔

”گویا تم اس کے ساتھ گھر بسانے پر رضامند ہو۔“

”یہ بعد کی بات ہے ڈیڈی! وہ گھر آئے ہیں، فی الحال تو ان سے ملنا پڑے گا۔“ روحا کا لہجہ دھیمہ اور چورسا تھا۔

”مگر میں اس سے ملنا نہیں چاہتا..... بہر حال وہ تمہارا شوہر ہے اگر تم ملنا چاہتی ہو تو جا کر مل لو۔“ ان کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ روحا پہلو بدل کر رہ گئی پھر اسی انداز میں بولی۔

”مگر ڈیڈی وہ آپ کی عبادت کے لیے آئے ہیں۔ اچھا نہیں لگتا کہ آپ ان سے نہ ملیں۔“

”مجھے اس نوبت پر پہنچا کر وہ میرا تماشا دیکھنے آیا ہے..... میری عبادت کرنے نہیں آیا۔“ وہ سخت بدظن تھے اور اس سچ تک پہنچانے میں روحانے پل صراط کا کام کیا تھا۔ کوئی بات بھی اپنے تک نہ رکھی تھی باپ کو سوئی سے لے کر پہاڑ تک سب سناتی ہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی گفتگو بھی موبائل کا اسپیکر ان کے سنایا کرتی تھی۔ عماد الدین انسان ہی تو تھے..... کوئی پتھر تو نہیں جو بدظن نہ ہوتے۔

روحا کا ہر وقت کا ڈھٹا پٹینا اور فرزان اور اس کے گھر والوں کی شکایتیں..... وہ بیٹی کو سپورٹ کرتے کرتے بالآخر ٹوٹ گئے تھے۔ پتھر پہ بھی قطرہ قطرہ پانی پڑے تو اس میں بھی دراڑ پڑ جاتی ہے۔ پھر عماد الدین کا دل کیوں نہ برا ہوتا۔ اب وہ فرزان کے بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ اب نہ تو ان کی صحت اجازت دیتی تھی اور نہ ہی اب انہیں دلچسپی رہی تھی۔

اچانک ہارٹ اٹیک نے انہیں بالکل کمزور اور ناتواں کر دیا تھا۔ روحا تذبذب کی حالت میں بیٹھی رہی۔ عماد الدین نے آنکھیں میچ لیں، وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر آ گئی۔ فرزان اسے دیکھ کر بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ روحا بد دل سی ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی..... فرزان نے اس کے ساتھ اتنا برا نہ کیا ہوتا تو ڈیڈی اس سے اتنا بدظن نہ ہوتے۔ اس وقت درحقیقت اسے فرزان کے سہارے کی ضرورت تھی لیکن عماد الدین کا دو ٹوک رویہ اسے گھائل

محبت کچھ شرطیں، وعدے اور تقاضے جاہتی تھی۔ فرزان اب ان سب چیزوں کے لیے آمادہ ہو گیا تھا پھر روحا کا دل کیوں نہ موم ہوتا۔ کیوں نہ فرزان کو معاف کرتا۔ فرزان کے رویے نے اسے بالکل ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔

زندگی کی نئی توانائیاں اور ترتیب اس کے اندر جاگنے لگی تھیں۔ اور اس نے دل ہی دل میں اٹل فیصلہ کر لیا تھا جب فرزان اپنا گھر چھوڑ چکا ہے تو وہ اسے یہیں رہنے پر زور دے گی اور ڈیڈی کو بھی کسی نہ کسی طرح منالے گی۔ آخر وہ اس کی ہر بات ماننے آئے ہیں۔ بالآخر اس کی منتیں اور مرادیں کام آگئی تھیں وہ بے حد مسرور تھی۔

کتنے دن کے بعد فیکے نے دن کا اجالا دیکھا تھا۔ دھوپ سے اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے وہ ہانپنے لگا تھا۔ سڑک کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ یہ کوئی بہت بڑا شہر تھا۔ کون سا شہر اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے یاد تھا تو صرف یہ کہ وہ ملک کی قید سے بھاگ نکلا ہے۔

بقیہ اگلے ماہ میں

”ڈیڈی کی حالت ایسی نہیں ہے کہ میں انہیں چھوڑ کر کہیں جاؤں۔“ روحا نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنا عندیہ سنایا۔ دوسرے طریقے سے وہ فرزان کو جانچنا بھی چاہ رہی تھی کہ اس کے دل میں اس کے باپ کے لیے کتنی ہمدردی ہے۔

”ہاں..... تو تمہیں کس نے کہا ہے کہ تم انکل کو چھوڑ کر جاؤ۔ گا ہے بہ گا ہے میں تم سے ملنے آ جایا کروں گا۔ دعا کرنا مجھ میں اتنی استطاعت ہو کہ یہیں قریب ہی چھوٹا موٹا سا گھر لے لوں۔“ یہ سارے ڈائلاگ سنانے سے سکھائے تھے۔

”کیا تمہاری ماما تمہاری دوری برداشت کر لیں گی۔“ روحا کا آخری سوال فیصلہ کن موڑ پر آ گیا تھا۔ فرزان تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوا پھر کہنے لگا۔

”میں ماما کا گھر چھوڑ چکا ہوں۔“ یہ دھماکا ایسا تھا کہ روحا اچھل پڑی۔

”مگر کیوں.....؟“ روحا کو تسلی نہ ہوئی۔

”ماما صرف مجھے اپنی زندگی گزارنے کے لیے استعمال کر رہی ہیں مگر میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔ روبوٹ نہیں۔ آخر میری بھی ایک زندگی ہے۔ اس طرح میں کب تک جی سکتا تھا۔“ فرزان کے انکشافات روحا کے لیے سکون کا باعث تھے۔

”شاید ظہور بھائی بھی ماما کو اسی لیے چھوڑ کر چلے گئے تھے کہ ماما کی زیادتیاں اور خود غرضیاں ان سے برداشت نہیں ہو پائی تھیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نہ جانے کہاں ہیں اور کس حال میں کوئی نہیں جانتا۔ میرا دل کرتا ہے میں بھی اسی طرح سے روپوش ہو جاؤں..... اس دنیا سے کہیں بہت دور چلا جاؤں۔ تھک گیا ہوں، روحا.....! میں بہت تھک گیا ہوں۔ تم سے اور انکل سے اس لیے ملنے آیا تھا کہ اپنے کیے پتہ نام ہوں۔ ہو سکے تو معاف کر دینا۔“

”کیسی ٹوٹی ہوئی، ہاری ہوئی باتیں کر رہے ہو فرزان تم.....!“ روحا یکدم بے چین ہو گئی۔ عورت کا دل تو ویسے ہی نرم ہوتا ہے۔ جلد پھل جاتا ہے اور روحا کا دل پھلنے لگا۔ ویسے بھی روحا کو فرزان سے محبت تو تھی لیکن یہ



UrduPhoto.com

قسط 6

کچی گاگرٹوٹ گئی

میمونہ خورشید علی

ناولٹ

عمارت کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی پل زمین پہ ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

یہ پُر شکوہ عمارت ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی تھی۔ روحا،

بالآخر فیکا بھاگتے بھاگتے ہانپنے لگا تھا۔ نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا اور ناتواں ٹانگوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ چکراتے وجود کو سنبھالتے ہوئے اس نے اس پُر شکوہ



بڑھتیں۔ کیوں چھپا رکھا تھا تم نے خود کو..... ہاں؟“
کچھ رو میٹک سا ہوا تو روحا نے برا منا لیا۔

”شادی کے بعد اگر لڑکے اور لڑکی کو اپنی من پسند زندگی جینے کا موقع دیا جائے تبھی وہ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ تمہارے گھر میں تو اس چیز کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود تم مجھے ہی الزام دے رہے ہو۔“
فرزان دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا پھر اوپر سے دل سے مسکرایا اور زود درجی سے کہنے لگا۔

”دے دو طعنے..... اب تو زندگی بھر تمہارے طعنے ہی سننے ہیں۔“ روحا یکدم چپ سی ہو گئی۔

”میں تمہیں طعنے دے کر شرمندہ نہیں کرنا چاہتی فرزان۔ تم میری طرف پلٹ آئے ہو..... میرے لیے یہی بہت ہے۔ میری اس جنجال خانے سے جان چھوٹ جائے گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ڈیڈی کا جو کچھ بھی ہے وہ سب میرا ہی تو ہے۔ تمہارا یوں خالی ہاتھ آنا۔ میرے لیے بالکل بھی نقصان دہ نہیں ہے۔ بس پریشانی ہے تو یہ کہ ڈیڈی کو اس وقت سہارے کی ضرورت ہے مگر..... وہ تمہارا سہارا ہرگز نہیں لیں گے۔ چار سالوں میں جو تم نے ڈیڈی کو زخم دیے ہیں وہ گھاؤ اتنے گہرے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ انہیں مندل کرتے کرتے میں اپنا کچھ نقصان نہ کر بیٹھوں۔“

”اے..... کہاں کھو گئی ہو.....؟“ اسے انگلی میں پہنی انگلیوں سے الجھتا دیکھ کر فرزان نے ٹوکا۔ روحا چونک سی گئی اور شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

”کہیں نہیں..... سوچ رہی تھی سارے معاملات خود بخود ٹھیک ہو گئے ہیں۔ بس ڈیڈی کی اور تمہاری تفصیلی ملاقات ہو جائے تو زندگی میں کوئی چھین ہی نہ رہے۔“
”تو یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میں آج ہی ان سے مل لیتا ہوں۔“ فرزان پر جوش انداز میں بولا تو روحا نے پہلو بدل لیا۔ کیا کہتی کہ ڈیڈی تو تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے..... ملاقات تم سے خاک کریں گے۔

”نہیں..... ابھی فی الحال تم ان سے نہیں مل سکتے۔ ان کا ڈاکٹر انہیں ابھی کسی سے بھی ملنے نہیں دے رہا۔ ابھی تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔“

فرزان کے ہمراہ کھانا کھا کر نکلی تھی..... قریب ہی غیر معمولی ہجوم دیکھ کر وہ معمول کی باتیں کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

”ملکی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔“
فرزان نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا تو روحا چونکی اور اپنے حصار سے باہر نکلی۔

”یہ لوگوں کا ہجوم کیسا ہے.....؟“ اسے گویا تجسس سا ہوا تھا۔

”ایک نو جوان لڑکا ہوٹل کے سامنے مشکوک حالت میں بے ہوشی کی حالت میں پایا گیا ہے۔“
”تو لوگ کیوں کھڑے ہیں یہاں..... پولیس کو انفارم کیوں نہیں کرتے.....؟“

”شاید پولیس بھی آگئی ہے۔ ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ خدا نہ کرے کہ یہاں کوئی حادثہ پیش آئے..... لیکن افراتفری سے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی خودکش حملہ آور تھا۔“ فرزان سیکنڈوں میں وہاں سے گاڑی نکال چکا تھا۔ روحا نے گہری سانس لی۔

”خدارا! اس ملک کی حفاظت فرمائے۔ کوئی دن نہیں گزرتا جو ایسی ہولناک خبر سننے کو نہ ملے۔ اب تو نیوی بھی دیکھنے کو دل نہیں کرتا۔ چاروں اطراف خوں ریزی ہی خوں ریزی ہے۔ نہ جانے کون لوگ ہیں یہ اور کیوں اس سرزمین کو بدنام کر رہے ہیں۔“ پھر روحا کو جیسے غصہ سا آ گیا۔

”نہ تو یہ لوگ پاکستانی ہیں اور نہ ہی مسلمان۔ خدا بیڑا غرق کرے ان کا۔“

فرزان نے دلچسپی سے روحا کی طرف دیکھا تو روحا چپ سی ہو گئی۔ وہ زپر لب مسکرا دیا۔

”بڑی بات ہے، اپنی ذات سے ہٹ کر تمہیں بھی لوگوں کے دکھ محسوس کرنے آتے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا تم صرف..... اور صرف اپنے لیے سوچنے والی لڑکی ہو۔ مگر ان چند دنوں میں، میں نے تمہیں اس چار سال کی رفاقت سے بالکل منفرد اور اچھوتا پایا ہے۔ نہ جانے تمہارا کون سا روپ سچا ہے۔ مگر سچ بتاؤں تمہارا یہی روپ اگر میں پہلے دیکھ لیتا تو شاید ہمارے درمیان اتنی دوریاں نہ

میرا خیال ہے مجھے چلے ہی جانا چاہیے۔ میرے بچوں
آجانے کو نہ جانے ڈیڈی کیا لالچ سمجھیں۔“ وہ ہنوز متفکر
اور سنجیدہ تھا۔

”ڈیڈی.....!“ روحا نے حیرت و خوشی سے فرزان
کی طرف دیکھا۔ ہمیشہ وہ تمہارا باپ کہا کرتا تھا اور آج
اس نے خود ڈیڈی کہا تھا یعنی وہ ڈیڈی کی بھی قدر و منزلت
جان گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا جھنجھلا سی گئی۔ دل ہی دل میں
سرشار تھی۔ اس کی قسمت نے صحیح وقت پر پانسہ پلٹا تھا۔
اسے اس وقت اس اپنائیت اور چاہت کی ضرورت تھی۔
جس سے فرزان اسے نوازا رہا تھا۔

”اب تم کوئی فضول بات نہیں کرو گے۔ کس چیز کی
کمی ہے تمہارے پاس جو تم یہاں لالچ میں چلے آؤ گے۔
یہ صرف تمہارا وقتی احساس ہے اور کچھ نہیں۔ ڈیڈی کی
طبیعت ٹھیک ہو جائے، تمہارے سارے ابہام خود بخود
ٹھیک ہو جائیں گے۔“

روحا مکمل طور پر فرزان پہ اعتماد کر چکی تھی۔ اس
جیت پہ فرزان دل ہی دل میں سرشار تھا۔ جلد از جلد وہ اس
خوشی کو ثنا سے شیر کرنا چاہتا تھا۔ یکے بعد دیگرے دونوں
گاڑی سے اترے اور لان میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے
وہیں کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ پھر روحا نے بے چینی سے
ریسٹ وائچ میں ٹائم دیکھا۔

”ڈیڈی کی دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔ میں ذرا ان
کے پاس جا رہی ہوں۔“ عماد الدین اپنے کمرے کی
کھڑکی سے یہ منظر صاف دیکھ رہے تھے۔ روحا کرسی سے
اٹھی تو فرزان بھی کھڑا ہو گیا۔

”انہیں میری طرف سے بہت بہت پوچھنا۔ انہیں
کہنا میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اپنے کیے پہ نادم
ہوں۔“ روحا نے مسکرا کر پُرسکون انداز میں فرزان کی
طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو شوکت کو بلا لینا۔“ وہ
تلقین کرتے ہوئے لان سے برآمدے میں آگئی تو
عماد الدین نے جل کڑھ کر پردے گرا لیے۔

”میں اس شخص کا وجود اپنے گھر میں نہ جانے کس
مجبوری کے تحت برداشت کر رہا ہوں۔ کیا صرف روحا کے

”ٹھیک ہے، میں پھر واپس چلا جاتا ہوں۔ جب
وہ ٹھیک ہو جائیں گے تب ان سے مل لوں گا۔“
”تم تو کہہ رہے تھے تم خود کو یہاں سیٹل کرنے
والے ہو پھر یہ جانے کا ذکر.....؟“ روحا نے حیرت سے
فرزان کی طرف دیکھا۔ فرزان نے یکدم گاڑی روک لی
اور ماتھے پہ بے انتہا تفکر کی لکیریں پھیلاتے ہوئے گہبھر
لہجے میں بولا۔

”سچ بات تو یہ ہے روحا کہ تمہارے ڈیڈی مجھ سے
ملنا ہی نہیں چاہتے۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے سخت بد دل
ہیں۔ اگر محض صرف وہ مجھ سے ناراض ہوتے تو تم کبھی کا
اتیں منا چکی ہوتیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے وہ ہمارے درمیان
سے نکل گئے ہیں روحا۔ بھی تو یوں آزادانہ طور پر میں
تمہارے گھر میں پڑا ہوں، تم میرے ساتھ گھوم پھر رہی ہو
مگر سچ بتاؤں روحا اس طرح کر کے مجھے خوشی اور سکون
حاصل نہیں ہو رہا بلکہ میں خود کو بہت گرا ہوا محسوس کر رہا
ہوں۔ ٹھیک ہی تو کر رہے ہیں وہ میرے ساتھ مجھ سے نہ
مل کر۔ تمہی بتاؤ کوئی کتنا ظریف پیدا کر سکتا ہے۔ ماما کی
باتوں میں آکر بہت تکلیف پہنچانی ہے میں نے انہیں۔
مجھے اپنی زیادتیوں کا بخوبی احساس ہو گیا ہے..... مگر میری
بد قسمتی یہ ہے کہ میں اب ان زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہوں بھی تو
نہیں کر سکتا۔“ روحا اس کی زور درجی پہ پہلو بدل کر بے چینی
سے بولی۔

”تمہیں احساس تو ہو گیا ہے ناں فرزان اپنی
زیادتیوں کا..... اپنی غلطی کا احساس ہو جانا ہی بہت بڑی
بات ہے۔ ورنہ لوگ ساری عمر غلط راستے پہ چلتے رہتے
ہیں اور انہیں احساس دلواتے ہوئے بھی احساس نہیں
ہو پاتا اور بس میرے لیے یہی بہت ہے۔ بار بار معافیاں
مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کرو فرزان! جو وقت گزر گیا ہے نہ تو
تم اس کو واپس لا سکتے ہو اور نہ ہی میں..... اور میں تو اس
وقت کو سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ تم یقین نہیں کرو گے فرزان
کہ مجھے ابھی بھی یقین نہیں آتا کہ تم اس طرح یوں میرے
پاس آ جاؤ گے۔“ روحا کے لہجے میں انجانی سی خوشی تھی۔
فرزان نے خود یہ قابو پائے رکھا۔

”مگر میں بھی عزت کی زندگی جینا چاہتا ہوں روحا۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں روحا۔ فرزان تمہارا شوہر ہے میں تمہارے منگیتر کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو تم یوں سر جھکا کر بیٹھو گی۔ مجھے بتاؤ چار سال جس اذیت میں اس نے تمہارے گزر روائے ہیں، اب وہ دوبارہ گھر بسانے کے بعد ویسے حالات نہیں کرے گا کیا تمہیں اس چیز کا یقین ہو گیا ہے؟“ ان کے اس سوال میں روحا کا لائحہ عمل پوشیدہ تھا۔

”اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔“ روحا کا مبہم سا جواب عماد الدین کو حیران کر گیا۔
”تو کیا تم مجبوری میں اس کے ساتھ بسنے جا رہی ہو۔ کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں.....؟“ وہ طیش میں آگئے۔ روحا گڑبڑا گئی۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا ڈیڈی!“
”تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا۔ مجھے اس حال پہ پہنچا کر وہ میرا تماشا دیکھنے آیا ہے۔ کیا کر رہا ہے وہ یہاں؟“

”آپ کو اس حال تک پہنچانے میں فرزان کا ہی نہیں خود میرا بھی بڑا عمل دخل ہے ڈیڈی۔“ بیٹی کے بیان پہ عماد الدین کو بہت بڑا جھٹکا لگا۔

”لیکن اب مجھے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا آ گیا ہے اور میں جان گئی ہوں سہارے سارے وقتی طور پر تو بہت اچھے لگتے ہیں لیکن یہ انسان کو مفلوج بنا دیتے ہیں اور آپ کے سہارے نے مجھے واقعی مفلوج بنا دیا تھا۔ میں آپ کی محبت کو کوئی الزام نہیں دے رہی، میں صرف اپنی کمزوری اور خوف کا ذکر کر رہی ہوں۔“ روحا نے آہستگی سے کہا اور سر جھکا لیا پھر وہ اسی آہستگی سے بولی۔

”ڈیڈی! کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کی بیٹی کی زندگی میں اتنی مشکلات کیوں آئیں۔ اس لیے کہ لہجہ بہ لہجہ آپ اسے سہارا دیتے تھے۔ اکثر آپ میری چھوٹی سے چھوٹی..... معمولی باتیں بھی دھیان سے سنا کرتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ نے کبھی مجھے سمجھایا نہیں..... آپ ہمیشہ مجھے سمجھاتے تھے مگر نہ جانے کیوں میں سب کچھ سن کر بھی خود کو حوصلہ نہیں دے پاتی تھی۔ بس میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ آپ میرا ہاتھ نہ چھوڑیں۔ آپ کا ہاتھ تھام

لیے..... ہاں ٹھیک ہے، روحا اپنا گھر اس کے ساتھ بسانا چاہتی ہے تو چلی جائے اس کے ساتھ۔ آخر اس نے ایسا کون سا جادو کیا ہے روحا پر جو روحا کو یقین ہو گیا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جا کر اس کے معیار کے مطابق زندگی گزارے گا..... بالکل بے وقوف ہے یہ لڑکی۔“ عماد الدین کو سخت غصہ آیا پھر دوسرے ہی پل وہ سوچنے پہ مجبور ہو گئے۔

”میں اس طرح کیوں سوچ رہا ہوں۔ چار سال سے میں روحا کا گھر بسانے کے ہی تو جتن کر رہا تھا تب روحا نہیں بس سکی، ہو سکتا ہے کہ اب بس جائے۔ اگر روحا راضی ہے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”السلام علیکم ڈیڈی کیسے ہیں آپ؟ ماشا اللہ واک ہو رہی ہے۔ مگر فی الحال اتنی واک کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صبح واک کر ادیتی ہوں۔ بس وہی کافی ہے۔“ یہ کہہ کر روحا نے باپ کو کاندھوں سے تھاما اور آہستہ روی سے چلتے ہوئے انہیں بیڈ پہ بٹھا دیا۔

”کیا بات ہے، چہرہ سرخ ہو رہا ہے آپ کا۔ کیا آپ بہت دیر سے جہل قدمی کر رہے تھے اور یہ کیا سانسیں بھی کچھ تیز لگ رہی ہیں۔ میں ابھی بی بی چیک کرنی ہوں۔“ ابھی اس نے بلڈ پریشر کے آلے کی طرف ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ عماد الدین نے ہاتھ سے روک دیا۔

”میرا بی بی نارمل ہے۔ تم بیٹھو، میں نے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ بالکل سنجیدہ تھے۔ روحا چونک سی گئی۔ ابھی کچھ دیر قبل اس کے جسم میں جو ترنگ نمایاں تھی مفقود ہو گئی۔ نہ جانے وہ کیا پوچھنے جا رہے تھے۔ اگر انہوں نے فرزان کے متعلق پوچھا تو وہ کس طرح قائل کرے گی انہیں۔ فرزان کے ذکر سے تو اب یہ حال تھا کہ ان کا بی بی شوٹ کر جاتا تھا۔ اتنے حساس حالات میں وہ یہ رسک کیسے لے سکتی تھی۔

”ہم باتیں پھر کر لیں گے..... ابھی مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آپ آرام کریں۔“
”کیا تم فرزان کے ساتھ گھر بسانے پہ سنجیدگی سے قائم ہو.....؟“ ان کا سوال دو ٹوک تھا۔ روحا یکدم چپ ہو گئی۔

رہنے میں خود کو بہت محفوظ تصور کرتی تھی۔ ڈیڈی۔۔۔
 آپ نے مجھے پل پل تحفظ تو دیا مگر اس خوف سے میرا پیچھا
 اس چھڑا سکے جو میرے اندر ہر وقت رہتا تھا۔ کاش آپ
 میرے اس خوف کو باہر نکال دیتے تو آج آپ کی بیٹی
 آپ کو اس حال تک پہنچانے کا موجب نہ بنتی۔“ روحا نے
 ایمانی سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔ عماد الدین نے غور سے
 راجا کو دیکھا۔ آج وہ کیسی باتیں کر رہی تھی۔

”کیسا خوف.....؟“ عماد الدین زیرِ لب
 بڑائے۔

”تنہائی کا خوف ڈیڈی۔۔۔ ناکامی کا خوف، پیچھے رہ
 جانے کا خوف، آپ سے بچھڑ جانے کا خوف۔“ یہ کہہ کر
 روحا تھوڑا سا ہنسی جیسے خود اپنا ہی مذاق اڑا رہی ہو۔ ”آپ
 کو یاد ہے ڈیڈی جب اسکول کے زمانے میں ایگزام کا
 وقت آتا تھا تو مجھے اچھے سے اچھے ٹیوٹر کی موجودگی میں بھی
 آپ کے سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ سارا سلیپس
 اچھی طرح رٹ لینے کے باوجود بھی مجھے یہ خوف رہتا تھا
 کہ میں فیل ہو جاؤں گی اور میں اس وہم اور وسوسے پہ رویا
 کرتی تھی۔ مجھے یہ خوف کیوں لاحق رہتا تھا ڈیڈی جبکہ
 میں کبھی کسی ایک امتحان یا پرچے میں بھی فیل نہیں ہوئی۔
 بے شک میں اعلیٰ پوزیشن نہیں لے پاتی تھی مگر فیل بھی تو
 نہیں ہوتی تھی۔ تب آپ مجھے کہتے تھے کہ تم فیل نہیں ہوگی
 روحا..... بے فکر رہو میں تمہارے ساتھ ہوں اور تب
 میرے اندر امید کی کرنیں جلنے لگتی تھیں کہ ہاں ڈیڈی ہیں
 ناں میرے ساتھ..... اب میں پاس ہو جاؤں گی۔ میں
 نے ایسا کیوں نہیں سوچا کہ میرے فیل یا پاس ہونے میں
 ڈیڈی کا کیونکر حصہ ہو سکتا ہے مجھے جو کچھ کرنا ہے اپنی
 ہمت، حوصلے اور ذہانت سے کرنا ہے۔ ایسی سوچ میرے
 اندر پروان ہی نہیں چڑھ سکی۔ شاید اس لیے کہ آپ نے
 میرے اندر کے خوف کو باہر نہیں نکالا۔ میری سوچ کو صحیح
 سمت نہیں دی۔ مجھے بھاگنا دوڑنا تو سکھایا مگر ہمیشہ آپ
 میرے پیچھے پیچھے سائے کی طرح رہے کیونکہ آپ کو لگتا تھا
 کہ میں گر جاؤں گی۔ گرنے دیا ہوتا ڈیڈی مجھے..... آپ
 نے گرنے دیا ہوتا۔ کم از کم میں اتنی ڈرپوک اور بزدل تو نہ
 بنتی۔ آپ کے ہر وقت میرے ساتھ رہنے نے مجھے

دوست بھی نہیں بنانے دیے۔ میں نے آپ سے ہٹ کر
 پھر کسی کے متعلق سوچا ہی نہیں۔ آپ ہی میرے دوست
 تھے اور آپ ہی میرے ڈیڈی۔ اتنی محدود ہو گئی تھی میری
 زندگی پھر کیونکر میں کسی اجنبی شخص کے ساتھ خوش رہ سکتی
 تھی۔“ یہ کہہ کر روحا خاموش ہو گئی۔ اس کے لہجے کے
 پچھتاوے اور درد نے عماد الدین کو گھائل کر دیا تھا۔ وہ
 پرسوج انداز میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کچھ لمحے یونہی
 خاموشی کی نظر ہو گئے۔ روحا نے سر اٹھایا اور باپ کی طرف
 دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور جب وہ بولی تو
 اس کا لہجہ بھی آنسوؤں کی کمی سے بھیگ رہا تھا۔

”آپ دنیا میں سب سے اچھے باپ ہیں۔ آپ
 نے مجھے ماں اور بہن بھائیوں کے بغیر مکمل توجہ اور محبت
 سے پالا۔ مگر اس محبت نے ہم دونوں کو ہی دنیا سے الگ
 تھلگ کر دیا تھا ڈیڈی اور پھر اس حادثے نے جو آپ پہ
 گزرا، مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔“ یہ کہتے ہوئے روحا نے
 باپ کے ہاتھ تھام لیے۔

”جس روز آپ کو ہارٹ اٹیک ہوا اور میں نے
 آپ کو پل پل موت کے قریب جاتے دیکھا تو میں
 نے..... میں نے ڈیڈی! خود کو بے حد بے بس پایا۔ میں
 آپ سے اتنی محبت کرتی تھی مگر آپ کے لیے کچھ نہیں
 کر پار ہی تھی۔ اعلیٰ اسپتال اچھے سے اچھے ماہر ڈاکٹر.....
 خصوصی توجہ، اس کے باوجود آپ کی تکلیف دور نہیں
 ہو رہی تھی۔ وہ ساری رات قیامت بن کر آپ پر ہی نہیں
 مجھ پر بھی گزری اور پھر دن نکل گیا اور آپ پر جیسے بے ہوشی
 اور غفلت طاری ہو گئی اور آپ گہری نیند میں چلے گئے۔
 کچھ پل کے لیے ہی سہی آپ کو سکون تو ملا تھا۔ میں صرف
 آپ کے لیے دعا کر رہی تھی۔ نہ میں آپ کو حوصلہ دے
 سکتی تھی اور نہ اس درد کو آپ کے اندر سے نکال سکتی تھی۔
 پل پل مجھے آپ سے بچھڑ جانے کا خوف مارے ڈال رہا
 تھا۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ میرے اندر سے خود بخود
 وہ خوف باہر نکل گیا اور تب مجھے یہ ادراک ہوا یہ سب
 میرے اختیار میں نہیں ہے۔ خوف سے مغلوب ہو کر میں
 آپ کی زندگی نہیں بچا سکتی جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔
 میں کچھ نہیں کر سکتی۔ تب کوئی طاقت ایسی تھی جس کے سپرد

میں آپ کو اور خود کو کر کے خود بخود ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔ تب میرے دماغ پر کوئی بھی بوجھ نہیں تھا۔ سارا دن میں آپ سے نہیں مل پائی۔ آپ انتہائی نگہداشت میں تھے اور میں، میں جائے نماز پر..... میرے دل کو بھروسہ تھا کہ میرا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ ڈیڈی میں آپ کو بتا نہیں سکتی میرا یقین پل پل بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے سارے خدشے، واسے، وسوسے ختم ہو گئے تھے اور میں پورے یقین اور اطمینان سے اپنے اللہ جل شانہ کو پکار رہی تھی۔ میرا اللہ مجھے آہستہ آہستہ تھام رہا تھا۔ ایک انجانی سی طاقت میرے اندر آتی جا رہی تھی۔ یونہی وہ رات بھی گزر گئی۔ مجھے یاد ہے ڈیڈی! میں نے اس رات اپنے اللہ سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ بس اس لذت میں غرق ہو رہی تھی جو مجھے اس کی رفاقت میں میسر آئی تھی۔ میں ایک گناہ گار لڑکی... جس نے نماز پڑھی تو پڑھ لی یا پھر نہیں بھی پڑھی۔ کبھی میں نے اپنی کسی نماز میں اپنے دل میں اپنے رب کے لیے ایسا گداز نہیں پایا تھا جیسا اس رات مجھ پر منکشف ہو رہا تھا۔ میں اس کی رحمتوں کا نزول خود پہ محسوس کر رہی تھی۔ میرا وجدان، میرا دھیان، میرے اللہ کی طرف تھا اور یونہی وہ رات بھی گزر گئی۔ اگلے روز صبح آپ کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر مطمئن نہیں تھے۔ آپ کا آپریٹ ہونا لازمی تھا مگر مجھے مکمل یقین تھا۔ میرا دوست، میرا سونا اللہ مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ گزشتہ چھ ماہ میں، میں نے خود پہ اپنے اللہ کا خاص کرم پایا ہے۔ یہ کہہ کر روحا خود ہی ہنس پڑی۔ ”حالانکہ وہ تو ہمیشہ ہی کرم سے نوازتا آیا ہے مگر ہم خود ہی نادان اور اندھے ہیں۔“ عماد الدین روحا کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ روحا ہے۔

”فرزان کے یوں ایک دم اچانک آجانے کو میں کوئی معجزہ تو نہیں کہتی لیکن ڈیڈی! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اللہ ہمارے لیے کچھ بہتر کرنا چاہتا ہو۔ بھی اس نے فرزان کے دل میں نیکی ڈالی ہے۔ شاید میرا اللہ آپ کی تکلیف آپ کی سوچیں ختم کرنا چاہتا ہو۔ تاکہ آپ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔ کیوں نہ ہم فرزان کے یوں آجانے کو مثبت انداز میں سوچیں۔“ عماد الدین نے گہری سانس

چھوڑ کر روحا کے سر پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے مسکرائے۔ ”بے شک مجھے اپنے رب پر گمان ہے میری بیماری نے تمہیں ایک نئی سوچ اور نئی توانائیاں عطا کیں اور تمہارا رابطہ، بھروسہ، تعلق اللہ سے استوار ہوا۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے کون سی خوشی کی بات ہوگی۔ آج سے میں اس دل کے عارضے کو زحمت نہیں اس رب کی خاص رحمت سمجھوں گا جس نے میری بیٹی کو صحیح معنوں میں بھرپور سوچ سے نوازا اور شخصی کمزوریوں سے نکالا۔ مگر روحا بیٹی! ہمیں اپنے رب پہ تو یقین تھا، ہے اور رہے گا مگر یہ جو دنیا ہے ناں..... بے شک اسی رب کی بنائی ہوئی ہے مگر انسان بڑے ظالم اور مکار ہوتے ہیں۔ تم فرزان کے ساتھ جس طرح مرضی زندگی گزارو لیکن غافل مت ہونا۔ اللہ سے یاری لگائی ہے دعا کرتی رہنا کہ وہ تمہیں کسی آزمائش میں ڈال کر تمہاری محبت نہ آزمالے۔ فرزان کا تعلق..... بہت سے لوگوں سے وابستہ ہے۔ خاص طور پر اس کی ماں جو سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ تمہیں ہنسا بستا شاید نہ دیکھ سکے۔“

”آپ بے فکر رہیں یہ قصہ بھی پارینہ ہو چکا ہے۔ فرزان ہمیشہ کے لیے یہیں آچکا ہے۔ اس نے ماں سے تعلق ختم کر لیا ہے۔“

”ماں سے تعلق ختم کر لیا ہے.....؟“ عماد الدین کو یقین ہی نہ آیا۔ ”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ضرور ماں بیٹے کی ملی بھگت ہوگی۔“

”فارگاڈ سیک ڈیڈی۔ فرزان مجھے یہاں سے اٹھا کر تو نہیں لے جائے گا ناں۔ میں نے تو یہیں رہنا ہے آپ کے پاس۔ فرزان اگر یہاں رہے گا تو ٹھیک ہے ورنہ..... وہ خود راستہ چوائس کر لے گا اور رہ گئے اس کے گھر والے۔ مجھے پتا ہے ان میں سے کوئی یہاں نہیں آئے گا اور فرزان کی مدد تو ہر گز نہیں۔ بقول ان کے میں تو بہت بڑی جادوگر نی ہوں، میرے جادو میں اتنی طاقت کہاں کہ فرزان کی امی کو رام کر سکوں۔“ عماد الدین ارشاد بیگم کی توہم پرستی سے بخوبی واقف تھے۔ تھوڑا سا ہنس پڑے اور طنزیہ بولے۔

”فرزان کے یہاں آنے کو بھی وہ جادو سے

محمول کر رہی ہوگی۔ نادان اور کم عقل عورت.....“

روحاناسف سے مسکرائی تھی۔

”اتنی دیر سے باتوں میں لگا رکھا ہے جبکہ میں آپ کو دوا دینے آئی تھی۔“ روحاناسف ڈیبل سے ان کا میڈیسن باکس نکال کر ٹیبلٹ ڈھونڈنے لگی۔

”اگلے مہینے جب میں آپ کا چیک اپ کرانے لندن جاؤں گی تو ہم ٹورنٹو اور آئرلینڈ بھی گھوم کر آئیں گے۔ بس آپ جلدی جلدی اچھے ہو جائیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ ان کی طرف بڑھائی تو عماد الدین اثبات میں گردن ہلا کر ہنس پڑے۔

☆☆☆

”ہوش آیا اسے.....؟“ انسپکٹر رشید اکبر نے وارڈ میں داخل ہو کر آفیسر سے انفارمیشن لی۔

”تھوڑی دیر تک ہوش آجائے گا سر! ایسی کوئی خاص پرابلم نہیں لگتی بظاہر کمزوری ہی دکھائی دیتی ہے۔“ ایس ایچ اورب نواز نے ڈاکٹرز کی اطلاع باہم پہنچائی۔

”اس کی بلڈ پریشر وغیرہ سب آگئی ہیں۔ ڈرگز وغیرہ کا کوئی معاملہ نہیں ہے البتہ اس کے جسم پر عجیب طرح کے نشان ہیں۔ یہ دیکھیں چہرے اور ہاتھوں پر بھی..... یہ شاید چوٹیں ہیں یا اس پر تشدد ہوتا رہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے سر یہ شخص کسی کی حراست میں تھا۔ وہاں سے فرار ہوا ہے کیونکہ یہ ننگے پاؤں تھا اور اس کی ٹیچس اور شلوار کی جیب میں تنکا تک بھی نہیں تھا۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ حراست سے فرار ہوا ہے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ شخص اغوا ہو کر یہاں پہنچایا گیا ہو کیونکہ اس کا حلیہ علاقائی نہیں لگتا۔“

”ایک ہی بات ہے سر! اغوا ہونا یا اغوا والی جگہ سے فرار ہونا۔“

”چلو..... تھوڑی دیر تک اسے ہوش آجائے گا۔“ تھوڑی دیر میں ڈاکٹرز کی ٹیم بھی وارڈ میں داخل ہو گئی۔ انسپکٹر رشید اکبر ڈاکٹرز سے نیکے کے بارے میں معلومات لینے لگا۔

”یہ ایسے ہی گنوار، جاہل سا شخص لگتا ہے۔ لگتا ہے بے روزگاری کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو رہی ہے۔“

آپ اس کیس میں بے کار میں سرکھپائی کر رہے ہیں۔“ ایک جونیئر آفیسر نے اپنی طرف سے رائے دی تو انسپکٹر رشید اکبر بھڑک گیا اور غصے میں بولا۔

”آپ جیسے غیر سنجیدہ اور فرض سے غافل افسران ہی کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آئے دن شہروں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اور آپ لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔“

”آئی ایم سوری سر.....“ جونیئر آفیسر شرمندہ ہو گیا۔

”انہیں ہوش آ گیا ہے۔ آپ چاہیں تو ان سے سوالات کر سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے نیکے کو ہوش میں پا کر اطلاع کی۔ انسپکٹر رشید، نیکے کے بستر کے قریب چلا گیا اور اس سے سوالات کرنے لگا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟ کہاں کے رہنے والے ہو، کیا کام کرتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ.....“ نیکے نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں ڈاکٹر کی فوج کی طرف دیکھا پھر سامنے کھڑے پولیس والوں کی طرف..... اس کا گھبرا جانا یقینی تھا۔ وہ خاموش تھا کہ اچانک کچھ لوگ اندر آئے وہ مختلف چینلز کے صحافی تھے۔

”سر ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ نے ایک خودکش حملہ آور کو زندہ سلامت پکڑ لیا ہے۔ سر ہم اس کی فوج لائیو دکھانا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں گے کہ اس خودکش حملہ آور کا تعلق کس علاقے سے تھا اور اس کے کون سے مذموم عزائم تھے۔“

”واٹ نان سینس۔ آپ سے کس نے کہا ہے کہ یہ خودکش حملہ آور ہے۔ ابھی تو پولیس نے بھی تحقیق نہیں کی اور آپ لوگ.....“ انسپکٹر رشید بھناٹھا۔

”سر! معلوم ہوا ہے کہ چند خودکش حملہ آور اسلام

چھوٹے موٹے مکان تھے۔ ہاں، وہاں ایک گرجا گھر بھی تھا۔ روز اس کی گھنٹی کی آواز مجھے سنائی دیتی تھی۔“
”کیا تم نے باہر نکلنے کے بعد اس چرچ کو دیکھا تھا۔“

”نہیں سر، میں نے وہ چرچ نہیں دیکھا۔“
”ہو سکتا ہے وہ چرچ کچھلی سائڈ پر ہو۔“ انسپکٹر رشید اکبر خود ہی بولا۔ ”گڈ..... اب ہمیں وہ جگہ تلاش کرنے میں زیادہ مشکل نہیں آئے گی۔ کون سا رنگ بتایا تھا تم نے اس عمارت کا.....؟“

”پیلا، پیلا سا تھا سر.....“
”ضرور، یہ جگہ شہر سے الگ ہے۔“ وہ پُرسوج انداز میں کہہ رہا تھا۔

”گاؤں میں کسی سے دشمنی تو نہیں تھی تمہاری؟“
”نہیں جی، ہم کمی کین لوگوں کی کس سے دشمنی ہو سکتی ہے۔“

”تو تم گاؤں سے شہر تک کیسے آئے۔ تمہیں پتا نہیں چلا..... تم نے شور نہیں مچایا۔ کسی کو مدد کے لیے نہیں بلایا۔“
”فیر کا اپنی یادداشت پہ زور ڈالنے لگا۔

”چھ ماہ پہلے کیا ہوا تھا وہ جانوروں کا چارہ لینے کے لیے نکلا تھا۔ کسی نے پیچھے سے آکر اس کی ناک پہ کچھ رکھا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ شور مچانا چاہتا تھا مگر بے دم سا ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے بہت چاہا کہ دیکھے کہ کون لوگ ہیں لیکن کسی آنکھوں پہ پٹی باندھ دی اور بس پھر وہ غافل ہو گیا۔ جانے اس کی آنکھوں پہ پٹی کب سے بندھی۔ جب اس نے آنکھوں سے پٹی اتاری تو بہت دیر تک کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ کوئی انجان سی جگہ تھی۔ جو گاؤں کی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ باہر ٹریفک کا بھی بہت شور تھا۔

”ٹریفک کا شور.....!“ انسپکٹر چونکا۔ ”یعنی جو بھی جگہ ہے وہ لب سڑک ہے..... اگر ان لوگوں کو تمہارے سامنے لایا جائے تو پہچان لو گے؟“

”میرے پاس تو سر ایک ہی شخص آتا تھا۔“
”یعنی وہ باس نہیں تھا، ملازم تھا؟“
”ایسا ہی لگتا تھا سر۔“

آباد اور لاہور میں داخل ہو گئے ہیں۔“
”آئی ایم سوری۔ بنا تفتیش کے ہم لوگ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پلیز انہیں باہر نکالیں۔“ انسپکٹر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور چینلو والوں کو باہر نکال دیا گیا۔
اگلے ہی پل ملک کے تمام چینلوں پر ایک خود کش حملہ آور کے بارے میں اطلاع نشر ہو گئی۔ انسپکٹر رشید اپنی تفتیش میں لگا ہوا تھا۔ پہلے پہل سوالات میں توفیر کا گھبراہٹ پھر اس نے سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ گاؤں کا رہائشی ہے۔ اسے اغوا کر کے جہاں رکھا گیا وہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے جو قید میں تھے۔
”کیا کہتے تھے وہ لوگ تم سے..... کوئی خاص کام کرواتے تھے.....؟“

”نہیں، بس مارتے تھے اور کچھ نہیں۔“
”کوئی خاص ٹریننگ دیتے ہوں۔ کوئی خصوصی درس وغیرہ۔“

”پتا نہیں، مجھے تو ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا لیکن وہ جگہ بہت بڑی تھی۔ باہر سے بندوقیں چلنے کی بھی آوازیں آتی تھیں۔“

”ہوں..... ضرور کوئی تربیت گاہ ہوگی۔“
”ہمیں بتاؤ گے کہ وہ جگہ کہاں ہے؟“
”نہیں جی، میں تو راستے بھی نہیں جانتا۔ ہاں البتہ اگر وہاں مجھے لے جایا جائے تو میں جگہ پہچان لوں گا۔“

”یعنی تم علاقے کو پہچان لو گے؟“ اس سوال پر فیر کا پھر متذبذب ہو گیا اور سوچتے ہوئے بولا۔

”علاقہ تو شاید نہ پہچان سکوں، ہاں لیکن سر! میں جب وہاں سے نکلا تو اس قید خانے کے سامنے ایک بہت بڑی خالی زمین کچرے کے ڈھیر سے بھری ہوئی تھی اور وہاں ایک لوہے کی بہت اونچی سی سیڑھی بھی بنی تھی۔“

”یہ موبائل ٹاور کی بات کر رہا ہے سر!“ جو نیر آفیسر نے فیر کے تشبیہ کی ترجمانی کی۔ انسپکٹر رشید نے تائید کی۔

”اس کے علاوہ ارد گرد وہاں کوئی خاص عمارت ہو؟“
”ارد گرد تو جی بس خالی جگہیں ہی تھیں۔ دور دراز

سے نکلا۔“

”کیوں نشہ پی کر سوتے ہو تم لوگ؟ جو تمہیں پتا نہیں چلا۔ اگر وہ کمیں سیدھا گاؤں پہنچ گیا تو دو کوڑی کی بھی عزت نہیں رہے گی ہماری۔“

”آپ فکر نہ کریں صاحب۔ ہمارے آدمی یاگل کتوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں اسے۔ دو بندوں کو بھی خفیہ طور پر گاؤں بھیج دیا ہے اگر فیکا ادھر نظر آیا تو گولی مار دیں گے اسے۔“

”ہاں..... تاکہ آسانی سے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں اٹک سکے۔“ ملکو غصے سے چلایا۔ ”ایسی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی شہر آ رہا ہوں۔“ غصے سے بے حال ہوتے ہوئے ملکو نے فون پٹخا اور شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☆☆☆

ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی ارشاد بیگم اور شمع کے فون پہ فون آنے لگے۔ ”تم ٹھیک تو ہونا زین اپنا خیال رکھنا۔ دروازہ بند کر کے سونا۔ کسی سے فری مت ہونا۔ کسی سے زیادہ قریب مت ہونا۔“ وہ پہلے ہی حواس باختہ تھی اوپر سے یہ میلی فون کالز اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ کامران ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں سے ہو کر گیا تھا۔

”زیب آپ ایسا کریں فریش ہو کر ڈانگ ہال میں آجائیں۔ یونٹ کے ہمراہ ڈنر کر لیں۔ پھر ہم لوگ کل کی شوٹنگ کے بارے میں کچھ ریہرسل کر لیں گے۔ بلکہ جس سوئنگ پہ آپ کو موومنٹ اور ایکسپریشن دینے ہیں وہ بھی آپ کو دیکھنے کا موقع مل جائے گا، اوکے؟ جلدی آجائیں۔“

”شوٹنگ..... ریہرسل..... سوئنگ..... موومنٹ، ایکسپریشن۔“ کیا کہہ رہا تھا کامران۔ اسے خاک بھی پلے نہ پڑا اور وہ حواس باختہ سی ایسے ہی بیٹھی رہی۔ کافی دیر یونہی پریشان سی رہی تب ویٹرنے آ کر کہا کہ سب لوگ کھانے پر اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

”کھانے پر.....!“ اس کی روح فنا ہو گئی۔ وہ کیسے چیخ سے میز پر بیٹھ کر کھائے گی۔ حالانکہ شمع نے اسے اس

”تم نے کبھی سنا ہو وہ لوگ آپس میں کیا باتیں کرتے تھے؟“

”پتا نہیں سر..... وہاں آوازیں تو بہت آتی تھیں مگر پتا نہیں لگتا تھا۔“

”یہ تمہارے جسم پہ نشان کیسے ہیں؟“ فیکا رونے لگا۔

”سر..... میں جس کھڑکی سے نکل کر بھاگا تھا وہ بہت چھوٹی تھی اور اس میں لوہا لگا ہوا تھا اور خاردار تاریں۔ جب میں اس میں گھسا تو مجھے لگا میرا وجود اس میں کٹ جائے گا اور میں یہیں مرجاؤں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بچا لیا اور میں وہاں سے بھاگ نکلا۔“ یہ کہہ کر فیکا رونے لگا۔

”مجھے اپنے گاؤں جانا ہے سر!“

”چلے جانا..... بلکہ ہم تمہیں خود چھوڑ کر آئیں گے۔ تھوڑی سی قانونی پیچیدگیاں ہیں، یہ کھل جائیں پھر تم آزاد ہو۔ ویسے بھی تم اب اس طرح گاؤں میں جا بھی نہیں سکتے۔ تمہاری جان کو خطرہ ہے کیونکہ تم گاؤں سے ہی اغوا ہوئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دشمن گاؤں میں ہی چھپا بیٹھا ہو۔ اس لیے جب تک مجرم گرفتار نہیں ہو جاتا تم پولیس کی حراست میں خود کو محفوظ سمجھو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔“

”سر..... لاہور میں خود کش دھماکا ہوا ہے۔ بہت جانی نقصان ہوا ہے۔“

”واٹ نان سینس.....!“ انسپکٹر رشید نے بھنا کر کنپٹیاں تھام لیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے اپنی ستارے والی ٹوپی سر پر جماتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی بھی مشکوک جگہ اور مشکوک سواری اور مشکوک انسان سے غفلت برتنے کا مطلب صرف اور صرف موت تھا۔ انسپکٹر رشید نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور اس ٹھکانے کا پتلا لگا کر رہے گا۔

☆☆☆

”سور کی اولادوں، تمہیں نمک حرامی کے لیے رکھا ہوا ہے میں نے۔ وہ کل سے فرار ہے اور تم مجھے آج اطلاع دے رہے ہو۔“

”صاحب، ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب یہاں

چھوڑ دیں۔ میں مرجاؤں گی۔ ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔“

اس نے جو رونا شروع کیا تو کامران گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ پھر بہت دیر کے بعد بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ آرام کریں۔ ہم صبح بات کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

”فرح یار، تمہیں یہاں آنا پڑے گا میں واقعی بہت مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ سارا یونٹ تیار ہے مگر وہ لڑکی انکاری ہو گئی ہے۔“ کامران اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ پھر وہ بہت دیر تک زمین کے متعلق فرح کو بتاتا رہا۔ فرح نے بتایا کہ وہ کل صبح کی فلائٹ سے پہنچ رہی ہے۔ کامران کی ساری الجھن دور ہو گئی۔

”پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے جب فون ملاؤ کاٹ دیتی ہے یا فون بزی رہتا ہے۔ آخر چکر کیا ہے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ مجھے تو یہ کامران ہی کوئی فراڈ یا لگ رہا تھا مگر اس کی ماں تو بیس مرلے کی کوٹھی میں بڑے مزے سے بیٹھی ہے۔ یہ تو خدشہ نہیں کہ وہ اسے بھگا کر لے جائے گا مگر کمبخت فون یہ بات کیوں نہیں کراتا۔“ شمع نے بے زاری سے ماں کی طرف دیکھا۔

”آپ کو تو ہر کام کی جلدی رہتی ہے جبکہ ایسے کاموں میں وقت بہت لگتا ہے۔“

”ہاں، تمہیں تو تجربہ ہے نا..... ایسی کون سی نمبرون ہیروئن بن گئی ہے وہ جو اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ فون دو، میں خود ملا کر پوچھتی ہوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔“ ماں کے تیز دیکھ کر شمع نے ماتھا پیٹ لیا۔

”خدا کے واسطے ماما کچھ صبر کریں اور بار بار فون ملا کر وہاں یہ ظاہر نہ کریں کہ ہمیں زمین پہ یا کامران پہ بھروسہ نہیں ہے۔ اس سے ان لوگوں کا ہی نہیں ہمارا بھی امیج خراب ہوتا ہے۔ اب ہم ایک موڈ علاقے میں رہ رہے ہیں۔ اپنی سوچ کو اوپر لائیں۔ ویسے بھی کوئی سیریل یا فلم تو ہے نہیں جو مہینوں ہم اس مشکل میں پھنسے رہیں گے۔ بقول کامران صاحب۔۔۔ ہفتے دس دن کا کام ہے۔ وہ خود ہی زمین کو یہاں چھوڑ کر جائیں گے۔ آپ کو

کی بھی پریکٹس کرائی تھی مگر صرف پریکٹس کرنے سے تو وہ ماڈرن نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے لیے تو پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری تھا جبکہ وہ پانچ کلاس ہی پڑھی ہوئی تھی۔

کس عذاب میں پھنس گئی تھی وہ۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ انکار کر دیتی۔ کیسے بھگتائے گی یہ سب کچھ۔ اسے خود پر رونا آ رہا تھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ایسا کرو مجھے کھانا یہیں لا دو۔“ کھانا تو اوپر آ گیا مگر شوٹنگ کے لیے تو اسے نیچے ہی جانا تھا۔ یوں پھنسی ہوئی پینٹ شرٹ میں سب کے سامنے جاتے ہوئے اسے سخت شرمندگی اور ندامت ہو رہی تھی۔

رات گئے کامران اس کے کمرے میں آیا تو وہ کچھ خفا سا تھا۔ ”سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔“ زمین نے اسے دیکھ کر نظریں چرائیں۔

”ٹھیک ہے فی الحال آپ کا موڈ نہیں تھا کام کرنے کا تو نہ کریں۔ کم از کم دوسرے لوگوں کا تو کام دیکھیں اس سے آپ کو سیکھنے کا موقع ملے گا۔ کام کرنا آئے گا۔ کرنے سے کام آتا ہے۔ یوں تو نہیں کہ بیٹھے بیٹھائے انسان شہرت کو چھونے کے خواب دیکھنے لگے۔“ وہ اس کے ٹس سے مس نہ ہونے پہ جھنجھلا سا گیا تھا۔

”میں کسی شہرت کے خواب نہیں دیکھ رہی کامران صاحب۔ آپ خود.....“

”اوکے..... اوکے..... میں سمجھتا ہوں آپ کی فیلنگز..... واقعی آپ کے لیے سب کچھ نیا اور مشکل ہے مگر ہم لوگ آپ کی مکمل سپورٹ کریں گے۔ آپ فکر کیوں کر رہی ہیں۔“ کامران نے رسان سے سمجھایا تو زمین نے رونا شروع کر دیا۔ اسے دادی بہت یاد آرہی تھیں۔ اسے کیا پتا تھا صرف دادی کے چلے جانے سے پوری دنیا جہنم بن جائے گی۔

”مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا کامران صاحب۔ جیسا آپ چاہ رہے ہیں۔ میں ایسا کچھ بھی نہیں کر پاؤں گی۔ آپ صرف اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔ مجھے میرے حال پہ

اطمینان رکھنا چاہیے۔ فضول میں آپ اپنی انرجی ویسٹ کر رہی ہیں۔ فرزان کی فکر ہے آپ کو کچھ ایک ماہ ہو گیا ہے اسے اور اس نے فون کر کے اپنی خیریت کا بھی نہیں بتایا۔ میں فون ملاتی ہوں تو کوئی اسٹینڈ نہیں کرتا۔“ شمع نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ حالانکہ شمع کی فرزان سے دو تین بار بات ہو چکی تھی اور اس نے یہی بتا رکھا تھا کہ وہ اپنے دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے اور اب اس کی انجری بھی بہتر ہے۔ وہ کب آئے گا آئے گا بھی یا نہیں۔ اس کے بارے میں فرزان نے فی الحال کچھ نہیں بتایا تھا۔ فرزان کے ذکر پر ارشاد بیگم کے دل کو کچھ ہوا اور وہ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بددعا دینے لگیں۔

”جتنا دل اس نے دکھایا ہے میرا اتنا کسی نے نہیں دکھایا۔ مجھے گھر سے بے گھر کر دیا اور تم کہتی ہو کہ میں اسے فون کر کے حال احوال لوں۔ گھر بلاؤں اسے..... تمہیں میرے دکھ کا اندازہ ہی نہیں۔ اگر یہ کرایوں کا آسرا نہ ہوتا تو ہمیں تو ایک طرح سے سڑک پر بٹھا گیا تھا وہ.....“ ارشاد بیگم نے جو رونا شروع کیا تو شمع خود پریشان ہو گئی۔

”نہ جانے خود کتنا سمیٹ کر لے گیا ہے جو شکل تک نہیں دکھا رہا۔“ ماں کی بدگمانی پر شمع بری طرح چوکی تھی۔ ایسا ممکن بھی تھا اور نہیں بھی وہ کیا ضمانت دے سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے ماما ہی ٹھیک ہوں۔ وہ ماں کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ارشاد بیگم رو رہی تھیں۔

”میں مز بھی جاؤں ناں تو اسے میری شکل مت دیکھنے دینا۔ اللہ کرے اس طرح ہی برباد ہو وہ جیسے مجھے برباد کر کے گیا ہے۔ میں نے تو جیتے جی ظہور احمد یہ مٹی ڈال دی۔ فرزان پہ بھی ڈال دوں گی اور ظہور تو کسی کچھی لائق نہیں۔ یہ پوت میں نے اس لیے مانگے تھے کہ مجھے پوں بڑھاپے میں رسوا کریں گے۔ میرا بڑھاپا کسی کو نظر نہیں آتا۔ اور تم بھی جب دل کرتا ہے کبھی ظہور کی حمایت کرتی ہو تو کبھی فرزان کی۔ کیا ان کا عمل ایسا ہے کہ میں انہیں معاف کروں۔ پہلے غیور چھوڑ کر چلا گیا اور اب فرزان۔ بھلے سے ساری اولاد مجھے چھوڑ کر چلی جائے۔ اپنے پیروں کے آستانوں پر فقیرنی بن کر بیٹھ جاؤں گی مگر اولادوں کو معاف نہیں کروں گی۔ نہیں دیکھوں گی اب ان

UrduPhoto.com

کی شکلیں۔“ ارشاد بیگم رور ہی تھیں۔ شمع بھلا کیا کہتی زمین سر جھکائے ماں کے پاس بیٹھی رہی۔

☆☆☆

فرح کے آنے سے زمین کو بہت ڈھارس ملی تھی۔ فرح خوش شکل، ہنس مکھ اور باتونی خاتون تھی۔ اس نے آدھے ہی گھنٹے میں زمین کا سارا خوف اور اجنبی پن دور کر دیا تھا۔ فرح کی موجودگی میں زمین یونٹ کے درمیان میں آئی وہاں دوسرے لوگوں کا کام دیکھا۔ جو کمرشل میں رول ملے زمین نے کرنا تھا ایزاے ماڈل فرح نے بار بار وہ سب گو کر کے دکھایا۔ پھر زمین کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیا اور اسے ویسے ہی کرنے کو کہا جیسا وہ خود کر رہی تھی۔ پورا دن اسی جدوجہد میں گزر گیا مگر زمین کچھ بھی نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کا خوف اور چہرے کی سنجیدگی بھی زائل نہ ہو سکی تھی۔

”فارگاڈ سیک.....“ کامران جھنجلا گیا۔

”کم از کم اسمائل تو نکلاؤ اس کی۔“ وہ فرح پہ جھلارہا تھا۔ فرح نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ وہ علیحدگی میں کامران سے کہنے لگی۔

”ان تلوں سے تیل نہیں نکلنے والا۔ تم نے خواجواہ رسک لیا ہے۔ اس سے بہتر تو تم مجھے ہی ماڈل رکھ لیتے۔ آخر میری بیوٹی میں کس چیز کی کمی ہے۔ لائیو، مارننگ شو کرتی ہوں۔ دو گھنٹے میں دو لاکھ ایکسپریشن، باڈی لینکوتج کری ایٹ کرنا ہوتی ہیں۔ مجھ سے زیادہ تمہیں اور کون سی ماڈل سوٹ کر سکتی ہے۔“ وہ کامران کو ہمیشہ ایسے ہی چھیڑا کرتی تھی۔ کامران سخت بد دل سا ہو رہا تھا۔ فرح کو گھورنے لگا۔

”تمہیں مذاق سو جھ رہا ہے اور..... میرا.....“

”نقصان نہیں ہوگا۔ بے فکر رہو..... لڑکی واقعی ہیرا ہے اگر تھوڑا سا حرکت میں آجائے۔ مجھے کچھ وقت دو میں اسے اکیلے میں تیار کرنے کی کوشش کروں گی۔“ پھر فرح نے ایسا ہی کیا، ذات اکیلے میں اسے تیاری کرائی۔ اکیلے میں کم از کم زمین نے حرکت تو کی تھی مگر وہی آنکھوں کی حیرانی اور چہرے کی سنجیدگی ہنوز باقی تھی۔

”اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔“ فرح تھک کر بیٹھ

گئی۔

”ہنسو یار، ہنسو، کھلکھلاؤ۔ انجوائے کرو.....“

ہزاروں لڑکیاں آڈیشن کے لیے تڑپتی پھر رہی ہیں اور تمہیں تو بیٹھے بٹھائے چانس مل گیا ہے۔ تمہیں نیوی پہ آنے کی دیر ہے دیکھنا کہاں سے کہاں چلی جاؤ گی۔“ فرح اپنے تئیں لالچ دے رہی تھی۔ فرح کی بات پہ زمین پاتال میں چلی گئی۔ اس کے اندر کے سناٹے اور بھی گہرے ہو گئے۔ وہ اس راستے پہ چلنا نہیں چاہتی مگر..... اسے مجبور کیا جا رہا ہے۔ کیوں..... وہ رونے لگی تھی۔ فرح نے سرینڈر کر دیا۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے، میں بھی تھک گئی ہوں اور تم بھی رور ہی ہو۔ بہتر ہے کہ آرام کر لیتے ہیں۔“ فرح وہیں پر گئی۔ زمین گم صمم بیٹھی رہی۔

”گھر والے یاد آ رہے ہیں؟“ فرح کا سوال کتنا عجیب تھا۔ زمین اپنے اندر جھانکنے لگی۔ یاد تو اسے صرف دادی آتی تھیں۔ جو کہ اب اس دنیا میں نہیں تھیں..... باقی گھر والے وہ..... وہ اس کے کچھ نہیں لگتے تھے۔ زمین نے اپنے بارے میں بولنا شروع کیا تو بس بولتی چلی گئی۔

”تو گویا یہ پر اہلم ہے تمہارا۔“ فرح سوچ میں پڑ گئی۔ پھر زمین کو حوصلہ دینے لگی۔ ”دیکھو..... جو کچھ تم نے بتایا ہے تمہارا دنیا میں کوئی ہمدرد نہیں ہے۔ تمہیں اپنے لیے خود مضبوط ہونا ہے۔ اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا پڑے گا۔ تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ زیب، سب کچھ..... اپنے خول سے باہر آؤ۔ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔“ فرح کی باتیں زمین کو ڈھارس دے رہی تھیں۔ اس کی سوچ بدل رہی تھیں۔ اسے زندگی کو نئی طرح گزارنے کا سبق دے رہی تھیں۔

”دیکھو، تم صرف ایڈ کر رہی ہو۔ فلم وغیرہ نہیں۔“

جہاں تمہیں لباس پہ اعتراض ہوگا یا سین وغیرہ فلمبند کرانے پر۔ عام سے لباس میں تمہیں صرف ہنستے مسکراتے ہوئے ایک دو ہچکولے کھانے ہوں گے، آئی مین..... ماڈلنگ کرنا ہوگی۔“ فرح کی بات پہ زمین کو ہنسی آ گئی۔ ہنستے ہوئے وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ فرح زمین پہ سے نظریں ہٹانا بھول گئی۔

☆☆☆

”دس دن کی دن رات مشقت کے بعد بالآخر تمہارا ایک منٹ کا ایڈ تیار ہو ہی گیا۔ بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔“

”مبارکباد کی اصل حقدار تم ہو۔ تم نے پتھر تراش کر ہیرا نکال کر دیا ہے مجھے۔“ کامران کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ زمین کا پوسٹر دیکھ رہا تھا جسے سائن بورڈ کی شکل میں آویزاں کرنا تھا۔

”بس ہم لوگ آج ہی نکل رہے ہیں، مہی سے مل آؤں۔ انشا اللہ پھر میں لاہور ہی آ رہا ہوں۔“ اس نے فرح سے بات کر کے فون آف کر دیا اور ساری ٹیم کو اطلاع کی کہ وہ آج شام روانہ ہو رہے ہیں۔

زمین کو گھر جانے کی نہ تو خوشی تھی اور نہ ہی غم۔ وہ چپ چاپ بیک بند کرنے لگی۔ فرح سے مل کر اسے خاصا اچھا لگا تھا اور اس چیز کا اظہار اس نے کامران کے سامنے کیا تو کامران ہنس دیا۔

”اصل میں واقعی وہ ہے ہی ایسی۔ منٹوں میں سب کو دوست بنا لیتی ہے بھی تو مارننگ شو اس کا کامیاب جا رہا ہے۔“

”پہلی بار جب میں نے انہیں دیکھا تو مجھے لگا ہی نہیں کہ وہ شادی شدہ ہیں اور تین بچوں کی ماں ہیں۔“ کامران نے کھل کر قہقہہ لگایا۔

”پھر یہ تو میری خوش نصیبی ہوئی ناں!.....“ وہ زمین کی طرف ذرا سا جھکا اور ذومعنی لہجے میں کہنے لگا۔ ”آپ بھی شادی کے بعد اپنا دھیان رکھیے گا ایسا نہ ہو کہ ہم ایک اچھی ماڈل سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔“

شادی کے ذکر پر زمین کا چہرہ متغیر ہوا اور پھر لمحوں میں اس نے خود کو سنبھال لیا۔ فرح نے کہا تھا کہ یہ جو چہرہ ہوتا ہے ناں یہی سب کچھ ہے، اس کا بہت دھیان رکھنا۔ کام کرتے ہوئے بھی اور کام سے باہر بھی۔ سبھی تم اس فیلڈ میں کامیاب رہ سکتی ہو اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

آتے ہوئے وہ جتنی ہراساں اور پریشان تھی۔ جاتے وقت خاصی پُر اعتماد دکھائی دے رہی تھی۔ یہ تبدیلی کامران نے واضح محسوس کی تھی۔

☆☆☆

”ظہور کو بالکل نہ پتا چلے کہ تم کہاں گئی تھیں۔“
 زمین کی ساری روداد سننے کے بعد ارشاد بیگم نے سختی سے
 کہا تو شمع کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”تم میرا مذاق اڑا رہی ہو.....“ ارشاد بیگم کو غصہ آیا
 تو شمع سے پہلے زمین نے کہا۔

”میں ٹی وی پہ آرہی ہوں۔ ایسا کیسے ممکن ہے کہ یہ
 بات چھپ جائے۔“

ارشاد بیگم دل ہی دل میں نادیم سی ہوئیں۔ یہ بات
 گنوار زمین کو پتا تھی اور ارشاد بیگم کو نہیں۔ اس سبکی کو مٹانے
 کے لیے ارشاد بیگم نے چرب زبانی سے کام لیا۔

”جانتی ہوں میں یہ سب کچھ مگر اتنی جلدی بھی کیا
 ہے سب کچھ بتانے کی۔ کچھ دیر ٹھہر کر بتا دینا۔ ایسا ہی کم
 عقل اور بد دماغ لڑکا ہے۔ کوئی ہنگامہ ہی کھڑا نہ
 کر دے۔“

”کیوں، وہ کون ہوتا ہے زمین کی زندگی میں دخل
 اندازی کرنے والا۔ یہ زمین کی اپنی زندگی ہے چاہے جیسے
 مرضی گزارے۔ جب اسے خود پہ نکتہ چینی پسند نہیں تو وہ
 اوروں پہ کیوں کرے گا۔“ شمع کی بات پہ ارشاد بیگم کو تسلی
 سی ہوئی۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی ارشاد بیگم کو ظہور کی بد دماغی
 سے خوف ہی رہتا تھا۔

”اچھا اب تم لوگ آرام کرو۔ میں بھی سونے
 جا رہی ہوں۔ اور تم یہ کپڑے بدل لو۔ گھر میں تو سادے
 ہی کپڑے اچھے لگتے ہیں۔“ ارشاد بیگم کو اچانک زمین کے
 حسن سے حسد محسوس ہوا تھا یا خوف آنے لگا تھا، وہ خود بھی
 سمجھ نہیں پائی تھیں۔ زمین بلا چوں و چرا کپڑے بدلنے چلی
 گئی۔ حالانکہ اس کا ارادہ تھا کہ کپڑے نہیں بدلے گی انہی
 ماڈرن کپڑوں میں گھر میں چلے پھرے گی تو اسے ایسے
 لباس کی عادت ہو جائے گی۔ کامران نے بتایا تھا کہ یہ
 کمرشل آن ائر آنے کی دیر ہے اس پہ آفرز کی بھرمار
 ہو جائے گی مگر اسے وعدہ کرنا ہوگا کہ وہ صرف کامران کے
 ساتھ ہی کام کرے گی اور کسی کے ساتھ نہیں۔ اس نے کسی
 بھی قسم کا وعدہ نہیں کیا تھا اور اسے کیا ضرورت تھیں کہ آگے
 بھی کام کرے گی وہ چپ چاپ بستر میں لیٹ گئی۔ اسے
 دادی یاد آنے لگی تھیں۔ دادی کہتی تھیں۔

”زمین دوپٹے کو سر پر رکھا کر۔“ دادی نماز کی بھی تو
 سخت تلقین کرتی تھیں۔ کہاں گئی وہ عادت جو دادی نے
 بچپن سے ڈالی تھی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی اس نے
 ارشاد بیگم اور شمع کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا..... تو کیا اس
 نے خود کو ان کی صحبت میں رنگ لیا تھا جو نماز ترک کر دی
 تھی۔ کیوں غافل ہو رہی تھی وہ نمازوں سے۔ یکدم اسے
 بے چینی نے آن گھیرا۔ شمع اور اس کے بچے خواب خرگوش
 کے مزے لے رہے تھے۔ وہ بستر چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ کچھ
 دیر باہر پہلے رہی پھر وضو کیا اور نماز عشا ادا کرنے لگی۔ دعا
 کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دادی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے
 آ گیا۔ زمین کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ بہت دیر تک
 وہ روتی رہی دل کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ جائے نماز سے اٹھ
 کر وہ کمرے میں آئی تو ٹھٹھن اور بھی بڑھ گئی۔ نیند اب بھی
 نہیں آرہی تھی۔ وہ دادی کے کمرے میں چلی گئی اور کافی
 دیر تک ایسے ہی دادی کی چیزوں کو ٹٹولتی رہی۔ دادی کے
 کپڑے اور ان کی ضرورت کی اشیا جوں کی توں تھیں۔ وہ
 دادی کے کپڑے گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ کبھی ان کپڑوں کو
 سینے سے لگاتی، کبھی آنکھوں سے۔ اشک تھے کے رکنے کا
 نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ بالآخر اس نے وہ سب کچھ
 رکھ دیا پھر دادی کا خاص صندوق کھولا جس میں قیمتی اشیا
 تھیں۔ دادی اس کے سامنے اٹھا کر لائی تھیں اور اسے
 سب کچھ پتا تھا کہ اس میں کیا کچھ ہے۔ جب زمین نے
 صندوق کھولا تو کیا دیکھتی ہے اس میں صرف چند کپڑے
 ہی پڑے ہیں اور باقی کچھ بھی نہیں ہے۔

”کہاں گیا سب کچھ.....؟“ وہ یکدم پریشان
 ہو گئی۔ ادھر ادھر ڈھونڈا کچھ نہ ملا۔ حالانکہ صندوق میں تالا
 لگا ہوا تھا مگر چابی بھی یہیں رکھی رہتی تھی۔ آخر کس سے
 پوچھے، رات کے دو بجے وہ کس سے پوچھتی۔

اسی پریشانی کی حالت میں رات گزری۔ ساری
 رات نیند ہی نہ آئی۔ نہ جانے کب آنکھ لگی تھی اور وہ کب
 تک پڑی رہتی۔ ارشاد بیگم کی آواز کانوں میں آرہی تھی
 جب اس کی آنکھ کھلی۔ ”دن کا ایک بج رہا ہے اور وہ میڈم
 پڑی سو رہی ہے۔ اسے اٹھاؤ جا کر..... ماسی نہیں آئی ہے
 اس نے صفائی بٹھی کرنی ہے اور کپڑے بھی دھونے ہیں۔“

زبین کسلمندی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا پھر شمع کی آواز کانوں میں آئی۔

”کیا ہو گیا ہے ماما آپ کو..... کام ہو جائیں گے اگر وہ یہ سب کام کرے گی تو اس کی بیوی خراب ہو جائے گی اور ابھی تو آپ نے اس سے سونے کے انڈے نکلوائے بھی نہیں۔“

”جانتی ہوں..... جانتی ہوں سب کچھ مگر اسے مہارانی بنا کر بھی نہیں بٹھا سکتی۔ چھوٹے دماغ کی لڑکی ہے۔ کہیں ان نازخروں سے سر پر ہی نہ چڑھ جائے۔ ذرا اسے اپنی اوقات یاد رہے گی۔ اس لیے کہہ سن رہی ہوں۔“ زبین بازوؤں کے حلقے میں خود کو سمیٹ کر بیٹھی رہی۔

”جاؤ..... جا کر اٹھاؤ اسے اور کچھ نہیں کر سکتی وہ تو میرے کمرے کی ہی صفائی کر دے۔ میرے کپڑوں پہ استری تو کر سکتی ہے وہ یا اس سے بھی اس کے ہاتھ پاؤں خراب ہو جائیں گے۔“

”میں نے تو جو کچھ بتایا ہے آپ کے فائدے کے لیے بتایا ہے۔ آگے آپ کی مرضی.....!“ شمع کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ زبین کو آتا دیکھ کر رک گئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں سوچ رہیں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ارشاد بیگم کے قریب آگئی اور کہنے لگی۔

”میں نے آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔“ ارشاد بیگم تو ارشاد بیگم شمع بھی چونک گئی۔

”کیا پوچھنا تھا.....؟“

”میں رات کو دادی کے کمرے میں گئی تھی۔ ان کا سب سامان تو ایسے ہی رکھا تھا لیکن صندوق میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کیا آپ نے وہ سامان نکالا تھا۔“

”کون سا سامان تھا اس میں...؟“ ارشاد بیگم جان کر انجان بنیں۔

”میری ماں کا زیور اور گھر کی رجسٹریاں۔“

”بڑا ہوگا وہیں یہ مجھے کیا پتا.....؟“ ارشاد بیگم نے انجان بننے کی خاص ایکٹنگ کی تو زبین کہنے لگی۔

”وہ اتنی معمولی چیزیں تو نہیں تھیں جو صندوق سے نکل کر ادھر ادھر ہو جائیں۔ سونا اور رجسٹریاں تھیں اور آپ

UrduPhoto.com

ہیں۔ اس کا مطلب ہے ان کی نیت صحیح نہیں ہے۔ میں کس طرح... لوں گی ان سے سب کچھ۔“ وہ سوچوں میں الجھ رہی تھی کہ ڈرائنگ روم سے آوازیں آنے لگیں۔ پھر شمع آئی اور اس نے بتایا کہ امران اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو ارشاد بیگم، بیگم اور لیس اور کامران سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ زمین کو دیکھ کر اس قدر انجان بن کر بولیں کہ زمین ہی کیا شمع بھی حیران رہ گئی۔

”اٹھ گئیں تم زیب..... میں نے تو تمہیں اس لیے نہیں جگایا تھا کہ آٹھ دس دن میں گھر کا آرام نصیب ہوا ہے۔ گھر سے باہر ایسی چھین کی نیند کہاں آتی ہے۔ آؤ..... ادھر آ کر بیٹھو۔ یہ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں۔“

”آپ کو ایک سر پرانز دینے آیا تھا۔“ کامران نے ایک میگزین میز پر کھول کر پھیلایا۔ جس میں اسی ایڈ کی تصاویر تھیں جو وہ شوٹ کر آئی تھی۔

”گھر سے باہر نکل کر دیکھنا۔ سائن بورڈ پہ جگہ جگہ زیب نظر آئے گی۔ نیکسٹ ویک یہ اشتہار ٹی وی پر آرہا ہے۔ اس کے علاوہ جو سر پرانز ہے وہ یہ کہ ایک موبائل کمپنی کی طرف سے زبردست پیش کش کی ہے۔ صرف اس اشتہار کو دیکھ کر بہت سے لوگ تڑپ اٹھے ہیں۔ اگلے کام کے لیے اپنے ذہن کو تیار رکھنا۔“ اس سے قبل کہ زمین کچھ بولتی..... ارشاد بیگم فوراً بولیں۔

”ہاں، کیوں نہیں..... کام اچھا ہوگا تو زیب کیوں نہیں کرے گی۔ کیوں زیب.....؟“ زمین چپ رہی۔

”اچھا تمہارے لیے فرح کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی اب کام کرنا ہو تو لاہور آنا۔ کسی تاریخی مقام پہ یونیک سائٹ کریں گے اور اس طرح تمہیں فرح کا ساتھ بھی مل جائے گا۔“

”فرح کیسی ہیں.....؟“ زمین نے پہلی بار مسکرا کر فرح کے متعلق پوچھا تھا۔

”بالکل فرسٹ کلاس..... تمہاری بہت تعریفیں کر رہی تھی، کہہ رہی تھی یہ لڑکی بہت آگے جائے گی اور ایک دن آئے گا وہ اسے اپنے مارننگ پروگرام میں بطور مہمان بلائے گی۔“ بات کرتے کرتے کامران ماں سے مخاطب ہو گیا تھا۔ پھر ہنس کر کہنے لگا۔

”نے انہیں دیکھا بھی تھا۔“

”کب دیکھا تھا میں نے؟“

”جب میرا نکاح نامہ دیکھا تھا۔“ ارشاد بیگم گنگ رہ گئیں۔ اب انکار کرنے کا جواز ہی نہیں تھا۔ ثبوت تو پکڑا گیا تھا۔

ارشاد بیگم کو اقرار کرنا پڑا۔

”ہاں..... تو پھر تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی اس سب سامان کی۔ اتنی قیمتی چیزیں یونہی تو نہیں پھینکی جاتیں۔ سنبھال کر رکھ لی تھیں میں نے۔“

”وہ سب چیزیں آپ مجھے دے دیں۔ میں خود سنبھال کر رکھ لوں گی۔“

”اے ہے..... بڑی سیانی ہو گئی ہے۔ چارون باہر کیا رہ آئی خود کو بہت ہوشیار سمجھنے لگی ہے۔“ ارشاد بیگم کوچ مچ غصہ آ گیا۔

”وہ زیور میری ماں کا ہے اور دادی کا ہے۔ میں انہیں دیکھ کر.....“ زمین سے بات پوری نہ ہو سکی رو پڑی۔

”تو یاد منانا چاہتی ہو اپنی ماں کی اور دادی کی۔“

ارشاد بیگم نے طنز کیا پھر تنٹنا کر بولیں۔ ”سن کم عقل لڑکی وہ سب کچھ میں نے لا کر میں ڈلوادیا ہے۔ یہاں ایسا ماحول نہیں ہے کہ میں اتنا سونا لے کر بیٹھوں جی..... جب ضرورت ہوگی نکلوا لیں گے۔“ ارشاد بیگم سر سے بلا اتار رہی تھیں۔

”کس کو ضرورت ہوگی اس کی.....؟“ زمین نے حیرانی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

”میرے پاس ان فالتو باتوں کے لیے وقت نہیں ہے شمع اسے کہو میرا دماغ نہ کھائے۔“ ارشاد بیگم جان بوجھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ زمین حیرانی سے شمع کو دیکھنے لگی۔

”کیا کرو گی تم ان چیزوں کا۔ ماما ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ محفوظ رکھی ہیں جب دل کرے نکلوا لینا۔“ زمین چپ چاپ اندر کمرے میں آ گئی۔

”کیا مطلب ہے ارشاد بیگم کا ان باتوں سے۔ کہیں ایسا تو نہیں میری غیر موجودگی میں انہوں نے وہ سب کچھ بیچ ڈالا ہو اور گھر..... اس کی رجسٹریاں بھی رکھ لی

”میں نے فرح سے کہا یعنی ابھی چار پانچ سال مزید ناظرین کو پاگل بنانے کا پروگرام سے تمہارا۔“ بیگم اور لیس ہنس دیں۔

”ٹھیک ہے پھر کانٹریکٹ سائن کر لیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر کامران نے ایک سپر میز پر رکھا تو زمین بدستور بیٹھی رہی۔ ”پچھلے ایڈ کا چیک تو میں آنٹی کو دے چکا ہوں۔ تمہیں مل گیا ہو گا ناں زیب.....؟“ وہ پین نکال رہا تھا۔

”ہاں، ہاں۔ میں نے زیب کے اکاؤنٹ میں ہی ڈلوادیا تھا۔ ہماری بات ہی کہاں ہو سکی ہے ابھی۔“ ارشاد بیگم نے خود بخود بولنا شروع کر دیا تھا۔

”بیجیے سائن کر دیں۔“ کامران نے پین زمین کی طرف بڑھایا تو زمین نے صاف انکار کر دیا۔

”معذرت کے ساتھ میں یہ بات کہنا چاہتی ہوں کہ میں اب کبھی کوئی کام نہیں کروں گی۔“ یہ کہہ کر زمین وہاں رکی نہیں اندر کمرے میں چلی گئی۔ ارشاد بیگم کا رنگ اڑ گیا۔ کامران اور بیگم اور لیس نے بہر حال خاص نوٹس نہیں لیا۔

”ٹھیک ہے اگر موڈ نہیں تو جانے دیجیے۔ ہو سکتا ہے پھر کبھی موڈ بن جائے..... چلیں می۔“ کامران بہ عجلت کھڑا ہو گیا تو بیگم اور لیس بھی ساتھ ہی چل پڑیں۔ ان کے جانے کے بعد ارشاد بیگم تنہائی ہوئی زمین کے پاس آئیں اور گرج کر بولیں۔

”کیا سمجھنے لگی ہو تم خود کو.....“ ارشاد بیگم غصے سے پاگل ہو رہی تھیں۔ ”تمہاری جرات کیسے ہوئی میری بات تم نفی کرنے کی۔“

”میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی جس پہ میرا دل رضامند نہ ہو۔“ زمین کا اطمینان ہنوز تھا۔

”جب منہ کالا کیا تھا جب تیرا دل رضامند تھا۔“ ارشاد بیگم نے طعنہ نہیں گالی دی تھی۔ زمین کی سانس حلق میں ہی اٹک گئی۔

”پھر تو اس کا چرچا کرنے ٹی وی پہ جا رہی تھی۔ تب تیرا دل رضامند تھا۔“ زمین نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ کاش وہ اس کرب کو سن بھی نہ سکتی۔

”پھر دادی اسی صدمے میں چلی گئی تو تجھے لگایہ غلط

UrduPhoto.com

میں کچھ اور ہی چل رہا تھا اور ایسا کچھ جس پر نہ تو ارشاد بیگم کا غصہ اور جنون حاوی ہوا تھا اور نہ ہی شمع کی چکنی چوڑی پالیسی۔ اس کے اندر ایک لاوا پھٹ رہا تھا۔ ایسا لاوا جو گنوار زمین کو میسر بدلنے والا تھا۔

☆☆☆

”نی بلیسیے..... پتر کا علاج کروا۔ مجھے تو لگتا ہے اس پہ کوئی چڑیل وڑیل عاشق ہو گئی ہے یا پھر کسی بھوت پریت کا چکر ہے۔ باپ تو آسیہ کا بھی مرا ہے مگر مہینہ رو دھو کر معمول پر آگئی ہے جبکہ تیرا پتر روز بروز کمزور اور کملا ہو رہا ہے۔ چھ ماہ ہو گئے ہیں باپ کو مرے..... مگر یہ ایسے ہی بیٹھا رہتا ہے۔ میری بات کا برانہ منانا سارے پنڈ میں یہی چرچا ہو رہا ہے۔ بلیسیے کا پتر تو شوا ہو گیا ہے۔“ ہمسائی کی بات پر بلیقیس نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور خشک ہونٹوں سے کہنے لگی۔

”میں نے کیا برا منانا ہے بہن..... میں تو خود پریشان ہوں۔ جوان پتر ہے، دماغ کو صدمہ لگ گیا ہے اس کے بجائے اس کے کہ ماں بہن کو سنبھالتا بالکل ہی غافل ہو گیا ہے۔ سارے دن اس نیم کے نیچے بیٹھا رہتا ہے۔ نماز کی بھی پروا نہیں رہی اسے۔ زیادہ زور دیتی ہوں تو سارا سارا دن گھر سے نکلا رہتا ہے۔ نہ اسے بھوک لگتی ہے اور نہ ہی پیاس۔ نہ جانے میری ابھی کون سی آزمائش باقی ہے۔“ یہ کہہ کر بلیقیس رونے لگی تو ہمسائی نے تسلی دی۔ ”تو فکر نہ کر اگر تو کہے تو پیری والے بابا کو لے آتی ہوں یہاں۔ سارا معاملہ سیدھا کر دے گا۔ پروہ پیسے بہت لیتا ہے۔“ ہمسائی نے آخری بات جتانے والے انداز میں کہی تو بلیقیس سانس بھر کر کہنے لگی۔

”میرے پاس تو کھانے کو نہیں تو پیروں، فقیروں کو کیا دوں گی۔“ ہمسائی اٹھ کر چلی گئی۔ بلیقیس پھر سے بیٹے کے پاس آگئی۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے علی زمان پتر! باپ کے غم کو تو نے سینے میں رکھ لیا ہے۔ سبھی نے جانا ہے اس دنیا سے۔ یوں جانے والوں کے ساتھ جایا نہیں جاتا تو خود کو سنبھال۔ کالج بھی جانا چھوڑ دیا ہے تو نے۔ آخر تو کرے گا کیا.....؟“ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلیقیس اسے چمکانے لگی

ہوا۔ اب تو مجھے سبق پڑھا رہی ہے گندی ماں کی گندی بیٹی۔“ زمین کے سر پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ ”بس کریں آپ بس کریں۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلائی تو ارشاد بیگم اس کے نزدیک آ گئیں۔

”زبان کھینچ لوں گی گدی سے اگر زبان لڑائی تو۔“ یہ کہہ کر ارشاد بیگم نے اس کی چٹیا اپنی منٹھی میں جکڑ لی۔ شمع بیچ میں نہ آئی تو ارشاد بیگم غصے سے اس قدر پاگل ہو رہی تھیں کہ زمین کا سردیوار میں دے مارتیں۔

”کیا کر رہی ہیں ماما آپ.....؟“

”جان سے مار دوں گی میں اسے۔ کیا سمجھا ہے اس نے خود کو..... نہیں کرتی تو نہ کرے۔ نکلے اس گھر سے..... نہیں رکھوں گی میں اسے یہاں۔ دیکھتی ہوں کہاں جائے گی۔ یہ صلہ دیا ہے اس نے میرے احسانوں کا۔“

”آپ پلیز دوسرے کمرے میں چلیں پلیز ماما.....!“ شمع زبردستی نکال کر باہر لے گئی۔ ارشاد بیگم کے بولنے کی آوازیں پھر بھی آرہی تھیں۔

”کام کرتی تو اپنا کیرئیر بنالیتی۔ ہمارا کیا تھا..... مگر سمجھ رہی ہے ہمیں کما کر دے رہی ہے۔ ابھی تو کچھ آیا بھی نہیں اور ابھی سے یہ نخرے ہیں۔ مجھ سے زیور اور گھر کی رجسٹریاں مانگنے آئی تھی۔ کچھ بھی نہیں دوں گی اسے کچھ بھی۔ کان کھول کر سن لے یہ..... اور اس گھر سے بھی نکالوں گی اسے۔ دیکھتی ہوں کیا کر لے گی یہ میرا۔“ ارشاد بیگم کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ زمین کے ارد گرد سناٹا چھاتا جا رہا تھا۔ وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔

بالآخر شمع، ارشاد بیگم کو کمرے سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”کیا ضرورت ہے تمہیں ماما سے اتنی بحث کرنے کی۔ ہمارے علاوہ اب ہے کون تمہارا۔ کہاں جاؤ گی..... سب کچھ تمہیں پتا ہے۔ دنیا بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے۔“ شمع اسے دلا سہ دے رہی تھی یا ڈرا رہی تھی۔ زمین سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے بازوؤں کے حلقے میں خود کو لپیٹ رکھا تھا۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے شمع اسے خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے جبکہ زمین کے دل و دماغ

لگا۔ نوچتے نوچتے یہاں تک کہ وہ رونے چلانے لگا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر گھر سے نکل گیا اور ساری رات گھر نہ آیا۔ آئیہ اور بلیس ساری رات اس کی زندگی اور خیریت کی دعائیں مانگتی رہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکا اسے ڈھونڈا مگر وہ نہ ملا۔

صبح وہ خود ہی گھر آ گیا۔ بلیس کو جہاں ڈھارس ہوئی۔ وہاں اس بات کا پکا یقین ہو گیا کہ علی زمان یہ واقعی کچھ اثر ہو گیا ہے۔ وہ پیری والے بابا کو گھر پر بلانے کے لیے ہمسائی کے پاس چلی گئی اور روتے ہوئے بولی۔

”سیکنہ! میرے پاس تو صرف یہ ناک کا لونگ ہی بچا ہے۔ میں اسے بیچ کر تجھے پیسے دیتی ہوں تو کسی طرح سے بھی پیری والے بابا کو گھر لے آ..... نہیں تو میرا جوان پتر جیتے جی خود بھی مرجائے گا اور مجھے بھی مار دے گا۔“

سیکنہ اسے تسلی دیتے ہوئے پیری والے بابا کے پاس لے گئی۔

☆☆☆

بلیس اور سیکنہ گھر میں داخل ہوئیں تو علی زمان ہنوز نیم کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے پیری والا بابا بھی اندر آ گیا تھا۔

”ویسے تو بابا کہیں نہیں جاتے لیکن تیری مجبوری کی وجہ سے یہاں آئے ہیں۔“ سیکنہ نے احسان جتایا تو بلیس مشکور ہو گئی۔

”بابا! آپ یہاں بیٹھ جائیں۔“ سیکنہ نے بابا کو پلنگ پر بٹھا دیا۔

”پتر کہاں ہے تیرا.....؟“ بابا نے دائیں بائیں دیکھا اور گرج دار آواز میں پوچھا۔ علی زمان قریب ہی درخت کے پیچھے بیٹھا تھا۔

”میں لے کر آتی ہوں۔“ بلیس بیٹے کو لینے کے لیے آگے بڑھی تو علی زمان خود ہی پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

”تو یہ پتر ہے تیرا.....!“ بابا نے علی زمان کی طرف دیکھا۔ علی زمان نے بابا کی طرف اور ماں سے پوچھنے لگا۔

”کون ہے یہ؟“

”بیٹا اپنی تعلیم شروع کر دے۔ تو پڑھ لکھ جائے گا تو ہمارا بھی بیڑا پار ہو جائے گا۔“

بے بے کیا باتیں کر رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے اندر تو الاؤ دہک رہا تھا۔ صوفی درویش بابا نے اسے کتنا بڑا دھوکا دیا تھا۔ کالج سے نکلنے کے بعد جب وہ درویش بابا کے ٹھکانے پر گیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ڈھونگی وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ سارے شہر میں ڈھونڈا مارتا تھا اس نے مگر اس کا کوئی اتا پتہ نہ ملا۔ جس نے یہ یقین دلویا تھا کہ اب اس کی زندگی میں کوئی ناکامی، مایوسی نہیں آئے گی۔ مایوسیوں اور ناکامیوں کا ڈھیر لگا گیا تھا۔ پے در پے حادثات..... اس کا ذمے دار کون تھا۔ وہ درویش بابا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اللہ سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اب تک تو اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کتنی نمازیں قضا کر چکا ہے۔

”اٹھ پتر چل..... میں تجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی۔“ اس نے بے بے کی طرف دیکھا۔ بے بے کو کس منہ سے بتائے کہ وہ کالج سے دھکے مار کر نکال دیا گیا ہے چوری کے الزام پر۔ وہ بے بے کا مجرم تھا۔ ان سب حالات کا ذمے دار وہ تھا۔ اس کے باوجود بے بے اس کے تازخروے اٹھا رہی تھی۔ بے بے کو چاہیے کہ اسے مارے۔ وہ بے بے کو دیکھتا رہا۔ بے بے نے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور روتے ہوئے بولی۔

”کیا ہو گیا ہے..... کیا ہو گیا ہے علی زمان پتر تجھے.....؟“ وہ بے بے کے آنسو پہ تڑپ اٹھا اور یکدم جھلا کر بولا۔

”تو مجھے پیار کیوں کرتی ہے..... میں پیار کے لائق نہیں ہوں۔“

”جو کچھ ہوا اس میں تیرا کیا قصور ہے پتر.....؟“ گویا وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

”میرا ہی تو قصور ہے۔“ وہ چلانے لگا۔ ”مجھے مار..... مارتی کیوں نہیں تو مجھے.....؟“ یہ کہتے ہوئے علی زمان نے ماں کے ہاتھ پکڑے اور اپنے گالوں پہ مارنے لگا۔ بلیس حیران تھی۔ علی زمان نے تھک کر ماں کے منڈھال ہاتھ چھوڑ دیے اور اپنے بال بے بسی سے نوچنے

زمان بے ہوش ہو گیا۔ وہ ہرے رنگ کی چادر تھی۔ اس پہ کچھ لکھا ہوا تھا۔ سیکنہ اور بلقیس کی رکی ہوئی سانس خارج ہوئی۔ بابا اپنی کامیابی پہ خوش تھا۔

”بڑے کرامات کی چادر ہے یہ.....!“ سیکنہ نے خوش ہو کر بلقیس کو بتایا۔

”بہت بڑا آسیب ہے۔ تیرے بیٹے پر بہت محنت کرنا پڑے گی۔ جو نذرانہ تو نے دیا ہے بہت تھوڑا ہے۔“

”بے فکر رہیں بابا جی۔ میں اور بھی جتنا کہیں گے دے دوں گی..... مگر میرے بیٹے کو ٹھیک کر دیں۔“ علی زمان بے ہوش پڑا تھا۔

”دو گھنٹے تک اسے کچھ نہیں کرنا۔ اس کے بعد اسے پانی پلا دینا اور یہ تعویذ۔ یہ پلانے کا۔ یہ جلانے کا۔ یہ دھونی دینے کا۔ خیال رکھنا یہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ ہو سکے تو اس کے پیروں میں زنجیر باندھ دینا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ گھر سے بھاگ جائے۔ اب میں چلتا ہوں کل مجھے بتانا کیسی حالت رہی اس کی۔“ بابا چلا گیا بلقیس بیٹے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

”فکر نہ کر بلقیس تیرا پتر ٹھیک ہو جائے گا۔“ سیکنہ دلا سے دینے لگی..... ادھر آسہ رورہی تھی۔ ادھر بلقیس کا رورو کر برا حال تھا۔



رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب بے بے اور آسو کی آوازوں پہ اس کی آنکھ کھلی۔

”ایک ہی قیمتی چیز تھی۔ ناک کا لونگ وہ تو دے آئی ہوں۔ اب کیا بیچ کر بیٹے کا علاج کراؤں گی۔“ علی زمان کے دماغ پہ بھاری پتھر پڑا۔ آسہ، ماں کو دلا سہ دے رہی تھی۔

”بھائی ٹھیک ہو جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ماسی سیکنہ کہہ رہی تھی۔ ابا کی قبر پہ ساری رات بیٹھا رہتا تھا بھائی۔ وہیں سے کچھ لگا ہے اسے۔“ علی زمان نے سر تھام لیا۔

”نہ جانے وہ ڈھونگی بے بے سے کیا لے گیا ہے۔“ وہ غصہ میں اٹھنے لگا تو منہ کے بل جا گرا۔

”یہ کیا.....؟“ اس کے پیروں میں زنجیر

”ماں سے کیا پوچھتا ہے مجھ سے پوچھ۔“ بیری والے بابا نے اپنے تھیلے میں سے بیری کی لکڑی نکالی اور علی زمان کے قریب آ گیا۔

”کیوں آئے ہو تم یہاں.....“ علی زمان کی تیوریاں بگڑ گئیں۔ بابا نے قہقہہ لگایا۔

”یہی بات تو میں تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ منٹ کے ہزارویں سیکنڈ میں علی زمان کے دماغ نے الارم بجایا۔ اسے لگا جیسے اس کے سامنے صوفی درویش بابا کھڑا ہے۔

”ڈھونگی، دغا باز، چھوٹا، فریبی۔“ علی زمان کی کھوپڑی گھوم گئی۔ اس سے قبل بیری والا بابا اس کے ارد گرد کسی نادیدہ چیز کا حصار کھینچتا۔ علی زمان نے آؤ دیکھانہ تاؤ اور زوردار طمانچہ بابا کے دے مارا۔ سیکنہ چلا کر بولی۔

”یہ کیا کیا تو نے؟“ بلقیس کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ آسہ علیحدہ کھڑی پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں۔ ابھی ساری ضد اور ہٹ دھرمی نکال دیتا ہوں۔“ بابا نے آگے بڑھ کر علی زمان کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ بالوں کا پکڑنا تھا کہ علی زمان کے اندر الاؤ سا پھٹ پڑا۔ وہ لاوا جو وہ درویش بابا کے لیے بیٹھا تھا۔ وہ لاوا سارا نکل کر سامنے آ گیا۔ جواباً حملہ کر کے علی زمان نے بابا کا گریبان پکڑ لیا اور اس زور سے دھکا دیا کہ بابا گرا تو نہیں البتہ بل ضرور گیا۔

”مجھ سے ہیکڑیاں کرتا ہے۔“ بابا نے علی زمان کو لاٹھی سے پیٹنا شروع کر دیا۔ دو مین لاٹھیوں کے بعد علی زمان، بابا سے وہ لاٹھی لینے میں کامیاب ہو گیا اور الٹا بابا کو پیٹ ڈالا۔ مگر بابا ہار ماننے والا نہیں تھا۔ صحت میں علی زمان سے دگنا تھا اور ایسی بازی گری سے خوب واقف بھی۔ اپنا دفاع کرتے ہوئے بابا نے ایک چادر نکالی۔ وہ علی زمان پہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس چادر میں ایسی خوشبو لگی تھی کہ بندہ بے ہوش ہو جاتا تھا..... لیکن علی زمان نے اس کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ بہت دیر تک یہ تماشا ہوتا رہا۔ بالآخر بابا نے چادر علی زمان پہ پھیلا دی اور ایک سیکنڈ میں ہی علی

جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ روحا کے دل میں شک آ گیا تو نہ ادھر کے رہو گے نہ ادھر کے۔“ فرزان سوچنے پہ مجبور ہو گیا۔ پھر فون اٹینڈ کیا تو روحا نے سب سے پہلے یہی پوچھا۔

”کہاں ہو تم؟“

”دوست کے ہاں.....“

”شام تک جلدی آ جانا۔“

”کیوں..... خیریت.....!“

”ڈیڈی نے تم سے بات کرنی ہے۔“

”کون سی بات؟“

”وہ تو جب تم آ منے سامنے بیٹھو گے تمہیں پتا چل جائے گا۔“ روحا کی آواز بے حد فریش تھی۔ فرزان کے دل میں گھٹیاں بجنے لگیں۔

”اچھا ٹھیک ہے..... میں آ جاؤں گا۔“ فون بند ہو گیا۔ مارے خوشی کے وہ ثنا سے لیٹ گیا۔

”بس اب ہم منزل پہ پہنچ گئے ہیں ثنا۔ دیکھنا اب میں تمہیں کتنے عیش کراؤں گا۔ سب سے پہلے ہم شادی کریں گے اور پھر.....“ ثنا نے البتہ خود کو کنٹرول میں رکھا۔

”کیا بات ہے تمہیں خوشی نہیں ہو رہی۔“ فرزان پریشان ہوا۔

”اصل میں ابھی یہ پتا نہیں ہے کہ وہ تم سے کیا بات کریں گے۔ فی الحال خود کو سنبھال کر رکھو اور زیادہ اتاؤ لا ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ روحا کا باپ تم سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے۔“ فرزان چپ سا ہو گیا۔

لیکن ثنا کا یہ اندازہ فی الحال غلط ثابت ہو گیا اور روحا کے نام کی فیکٹری انہوں نے مکمل طور پر فرزان کے حوالے کر دی۔ فرزان کے لیے یہ کامیابی بہت بڑی تھی جبکہ ثنا اس چھوٹی کامیابی پہ مسکرائی بھی نہیں تھی۔ اس کی تو ساری توجہ پورے کاروبار پر تھی۔

☆☆☆

”اگر میں اس کے ساتھ سخت رویہ نہ کرتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔“ زمین کو گئے ہوئے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ ارشاد بیگم اپنی کوشش پہ مطمئن تھیں۔

تھی۔ ”جانور کی زنجیر میرے پاؤں میں۔“ وہ سمجھ گیا کہ بے بے کو وہ ضرور پاگل بنا گیا ہے۔ علی زمان سخت اشتعال میں آ گیا۔ اتنا غصہ تھا اس کے اندر کہ اگر کھلا ہوتا تو جا کر بابا کو قتل کر دیتا۔ وہ بری طرح چیخنے دھاڑنے لگا۔ آسیہ... سرسیمہ ہو کر ماں سے چمٹ گئی۔

”بھائی کو کھول دے بے بے..... نہیں تو یہ مر جائے گا۔“ ساری رات اس کا جنون اور وحشت دیکھ کر آسیہ ہی کیا بلیقیں بھی ہر اسان ہو گئی تھی۔ نہ جانے وہ صحیح بھی کر رہی تھی یا نہیں۔ بلیقیں کے دل میں بار بار واہے آرہے تھے۔ ماں کا دل ہی تو تھا..... پھر تو نہیں۔ بلیقیں نے علی زمان کو کھول دیا۔

علی زمان نے دیکھا۔ ماں کی ناک میں جو لونگ تھا وہ اب نہیں ہے۔

وہ سخت اشتعال اور جنون میں گھر سے نکلا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے چھری ضرور اٹھائی تھی۔ اس وقت اس کے اندر اتنا جنون اور دہشت تھی کہ دنیا کے سارے ڈھونگی دعا بازوں کو جان سے مار دیتا لیکن سب کو نہیں۔ اس نے بیری والے بابا کو جان سے مار دیا تھا۔

☆☆☆

ثنا اپنے پلان کے کامیاب ہونے پہ بہت خوش تھی۔ اسے امید تھی سر اور داماد میں مفاہمت ہونے کے بعد سارا کاروبار فرزان نے ہی سنبھالنا ہے۔ فرزان اسے بھرپور وقت دے رہا تھا۔ فی الحال وہ علیحدہ پارٹمنٹ میں رہ رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ فرزان کو گانڈ کر رہی تھی۔

”بعض اوقات زندگی کو بالکل مختلف طریقے سے جینا پڑتا ہے..... اگر ہم اپنی پالیسیوں میں چینج نہ لائیں تو ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔“ ثنا نے ادا سے کہا تو فرزان گھائل ہو گیا۔

”جناب ہم تو آپ کے مرید ہو گئے ہیں۔“

”نوازش، نوازش۔“ وہ اترائی۔ اتنے میں فرزان کا فون بج اٹھا۔

”روحا کا فون ہے۔“ وہ کچھ جھنجھلایا۔ اس مداخلت بے جا پر وہ فون کاٹ دینا چاہتا تھا لیکن ثنا نے منع کر دیا۔

”ایسی حرکت مت کرنا۔ ابھی اعتماد قائم ہوئے جمعہ

صاحب! چیک آپ مجھے دیں گے میری ماں کو نہیں۔“
فرح اور کامران چپ ہو گئے۔ صاف سمجھ میں آرہا تھا کہ
ماں بیٹی کا کلیش ہوا ہے اور ایسا آئے دن سننے کو ملتا رہتا
تھا۔ یہ فیلڈ ہی ایسی تھی۔

”مگر آپ اکیلے کیسے رہیں گی... جبکہ آپ کی
آمدنی.....“

اس کی فکر چھوڑیں..... میں نے وہاں نہ جانے کا
فیصلہ کر لیا ہے۔ اب چاہے میں کسی طرح سے بھی رہوں
یہ میرا اپنا انتخاب ہے۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر سنبھل سنبھل کر بول
رہی تھی۔ وہ دونوں ہی چپ ہو گئے۔

”آپ لوگ فکر نہ کریں میں آپ کے یہاں نہیں
ٹھہروں گی۔“ زمین نے ان کے خدشات دور کرے تو
فرح ہنس دی۔

”آپ جب تک چاہیں رہ سکتی ہیں۔ آفٹر آل آپ
ہماری مہمان ہیں۔“

”مہمان اگر بلائے جان بن جائیں تو اچھا نہیں
لگتا۔“ زمین آہستہ سے مسکرائی پھر جلدی سے بولی۔

”صبح جو خاتون آپ سے ملنے کے لیے آئی تھیں،
وہ غالباً بی وی ڈرامے بناتی ہیں۔“

”ہاں.....!“ فرح نے اچھنبے سے دیکھا۔ ”مگر تم
کیوں پوچھ رہی ہو.....؟“

”انہوں نے مجھ سے میرا فون نمبر لیا تھا۔ کہہ رہی
تھیں وہ اپنا ڈراما سیریل بنا رہی ہیں۔ مجھے ڈرامے میں
کاسٹ کرنا چاہتی ہیں۔“

”اوہ.....!“ کامران کو خاصی جیلیسی فیل ہوئی۔ ”تو
گویا یہ بات ہے۔ ہماری بی بی کو میاؤں۔“ وہ گلا کھنکھار
کر بولا۔

”بات یہ ہے مس زیب۔ ویسے تو آپ کی مرضی
ہے کہ آپ چاہیں جس کے ساتھ کام کریں مگر میں ایک
بات بتا دوں۔ ماڈلنگ اور اداکاری میں بہت فرق ہے۔

ایک اچھی اداکارہ ماڈل تو بن سکتی ہے مگر ماڈل اور وہ بھی
آپ جیسی جہاں تعلیم اور لب و لہجہ کا سرے ہی سے نام و
نشان نہ ہو۔“

”میں اس بات کو بہت اچھی طرح جانتی

”اس بار زیادہ فون کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے
اسے۔“ ارشاد بیگم نے شمع کو سمجھایا۔ ”کیونکہ میرا پروگرام
گاؤں جانے کا ہے۔ میں چاہتی ہوں ایک دو چکر لگا کر
اس گھر کو بیچنے کی بات کروں اور اس کی غیر موجودگی میں یہ
کام ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“

”مگر آپ گھر کیسے بچ سکتی ہیں؟ گھر تو.....“
”بے فکر رہو۔ گھر تمہارے باپ کے نام ہی ہے۔

میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اس لیے آسانی سے میں
فروخت کر سکتی ہوں۔“

”اور کسی نے زمین کے بارے میں آپ سے پوچھا
تو.....؟“

”تو میں کہہ دوں گی وہ تو فلموں میں کام کر رہی ہے
اور اسی کی رضامندی سے میں یہ سب کر رہی ہوں۔ اس
طرح گاؤں والوں کو مجھ پر شک بھی نہیں ہوگا۔ میرا کام

آسانی سے ہو جائے گا ہم صبح ہی گاؤں جائیں گے۔“
ارشاد بیگم نے شمع کو مکمل تیاری کرنے کا کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے امید نہیں تھی کہ آپ کام پہ آمادہ ہو جائیں
گی۔ مجھے لگتا ہے آپ سے زیادہ آپ کی مدر کو شوق ہے کہ

آپ بی وی پہ کام کریں۔“ زمین نے جواب نہیں دیا تو
کامران نے ماسنڈ بھی نہیں کیا۔

”خیر..... بہر حال آپ کے ٹکٹ میں نے
منگوادیے ہیں۔ آپ کل تک خیریت سے پہنچ جائیں گی۔

نیکسٹ کوئی کام ہوا تو ضرور آپ کو زحمت دیں گے۔
اوکے، اب میں چلتا ہوں آپ اپنی تیاری کر لیجیے۔ ویسے

اس دفعہ آپ نے کام بہت اچھا کیا ہے۔ خاصا اعتماد آ گیا
ہے آپ میں۔“

”کامران صاحب میں گھر نہیں جانا چاہتی۔“
کامران ہی کیا فرح بھی دنگ رہ گئی۔

”آپ کو تھوڑی زحمت تو ہوگی مگر میرے لیے
فی الحال کرایے کی رہائش کا بندوبست کر دیجیے۔ اب میں کبھی
بھی گھر نہیں جاؤں گی۔“

”مگر کیوں.....؟“ سوال فرح نے کیا۔
”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے فرح جی! اور ہاں کامران

ہوں۔“ زمین نے بات کاٹ دی.....” میں نے ان محترمہ کو یہ بات بتادی تھی اس کے باوجود وہ یقین ہی نہ کر پائیں۔ کہنے لگیں آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔“

”تو کیا ضرورت تھی اتنا سب کچھ بتا دینے کی۔“ کامران کو سخت جھنجلاہٹ ہوئی۔ کیا امیج رہ گیا تھا اس کا یعنی وہ گنواروں کو صرف بیوٹی کی وجہ سے چانس دے رہا تھا۔ اچھی خاصی جگ ہنسائی والی بات تھی۔

”آپ کو اپنے امیج کا نہیں کم از کم ہمارے امیج کا تو خیال رکھنا چاہیے۔ کیا سوچیں گے لوگ ہمارے بارے میں۔“ آخر فرح کو بھی بولنا پڑا۔

”آپ کیوں شرمندگی محسوس کر رہی ہیں۔ جب مجھے شرمندگی نہیں ہے۔“

”مائی گاڈ..... اس فیلڈ میں اتنی سادگی نہیں چلتی۔ اس طرح تو تم بالکل بھی نہیں چل پاؤ گی۔ لوگ ذرا سی بات کو اتنا بڑھا کر بتاتے ہیں اور تم ہو کہہ سچائی یہ.....“

”فضول اپنا وقت ضائع کر رہی ہو تم۔“ کامران نے فرح کو ٹوکا۔ وہ در پردہ زمین سے خائف نظر آ رہا تھا۔ اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگا۔ جاتے جاتے رکا۔ ”آپ ایک سال تک کسی بھی پراجیکٹ پر کام نہیں کر سکتیں۔ آپ نے میرے ساتھ معاہدہ کیا ہوا ہے۔ آپ ایک سال تک کسی طرح بھی میڈیا میں نہیں آئیں گی۔ بصورت دیگر آپ یہ قانونی کارروائی ہوگی۔“ کامران باہر چلا گیا۔ پھر فرح بھی کمرے سے نکل گئی۔

”تو یہ بات کبھی۔ جو کامران صاحب کے تیور چڑھ گئے تھے۔ کوئی بات نہیں میں اس چیز کا مشورہ دوسرے لوگوں سے کر سکتی ہوں۔ جب میں لوگوں سے ملوں گی تو ہزاروں راستے نکل آئیں گے اور ہاں وہ ٹی وی ڈائریکٹر شاید اسی لیے پوچھ رہی تھیں مجھ سے کہ تم نے کوئی معاہدہ تو نہیں کیا ہوا۔“

”معاہدہ تو کیا ہے۔“ وہ اپنا جواب زیر لب دہرانے لگی۔ تب انہوں نے کیا کہا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ چھ ماہ یا تین ماہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آن ائر آنے تک معاہدے پورے ہو جاتے ہیں۔“

کیا۔

”محترمہ! ہم تفتیش کے لیے آئے ہیں۔“
”کیسی تفتیش.....!“ ارشاد بیگم چونک گئیں۔

☆☆☆

ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کی صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لیے پولیس کا محکمہ ہی نہیں فوج بھی الرٹ ہو چکی تھی۔ معمولی معمولی واقعات کو بھی جانچ پڑتال اور تحقیقی اداروں کے سپرد کیا جا چکا تھا۔ ذرائع ابلاغ کا پل پل کی خبریں عوام کو نشر کرنا معمول بن گیا تھا۔ تمام حکومتی ادارے ہائی الرٹ تھے۔ اس کے باوجود خود کش دھماکے کنٹرول نہیں ہو پارہے تھے۔ انسپکٹر رشید نے فیکے کے بتائے ہوئے مفروضوں پر اس جگہ کا اتنا پتا نکال لیا تھا۔ جہاں وہ چھ ماہ تک قید میں رہا تھا۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ قید میں تھے۔ وہ لوگ کون تھے، کہاں سے آئے تھے۔ ان کے عزائم کیا تھے، وہاں جو اسلحہ چلتا تھا وہ کیوں چلتا تھا، کون سی مشینیں ہوتی تھیں، یہ سب سوال خاصے اہمیت کے حامل تھے۔ ایک طرح سے یہ ایک میجر آپریشن تھا جسے بڑے دھیان اور باقاعدہ تیاری سے کرنا تھا۔ انسپکٹر رشید اور اس کی ٹیم اس آپریشن کے لیے الرٹ تھی۔ ”ہم نے تمہیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔“

”کیا.....!“ ملکوا چھل کر کھڑا ہو گیا۔ ایک معمولی فیکے پر اتنی فوج اس کے اڈے کا گھیراؤ کر لے گی ملکوانے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا خیال تھا فیکے کا بھاگ کر واپس گاؤں چلا جائے گا۔ لیکن یہ کیا.....! فیکے پولیس میں چلا گیا تھا۔ ”صاحب! باہر تو بہت پولیس ہے۔“ اس کا ملازم دوڑتا ہوا آیا۔

”مگر کیوں.....؟“ ملکوا الجھ رہا تھا۔ یکدم اس کے کسی ساتھی نے گولی چلائی اور پولیس کی طرف سے فائر کھل گئے۔

”کس نے چلائی تھی یہ گولی..... آخر کس نے.....؟“ ملکوا پاگل ہونے کو تھا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

”انہوں نے فون نمبر بھی تو دیا تھا ناں مجھے۔“ زمین اپنے موبائل میں چیک کرنے لگی۔ اس طرح سے اسے کم از کم فون کی سمجھ آگئی تھی۔ ادھر کامران جل کڑھ رہا تھا۔ ”یہ لڑکی سمجھ رہی ہے کہ صرف خوبصورتی کی وجہ سے آسمان کو ہاتھ لگا لے گی۔ اور یہ صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ آئے دن تمہارے پاس کوئی نہ کوئی آتا رہتا ہے اور تم پر ایسی سی کا بالکل خیال نہیں کرتیں۔ گھر کے ماحول کو بھی تم نے مارننگ شو بنا رکھا ہے جو کچھ ہے لائیو جا رہا ہے۔“

”فارگا ڈسک۔ کامران کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ اگر وہ کچھ پائے گی تو اپنی خوبصورتی اور اپنے ٹیلنٹ سے..... اور ٹیلنٹ اس کے پاس بالکل بھی نہیں ہے۔ البتہ اگر اس کی قسمت نے ساتھ دیا تو وہ ضرور آسمان کو چھو سکتی ہے مگر اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے نقصان ہمارا۔ متعارف کرانے والا میں ہوں تو سب سے زیادہ فائدہ بھی مجھے ہونا چاہیے۔“ کامران بالکل کاروباری لہجے میں بات کر رہا تھا۔ زمین نے باآسانی یہ الفاظ سنے تھے۔ ”واقعی سچ کہتے ہیں، دنیا میں کوئی کسی کا نہیں رہا۔ صرف اور صرف پیسہ..... پیسہ ہی سب کچھ ہو گیا ہے۔“ زمین خود یہ ہنسی۔ ”میں اس پیسے کے لیے ہر دیوار پھلانگ لوں گی مگر کسی کی محتاج ہو کر نہیں رہوں گی۔“

☆☆☆

گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے لیکن ارشاد بیگم نے گاؤں کا رخ کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ یہ احساس ارشاد بیگم کو گاؤں پہنچ جانے کے بعد ہوا۔ جب لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ہر ایک کے منہ پہ یہی سوال تھا کہ وہ زمین کی کیا لگتی ہے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ شہر سے زمین کے رشتے دار آئے ہیں گھر دیکھ رہے ہیں۔ پیر علی اور افروز سرپٹ تھانے پہنچے اور پولیس کو اطلاع کی۔ ایس ایچ او اور انسپکٹر فوری طور پر زمین کے آبائی گھر پہنچ گئے۔ جہاں ارشاد بیگم گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انسپکٹر نے دروازے پہ ڈنڈا مارا اور ارشاد بیگم کو اپنی طرف متوجہ



UrduPhoto.com

ناولٹ

کچی گاگرٹوٹ گئی

میمونہ خورشید علی

قطعہ 7

طرف دیکھا تو دوسرے ساتھی نے کہا۔

”دیکھیں بی بی! ہم بہت دیر سے آپ کو سمجھا

کی کوشش کر رہے ہیں یہ معاملہ اتنا معمولی نہیں ہے جتنا

آپ سمجھ رہی ہیں آپ نے بتایا کہ آپ مفروز زین کی

”آخر تم لوگ ہمیں یہاں پولیس اسٹیشن کیوں

لے کر آئے ہو، کیا جرم کیا ہے ہم نے؟“ ارشاد بیگم غصے

سے پاگل ہو رہی تھیں۔

انسپکٹر نے ذومعنی انداز میں مسکرا کر اپنے ساتھی کی

”اب آپ فیصلہ کر لیں آپ نے اپنی بیٹی کو پیش کرنا ہے یا خود گرفتاری دینی ہے کیونکہ جب تک بندہ بازیاب نہیں ہو جاتا آپ اس کیس سے باہر نہیں نکل سکتیں کیونکہ یہ کیس بندہ بازیاب نہ ہونے کی صورت میں قتل کا کیس ہے۔“ انسپکٹر نے کہا تو ارشاد بیگم اور شمع دونوں کے ہی رنگ فق ہو گئے۔

”تم میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، اس ڈائن کو فون کیوں نہیں ملا تیں۔“

”بہت دیر سے کوشش کر رہی ہوں پتا نہیں فون بند کر رکھا ہے یا نمبر دیکھ کر جان بوجھ کر نہیں اٹھا رہی۔“

”تو تم کامران کی ماں کے پاس ملاؤ۔ میں اس سے خود بات کرتی ہوں۔“

”میرے پاس ان کا نمبر ہی کہاں ہے۔“ شمع نے ماں کی طرف دیکھا۔

”آپ لوگ ہمیں جانے دیں ہم گھر جائیں گے تو کچھ کر سکیں گے۔ میرا مطلب ہے، میں گھر جا کر اس سے پوچھوں تو کہ اس نے یہ راز ہم سے کیوں چھپا کر رکھا۔“ ارشاد بیگم نے انسپکٹر کے سامنے تجویز پیش کی تو انسپکٹر کہنے لگا۔

”آپ دونوں میں سے ایک جا سکتی ہیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ ہمارا بندہ آپ کے ساتھ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے ماما، میں یہیں رک جاتی ہوں آپ گھر جا کر زمین سے رابطہ کریں۔“

”مم..... مگر..... تم..... یہاں کیسے بالکل نہیں۔ میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتی اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے۔“

”تو آپ رک جائیں یہاں..... انہیں بھیج دیں۔ جیسے ہی ہمیں مطلوبہ خاتون مل جائیں گی ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔“

”کک..... کیا مطلب ہے آپ لوگوں کا..... جب تک زمین یہاں نہیں آئے گی آپ مجھے جانے نہیں دیں گے؟“

”خدا کا شکر ادا کریں بی بی کہ ہم نے آپ کے

والدہ ہیں اور زمین کے کہنے پر یہ مکان فروخت کرنے آئی ہیں، زمین کی دادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ مان لیا جائے کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے اور زمین آپ کے پاس ہے تو پھر بھی آپ اس مکان کو نہیں بیچ سکتیں۔ جب تک زمین خود تھانے میں پیش نہیں ہو جاتی یہ معاملہ اس طرح نہیں حل ہوگا۔“

”کیا مطلب..... تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“

”ہم نے یہ نہیں کہا بی بی کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں لیکن زمین کا یہاں آنا بہت ضروری ہے۔ آپ کو شاید پتا ہی نہیں کہ پولیس کتنے دن سے ان کی تلاش میں تھی اگر آپ نے ان لوگوں کے بارے میں صحیح صحیح نہ بتایا تو آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو تم لوگ۔ تمہیں پتا ہے میں کون ہوں؟“ ارشاد بیگم غصے سے لال بھبھوکا ہو رہی تھیں۔

”ہمیں یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ آپ کون ہیں اور آپ نے درپردہ اس مکان کو فروخت کرنے کی مہم کب سے چلا رکھی تھی۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ آپ یا تو زمین کو سامنے کر دیں ورنہ اپنی گرفتاری دیں کیونکہ اس گاؤں سے ایک نوجوان غائب ہو گیا ہے اور آپ کو یقیناً معلوم ہو گا وہ نوجوان آپ کی سوتیلی بیٹی زمین کا شوہر تھا۔“ انسپکٹر کے انکشاف پر ارشاد بیگم کے سر پر بم پھٹا تھا۔ شمع خود بوکھلا گئی تھی۔

”زمین کا شوہر..... ارشاد بیگم نے خشک حلق سے دہرایا۔

”ہاں زمین کا شوہر اور میرا چھوٹا بھائی فقیر علی جسے غائب ہوئے آٹھ ماہ ہو گئے ہیں..... زمین نکل گئی اسے یا آسمان..... کہا گیا۔“ پیر علی جذبات میں آکر رونے لگا تھا افروز اس کے پیچھے کھڑی تھی اور زمین کی نومولود ماں کو دیکھ کر افروز ہی کیا گاؤں کے باقی لوگ بھی حیران تھے کیونکہ ان میں سے کسی نے بھی آج تک زمین کے گھر شہر سے کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور یہی بات سب نے انسپکٹر کے پوچھنے پر بتائی تھی۔

”بی بی.....! رات یہیں گزارنے کا ارادہ ہے یا.....؟“

”اللہ نہ کرے کہ میں یہاں رات گزاروں۔“ ارشاد بیگم نے ہونق شکل سے انسپکٹر کی طرف دیکھا پھر بوکھلا کر بولیں۔ ”وہ تمہارا آدمی بھی تو گیا تھا نامیری بیٹی کے ساتھ.....؟“

”وہ تو کب کا آ گیا ہے جی، بندے نے وہاں رہ کر کیا کرنا تھا۔ مدعی تو وہاں تھا نہیں ایویں وقت برباد کرنے والی بات تھی البتہ مہرہ شہرہ دیکھ لیا ہے ہمارے بندے نے۔ کل صبح مزید نفری جائے گی وہاں اور مدعی کو ہر حال میں نکالے گی بصورت دیگر آپ کو ان کا صحیح صحیح پتا دینا ہوگا۔“

”میں ایک ہزار دفعہ تم لوگوں کو بتا چکی ہوں کہ بڑھیا مر گئی ہے اور اس کی پوتی دوسرے شہر میں دفنان ہوئی بیٹھی ہے، مجھے یہاں باندھ کر بٹھالینے سے مجرم نہیں مل جائیں گے۔“

”یہ پریشانی آپ کی نہیں ہے بیگم صاحبہ، یہ مسئلہ تو ہم نے خود ہی حل کرنا ہے۔ اب آپ کو صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ہمارے ایس پی صاحب صبح آئیں گے وہی فیصلہ کریں گے کہ آپ کا کیا کرنا ہے۔ اب آپ آرام کریں۔“

”کیا رات کو مجھے یہیں رکنا پڑے گا یہاں تھا بنے میں؟“ ارشاد بیگم کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں اور سانس حلق میں اٹک گئی۔

”ویسے بھی پولیس کو آپ پر شک ہے کہ مفرور خاتون میں سے جو ایک خاتون مری ہے اس کی موت میں کہیں نہ کہیں آپ کا ہاتھ ہے۔“

”میرا ہاتھ ہے.....؟“ ارشاد بیگم نے حیرانی سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

”اس بحث کو چھوڑیں بیگم صاحبہ پہلے اہل محلہ سے تصدیق ہوگی آیا واقعی وہاں کوئی فوتگی ہوئی تھی یا اس کے پیچھے بھی کوئی اور گیم ہے۔ اب آپ آرام کریں یہ سارا معاملہ صبح ہی ہوگا۔“ انسپکٹر چھوٹے سے کمرے سے باہر نکل گیا تو ارشاد بیگم حواس باختہ سی ہو کر اس کے پیچھے

خلاف ابھی تک پرچہ نہیں کاٹا، شرافت سے پیش آرہے ہیں۔ آٹھ مہینے سے یہ لوگ اپنے بھائی کو رو رہے ہیں۔ گاؤں میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بندہ یوں اچانک غائب ہو گیا ہو..... بہت سنگین اور پیچیدہ معاملہ ہے یہ اگر وہ دادی پوتی یہاں ہوتیں تو..... شاید قانون کچھ اور سوچتا لیکن اب صاف دکھائی دے رہا ہے کہ فقیر علی کے غائب ہونے یا کرانے میں انہی دادی پوتی کا ہاتھ ہے۔“

”مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ اسے غائب کرا کر کیا کریں گی جبکہ ان کا گھر اور جانور یونہی پڑے ہیں۔“ ارشاد بیگم زچ سی ہو گئی تھیں۔

”یہی تو بات ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ اچانک وہ لوگ کیوں یہاں سے بھاگیں..... جبکہ ابھی شادی کو چار دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ دادی ہی تو فیکے کو گھر داماد بنا رہی تھیں گھر میں بلا کر کیسے غائب کرایا اسے.....؟ زمین کا گھر بسا رہی تھیں تو یہاں سے بھاگی کیوں؟“ پیر علی جو تفتیش پر اثر اور ارشاد بیگم کا دماغ گھوم گیا انہوں نے چکراتے سر کے ساتھ اپنے بندہ حال وجود کو کرسی پر ڈال دیا۔

☆☆☆

کیسی مصیبت میں پھنس گئی تھیں وہ شام ہونے والی تھی اور شمع کا کچھ پتا نہیں تھا..... آخر کتنی دور تھا یہاں سے شہر کا فاصلہ صرف دو گھنٹے کا سفر جبکہ آٹھ گھنٹے ہونے کو آرہے تھے نہ شمع کا پتا تھا نہ ڈرائیور کا..... ارشاد بیگم فون کر کر کے تھک گئی تھیں کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا نہ جانے یہاں سے گنٹل نہیں ملتے تھے یا کوئی اور وجہ تھی۔ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے جسم بری طرح اکڑ گیا تھا۔ اوپر سے مکھیاں اور گندے برانڈ کی سگریٹ کا دھواں ارشاد بیگم کی طبیعت سخت ادب رہی تھی۔ بھوک نے علیحدہ پریشان کر رکھا تھا شمع کہہ کر گئی تھی کہ وہ کھانا بھی لے کر آئے گی لیکن نہ جانے وہ کہاں مر گئی تھی ارشاد بیگم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

شام گہری ہو رہی تھی یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا ارشاد بیگم کی آنتیں ہی کیا اعصاب نے بھی جواب دے دیا تھا۔

پیچھے آئیں۔

اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔
 ”یہاں کوئی فی میل پولیس نہیں ہے۔“ آفیسر
 کے چہرے پہ کچھ ناگواری سی پھیلی تھی۔ انسپکٹر نے نفی میں
 سر ہلادیا۔

”واٹ نان سینس!“ آفیسر کمرے سے باہر نکلا
 پیچھے پیچھے ظہور ارشاد بیگم کے ہمراہ نکلا تھا اتنے میں
 انسپکٹر اپنے ایس ایچ او کو فون ملا کر کارروائی سنانے لگا
 تھا۔

☆☆☆

”لاچ انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ آخر کیا کمی تھی
 ماما کے پاس جو دادی اور زمین کا مکان بیچنے چل پڑی
 تھیں اور مکان کیا یونہی بک جاتے ہیں۔ آخر ماما کو اتنا تو
 سوچنا ہی چاہیے تھا کہ زمین کی رضامندی اور گواہی کے
 بغیر ایسا ناممکن ہے پھر بھی ماما چل پڑیں۔ ماما کیا سوچ
 رہی تھیں کہ زمین کو پتا نہیں چلے گا اور وہ مزے سے پیسہ
 ہڑپ کر جائیں گی..... کریں اب ہرپ مکان تو کیا بکنا
 تھا قائل کا الزام سر پر آ گیا ہے۔ زمین تو جا کر چھپ کر بیٹھ
 گئی ہے۔ وہ لوگ تو ماما کو ہی پکڑیں گے ناں اور تو اور
 رہائش بھی دیکھ گئے ہیں۔ سارا اتنا پتا معلوم کر لیا ہے۔
 یہاں تک کہ ماما کے خلاف پرچہ بھی کٹ چکا ہے۔
 میں نے وکیل سے بات کی ہے اگر زمین عدالت میں
 پیش نہ ہوئی تو وہ لوگ ماما کو گرفتار کر لیں گے۔ زمین اور
 داوی نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کی سزا ماما بھگتنا پڑے گی۔
 سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہیں۔“ ظہور کی
 ایسی حالت تھی کہ مارے بے بسی کے اپنے سر کے بال
 نوچ رہا تھا۔

”تین دن سے ماما کو سخت بخار ہے اور بلڈ پریشر تو
 بالکل ہی نیچے نہیں آ رہا ہے..... سمجھ نہیں آتا کہ اب کیا
 ہوگا۔“

”وہی ہوگا جو ماما نے چاہا ہے۔ زمین کو تو آسمان
 پر بٹھا دیا اور پھانسی کا پھندا ہم سب کے گلے میں
 لٹکوا لیا..... ہاتھ میں دولت کی جگہ ذلت اور رسوائی
 آئی۔ لاچ انسان کو منہ کے بل گراتا ہے ماما کے ساتھ ہم
 سب کو بھی نہ جانے کتنی ذلت اٹھانا پڑے گی۔“

”کیا بکواس ہے یہ..... مجھے یہاں سے جانے دو“
 میرا زمین سے اور اس کی دادی سے کوئی تعلق نہیں ہے
 میں نہیں جانتی کسی کو، سنا تم نے تم مجھے یہاں نہیں رکھ
 سکتے۔ میں تمہارے خلاف کورٹ تک جاسکتی ہوں بنا
 ثبوت کے تم مجھے یہاں کیسے رکھ سکتے ہو۔“ ارشاد بیگم
 ہڈیانی انداز میں چلاتے چلاتے یکدم ساکت ہو گئیں۔
 ظہور کی غیر متوقع آمد ارشاد بیگم کے لیے تقویت کا باعث
 بنی تھی۔

”دیکھا.....! میں نے کہا تھا ناں کہ میرے بچے
 بس آنے ہی والے ہوں گے اور میرا بیٹا آ گیا۔ دیکھو
 ظہور ان لوگوں نے مجھے بلا وجہ ہی گرفتار کر لیا ہے۔“
 ظہور نے چبھتی نگاہوں سے ماں کے بگڑے ہوئے حلیے
 کو دیکھا اور قریب جا کر دانت چباتے ہوئے بولا۔
 ”بس یہ کسر باقی تھی وہ بھی آج پوری ہو گئی۔“
 غصے اور اشتعال سے ظہور کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
 ”مم..... مگر میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ بلا وجہ
 کی غلط فہمی ہو رہی ہے ان لوگوں کو۔“
 ”بس کریں ماما..... بس کریں۔“ ظہور غصے
 چلایا۔

”غلط فہمی کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جس
 پٹواری کو درمیان میں ڈال کر یہ مکان فروخت کر رہی
 تھیں ہم نے اس سے ساری جانچ پڑتال کر لی
 ہے۔ یہاں تک کہ گھر کی رجسٹریوں کی فوٹو کاپی بھی ہم
 نے اس سے لے لی ہے جس کے تحت یہ ثابت ہوتا ہے
 کہ یہ حیات محمد کی منکوحہ ہیں اور حیات محمد زمین کا باپ
 تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ حیات محمد کی دوسری زوجہ ہیں
 جن کی سکونت شہر میں تھی۔ بقول ان کے زمین جو ان کی
 سوتیلی بیٹی ہے اس کے کہنے پر وہ یہ مکان بیچ رہی ہیں تو
 اس سے ثابت یہ ہوا کہ سب کچھ ان کے علم میں ہے اور
 یہ قانون کو بیوقوف سمجھ رہی ہیں۔“ جو شخص ظہور کے ہمراہ
 آیا تھا انسپکٹر اسے تفصیل بتا رہا تھا۔ وہ کوئی آفیسر تھا انسپکٹر
 کو آئی ڈی کارڈ دکھایا تو انسپکٹر یکدم سنجیدہ ہو کر سیلوٹ
 مارنے لگا اس کے بعد انسپکٹر نے دوسرا کوئی لفظ نہ کہا اور

”خدا نہ کرے کہ ہم سب کو کسی ذلت کا سامنا ہو۔“

”میں نے تو صبا اور سمیرا کو بھی بتا دیا ہے۔ آخر ایسی باتیں زیادہ چھپی تو نہیں رہتیں اور ویسے بھی زمین سے بالکل بھی رابطہ نہیں ہو پارہا ہے کسی کو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ ہے کہاں۔ بیگم اور لیس بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہیں ایک تو یہ جگہ ہمارے لیے اجنبی ہے کسی سے کسی کے بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتے۔ کامران کا ایک نمبر تھا تمہارے پاس ہزاروں فون کر لیے ہیں اس پر جواب ہی موصول نہیں ہوتا۔“

”یہ جو شوبز کے لوگ ہوتے ہیں ناں ان کے پاس کوئی ایک نمبر نہیں ہوتا..... نہ جانے وہ تمہیں کون سا نمبر دے گیا تھا جسے تم لوگ محفوظ کر کے بیٹھی ہو کم از کم اس کی رہائش تو پوچھنا چاہیے تھی۔“

”مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کس طرح ماما نے ایک اجنبی پر اعتماد کر کے زمین جیسی گنوار اور بھولی بھالی لڑکی کو اس کے حوالے کر دیا..... آخر ماما کا مفاد کیا تھا اور ماما نے کیوں ایسا کیا جبکہ زمین بالکل بھی ایسی نہیں تھی۔ کیوں پھر ماما نے اسے اس فیلڈ میں دھکا دیا۔“

”پہلی بات تو یہ کہ تمہیں کیا معلوم کہ زمین بھولی بھالی تھی یا کیسی تھی..... پوری کھنی میسنی تھی وہ... جب وہ اپنے شوہر کو جان سے مار سکتی ہے اور اس کا ثبوت تو یہ دیکھو ماما نے ذرا سی اڑان کیا دی اس نے سارے پر ہی کھول لیے، آنکھیں ہی پلٹ لیں پیچھے مڑ کر ہی نہیں دیکھا ضرور ایسے پتا تھا ناں کہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی چاند چڑھے گا بھی تو وہ مفروز ہوئی ہے۔“

”کتنا ہی مفروز ہو جائے وہ مگر مجھ سے نہیں بچ سکتی۔“ ارشاد بیگم سو بے ہوئے چہرے اور بکھرے بالوں کے ہمراہ کمرے سے نمودار ہوئیں اور صوفے پر بیٹھ کر طمطراق سے کہنے لگیں۔

”جس اسکرین میں جا کر اس نے آنکھیں پلٹیں ہیں ناں اسی میں سے ہاتھ دے کر کھینچ لوں گی اسے۔“ ظہور نے ماں کی طرف چبھتی نگاہوں سے دیکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔

”آپ اپنی فکر کریں اور اس خوش فہمی کو اپنے سے اتار دیں کہ وہ آپ سے روبرو مل کر آپ اب کو پہچان لے گی۔ اگر اس نے ایسا کر دیا کہ آپ کو پہچاننے سے انکار کر دے..... تب آپ یا میں کیا کر لیں گے۔“ ارشاد بیگم کے سر پر ہتھوڑا سا پڑا تھا۔ ناگواری چہرے پر لا کر کہنے لگیں۔

”ایک گنوار زمین کس طرح مجھے پاگل بنا سکتی ہے..... ہرگز نہیں.....“ ارشاد بیگم بری طرح تلملائی تھیں۔

”جس طرح نمرود کو ایک مچھر نے مار دیا تھا۔ آپ کی ہوشیاری اور عقلمندی کو گنوار زمین کیوں چیت نہیں کر سکتی۔“ ظہور نے دل ہی دل میں سوچا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

گھر سے ہزاروں کالز آئی تھیں مگر اس نے ایک بھی فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ وہ وہاں کسی سے بھی تعلق رکھنا تو کیا بات بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ساری زندگی واپس جانا نہیں چاہتی تھی اور یہ فیصلہ اس نے دل سے کیا تھا۔ کچھ دن تو وہ کامران اور فرح کے ہاں مہمان بن کر رہی پھر اس نے اپنی رہائش علیحدہ کر لی۔ فی الحال وہ کرایے پر ہی رہ رہی تھی۔ سیریل میں اسے یکدم پیشکش آ گئی تھی جس کی وجہ سے اسے فنانشلی خاصی سپورٹ ملی تھی۔

اس کے پیچھے گھر میں کیا اودھم مچا تھا۔ وہ ہر بات سے بے خبر تھی لیکن آج جب کامران نے اس کے گھر آ کر اس سے بات کی تو وہ کامران کو حیرانی سے دیکھتی رہ گئی۔ وہ خاصا ڈسٹرب اور خفا سا تھا۔

”مس زیب آپ ایسے کیسے..... اپنی فیملی کو چھوڑ کر یہاں رہائش کر سکتی ہیں۔ کم از کم اس بات کا تو خیال کریں کہ آپ میرے ساتھ آئی تھیں۔ آپ کی مدد نے ماما کا جینا حیران کر رکھا ہے کہ میں آپ کو بھگا کر لے گیا ہوں..... آپ نے اپنے گھر والوں سے رابطہ ختم کر رکھا ہے۔ فون بند کیے ہوئے ہیں۔ نہ جانے وہ لوگ میرے بارے میں کیسے کیسے خدشات کو جنم دے رہے ہوں

گے۔ آپ ابھی فوراً رابطہ کریں اور اپنے گھر والوں کو یقین دلائیں کہ آپ اپنی مرضی سے یہاں ہیں اور جو بھی فیصلہ ہے وہ آپ کا اپنا ہے۔ میرا اس سے کوئی لین دین نہیں ہے.....“ وہ سخت جھنجھلایا ہوا تھا۔

”بمگر میں ایسا نہیں کروں گی کامران صاحب.....“

”کیوں نہیں کریں گی آپ..... آپ میرے ساتھ آئی تھیں۔ الزام تو مجھی پہ آتا ہے۔ میری ماں کی رہائش وہیں ہے۔ تمہاری مدر تو ان کا جینا حرام کر دیں گی۔ وہ تو شکر تھا کہ ماما میری طرف آئی ہوئی تھیں۔ جانے پر معلوم ہوا ہے کہ وہاں کیسی کیسی باتیں ہو رہی ہیں۔ فارگاڈ سیک مس زیب، دیکھیں آپ میرے کیریئر کو خراب نہ کریں۔ آپ کی مدر نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے آپ کو گھر نہ پہنچایا تو وہ پریس کانفرنس کریں گی۔“

”ہاں..... تو کرنے دو ناں۔ انہیں پریس کانفرنس۔“

”کیا مطلب.....؟“ کامران گھوم ہی تو گیا۔ زمین کھلکھلا کر نہیں پڑی۔

”بدنام اگر بچوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔“ کامران نے حیرانی سے زمین کو دیکھا۔

”یہ جو آپ کو کوئی گائیڈ کر رہا ہے ناں بہت ہی غلط گائیڈ کر رہا ہے۔ ابھی تو آپ کو پوری طرح شہرت بھی حاصل نہیں ہوئی اور آپ چلی ہیں میڈیا میں بدنام ہونے کے لیے۔ بہر حال اگر آپ نے ان سے رابطہ نہ کیا تو میں اپنی فیملی کو ڈسٹرب نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کا ایڈریس دے دوں گا انہیں۔“ کامران نے یہ کہا اور چلا گیا۔

زمین گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔ اگر کامران نے ایسا کر دیا تو وہ اپنا تحفظ کیسے کرے گی..... اسی وقت..... میڈم یاسمین شیرازی کا خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا۔ جن کے نئے ڈراما سیریل میں وہ ہیروئن کا پاورفل رول ادا کر رہی تھی۔ میڈم یاسمین شیرازی نے اسے بہت حوصلہ اور ہمت دی تھی۔ کامران نے اسے

UrduPhoto.com

ملوں گی۔ تم پریشان مت ہونا اوکے..... اللہ حافظ
زمین نے فون بند کیا اور ہلکی پھلکی ہو گئی۔

☆☆☆

”مجھے یقین نہیں آتا کہ فرزان اپنے گھر والوں کی تمہاری خاطر چھوڑ چکا ہے۔ خصوصاً اپنی ماں کو اور اس کی ماں..... جس بیٹے کو دن رات آنکھوں کے سامنے رکھتی تھی کیسے اور کس طرح مطمئن ہوگی۔ سوچتا ہوں تو کچھ بھائی نہیں دیتا۔ میں نے کئی دن فرزان کا بغور جائزہ لیا ہے۔ وہ یہاں آ کر بالکل مگن اور خوش ہے۔ جیسے اس کے پیچھے کوئی تھا ہی نہیں۔ سچ پوچھو ناں..... روحا بیٹا اس کی اس اچانک تبدیلی نے مجھے ابھی تک محضے میں رکھا ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں ضرور کوئی نہ کوئی چال ہے یہ..... کچھ نہ کچھ ہے سہی جو فرزان میں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے۔ تم نے پوچھا ہے فرزان سے..... اس کے گھر میں سب خیریت تو ہے ناں.....؟“ روحا نے باپ کو کوئی جواب نہ دیا۔ کم صدم سی بیٹھی رہی۔ عماد الدین نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے روحا..... تم اس قدر چپ کیوں ہو.....؟“

”نہیں..... تو ڈیڈی ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ ہی کی بات سن رہی تھی۔“
”سن رہی تھی یا اس پر غور و فکر میں نکل گئی تھیں، ہاں.....“ عماد الدین نے ہلکا سا مسکرا کر کہا تو روحا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

اتنے میں عماد الدین کا سیل فون بجنے لگا۔ ان کی توجہ اس طرف ہوئی تو روحا چپ چاپ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس کے اندر باہر دھواں سا بیا تھا۔ فرزان میں تبدیلی تو واقعی رونما ہوتی نظر آ رہی تھی مگر اس کے من میں کیا تھا وہ جانچ ہی نہیں پائی تھی۔ کتنے روز سے وہ اس کے قریب تھا لیکن اس کے اندر وہ چاہت ہی نمایاں نہیں ہوتی تھی جس کی وہ حق دار تھی۔

ایک روز یونہی اس نے فرزان کا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

”مجھے لگتا ہے فرزان..... تم نے مجھے ابھی تک

اس فیلڈ میں متعارف ضرور کرایا تھا مگر اسے سپورٹ کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ میڈم شیرازی نے ہر طرح کی سپورٹ کا وعدہ بھی کیا تھا اور ہر طرح کے تحفظ کی یقین دہانی بھی کرائی تھی۔ دوسرے ہی پل وہ میڈم شیرازی کو فون ملانے لگی۔

”ہاں..... زیب..... کیسی ہو۔ میں تمہاری طرف ہی آرہی تھی۔“

”کب تک آئیں گی آپ میری طرف..... مجھے ضروری بات کرنا تھی آپ سے۔“

”ہاں..... ہاں..... بتاؤ میں سن رہی ہوں..... کچھ وقت لگ جائے گا مجھے آنے میں۔ تم بتاؤ..... بات کیا ہے.....“ زمین نے گھبراتے ہوئے سارا مدعا سنا دیا۔

”ارے تو اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ تم ایک بار گھر فون کر کے ان لوگوں سے بات کر لو اور کہہ دو کہ تم ان سے اب کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتیں..... اور بس.....“

”آپ کو نہیں پتا..... اس بات پہ میری سوتیلی ماں ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ وہ پہلے ہی پریس کا نفرنس کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔“ میڈم شیرازی نے قہقہہ لگایا۔
”میں نے تمہیں سمجھایا تھا ناں۔ تم ان گیڈر بھکیوں سے مت گھبراتا۔ بھونکنے دو انہیں..... وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ انڈر سٹینڈ..... آخر وہ لوگ لگتے ہی کیا ہیں تمہارے اور ویسے بھی تم ان فضول باتوں پر اپنی انرجی ضائع مت کرو۔ دو تین دن کے بعد تو تمہاری ریہرسل شروع ہو جائے گی اور تمہیں پتا ہے کہ سارا ڈراما لندن میں شوٹ ہو رہا ہے۔ چھ ماہ تک تو تم یہاں نظر ہی نہیں آؤ گی پھر کس بات کی پریشانی ہے تمہیں..... اوکے..... خود کو ریلیکس کرو اور زیادہ کسی کے دباؤ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کامران اور فرح کے دباؤ میں بھی مت آنا۔ میں اچھی طرح سے جانتی ہوں ایسے لوگوں کو..... وہ ضرور تمہارے ٹیلنٹ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے مگر اب تم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو گی۔ انڈر سٹینڈ..... بہر حال میں تم سے آ کر تفصیلاً

معاف نہیں کیا۔“

”کیا مطلب.....؟“ فرزان چونک سا گیا۔

”مطلب تم اپنے آپ سے پوچھو۔“ وہ نظریں

چراگئی۔ فرزان جان کر انجان بن رہا تھا۔

”ایک روز میں نے تمہیں نامردی کا طعنہ دیا تھا

تب سے اب تک میں خود کو معاف نہیں کر پائی حالانکہ

مجھے پتا بھی تھا کہ یہ ساری دوریاں..... تمہاری ماما کی وجہ

سے ہیں مگر اب تو تمہاری ماما نہیں ہیں پھر تم مجھ سے اتنے

دور دور کیوں رہتے ہو فرزان.....؟“

فرزان نے اس کی بات پر گہری سانس خارج کی

اور سر جھٹک کر بولا۔

”جو کچھ ہو چکا ہے روحا سے بار بار دہرا کر نہ خود

کو تکلیف دیا کرو اور نہ ہی مجھے..... اور میں تمہارے

قریب ہی تو ہوں۔“

”ہاں لیکن اس قربت میں ایک جھجک واقع

ہے۔“

”جسے تم نے صحیح نوٹ کیا ہے..... اور وہ شاید اس

لیے ہے کہ یہ چھت..... یہ زمین..... یہ گھر..... یہ

کمرہ..... یہ بستر جب کچھ تمہارے ڈیڈی کا ہے.....

جس روز میں تمہیں یہ سب کچھ خود مہیا کر کے دوں گا۔

تب تم سے اپنا ازدواجی حق بھی وصول کر لوں گا۔“ وہ ہلکا

سامسکرا رہا تھا۔

”مگر یہ سب کچھ ہمارا ہی تو ہے فرزان.....! وہ

بے ساختہ کہہ گئی۔

”نہیں..... صرف تمہارا.....“ فرزان بالکل

سنجیدہ تھا۔ وہ چونک سی گئی۔

”مگر میں یہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی

فرزان۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی تھی۔ تمہیں ہی اس گھر

میں جگہ بنانا ہوگی۔“

”جانتا ہوں میں یہ بات..... مگر میں اپنی انا کو

چکنا چور نہیں کر سکتا اور میرا خیال ہے۔ تم کبھی یہ پسند نہیں

کرو گی۔“ پھر وہ روحا کے قریب آیا اور نرمی سے گال

چھوتے ہوئے بولا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں روحا..... اگر تمہیں

UrduPhoto.com

محبت کرتے تھے۔“

”مگر ماں کو صرف پیسے سے محبت تھی۔“

فرزان..... ظہور یا غیور سے نہیں.....“

وہ جلد بازی میں کہہ تو گیا مگر پچھتاوے کی لہر اس کے چہرے سے نہ گئی۔ روحا ایک ٹک اسے دیکھتی رہی پھر وہ ایک پل وہاں نہ رکا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ اس جلد بازی میں اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کا سیل فون وہیں صوفے پر پڑا رہ گیا ہے۔

”تو کیا تم بھی اپنی ماں کو غیور احمد کی طرح ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکے ہو؟“ روحا کرب سے سوچ رہی تھی۔ اسے اس وقت نہ تو ارشاد بیگم سے ہمدردی تھی اور نہ ہی فرزان سے گلہ۔ افسوس تھا تو ان وجوہات کا جس کی بنا پر یہ خلیج قائم ہوئی تھی۔ وہ رویہ جس سے بیٹے دور ہو رہے تھے۔ ابھی نہ جانے روحا کتنا اور سوچتی بھی فرزان کے سیل کی بپ بجی۔

”اوہ..... فرزان تو اپنا فون ہی بھول گیا۔“ وہ دوڑ کر باہر نکلی ٹیس سے دیکھا گاڑی جا چکی تھی۔ چونک کر گیٹ بند کر کے اندر آ رہا تھا۔ وہ واپس کمرے میں آ گئی۔ فون مسلسل بج رہا تھا۔

ناچار روحا کو فون اٹینڈ کرنا پڑا۔ ابھی اس نے فون اوکے ہی کیا تھا۔ دوسری طرف سے کوئی نسوانی آواز گھن گرج کے ساتھ جاری و ساری ہو گئی۔

”کہاں تھے اتنی دیر سے فون کر رہی ہوں۔ ضرور

اپنی بیوی کی باتوں میں کھوئے ہوئے ہو گے۔ ہاں اس کے سامنے میرا دھیان ہی کہاں آتا ہوگا۔ خیر میرے سامنے تمہیں اپنی بیوی کا کبھی دھیان نہیں آتا۔ تم ہو ہی ایسے۔“ یہ کہہ کر ثنائے بے باک سا قہقہہ لگایا۔ ”اینی وے..... شفٹنگ کی ساری تیاری مکمل کر لی ہے میں نے۔ تم جلدی پہنچو۔ اے..... ہیلو..... تم بولتے کیوں نہیں.....“ روحا کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ یکدم اس نے فون کاٹ دیا اور پھر فون بالکل ہی آف کر دیا۔ ابھی تک اس کی سانسیں بحال نہیں ہوئی تھیں۔ دماغ میں بری طرح چرخیاں چل رہی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں منتشر تھیں۔ سینے میں اتنی گھٹن بڑھی کہ

ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے نزدیک ہو کر بھی دور ہیں تو میں ابھی پل بھر میں سارے فاصلے مٹا سکتا ہوں..... لیکن..... میں خود سے نظریں نہیں ملا پاؤں گا روحا..... مجھے کم از کم کچھ وقت دو۔ میں تمہارے سامنے، تمہارے ڈیڈی کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا ہوسکوں جو ذمے داریاں انہوں نے مجھے سونپی ہیں انہیں نبھاسکوں۔ ان کے معیار پر پورا اتر سکوں۔ اپنا معیار بلند کر سکوں۔“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا فرزان.....“ روحا اس کی گفتگو یہ نادم سی ہو گئی۔

”تمہارا مطلب کچھ بھی تھا لیکن بات بہت سادہ سی تھی۔“ وہ ذومعنی انداز میں روحا کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ روحا جھینپ سی گئی۔ ”اینی وے باقی باتیں رات کو ہوں گی۔“ وہ روحا کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کوٹ پہننے لگا۔ روحا نے کوٹ پہنانے میں مدد کی۔

”ابھی مجھے وکیل سے ملنا ہے شاید انکل کو کبھی مجھے لے جانا پڑے۔“

”تو تم ابھی لے کر جاؤ گے ڈیڈی کو.....“

”نہیں بھی..... میں نے کہا کہ اس کی ضرورت پڑ بھی سکتی ہے اور نہیں بھی..... بہر حال تم ان کا خیال رکھنا۔ ان کی طبیعت ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔“ اس کی اپنائیت اور ذمے داریاں سنبھالنے پر وہ مشکور سی نظر آ رہی تھی۔

”کتنا خیال رکھنے لگے ہو تم ہمارا.....“

”کہاں کھو گئیں.....“ اسے گم صم دیکھ کر فرزان نے ہاتھ ہلایا۔ وہ چونکی۔

”تمہیں اپنے گھر والے یاد نہیں آتے فرزان.....؟“ اس کا سوال اتنا بے ساختہ تھا کہ فرزان کے تاثرات منجمد سے ہو گئے پھر وہ کچھ غلٹ بھرے خشک لہجے میں بولا۔

”میں اپنے ماضی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا روحا۔“

”میں..... زمانوں کی نہیں رشتوں کی بات کر رہی ہوں فرزان۔ وہاں تمہاری ماں تھی، جس سے تم از حد

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

”یا خداوند یہ فرزان..... فرزان مجھ سے کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ یہ لڑکی کون تھی اور کیسی باتیں کر رہی تھی..... یہ چکر کب سے چل رہا ہے۔ میں تو نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا ایک شادی شدہ مرد کو بیوی کے ہوتے ہوئے بھی بیوی کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوتی.....“ روحا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ تو فرزان کے آنے کی خوشی کا جشن منا رہی تھی لیکن وہ تو کسی اور کا ہو کر پھر اس کی زندگی میں آیا تھا پھر اب کیا کرنے آیا تھا وہ..... دور دور تک ویرانہ تھا۔ اس سوال کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔ ڈیڈی کے خدشات خود اس کے خدشات سب آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ تبھی اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جلدی سے فون رکھا اور آنسو صاف کیے۔

”کون ہے.....؟“ وہ دروازے کی طرف آئی۔

”روحا بی بی، بڑے صاحب آپ کو بلا رہے

ہیں۔“

”تم چلو میں آتی ہوں.....“ وہ فریش ہو کر ڈیڈی کے سامنے جانا چاہتی تھی۔

”انہوں نے کہا ہے کہ آپ جلدی نیچے آ جائیں۔ فرزان میاں بھی ان کے پاس بیٹھے ہیں۔“

”کیا فرزان تو چلے گئے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ گاڑی کو نکلتے ہوئے۔“

”وہ جی بڑے صاحب نے فرزان میاں کو روک لیا تھا۔ ڈرائیور کے ہمراہ گاڑی بھجوا کر وکیل کو گھر بلوایا ہے شاید۔ اسی سلسلے میں آپ کو بلوایا ہے ہیں۔“

”اچھا تم چلو، میں آ رہی ہوں۔“ روحا تذبذب میں پڑ گئی۔

”نہ جانے اب کون سا نیا فیصلہ کرنے جا رہے ہیں ڈیڈی..... کہیں کچھ اور تو فرزان کو سوچنے نہیں جا رہے ڈیڈی..... یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ..... یا خداوند میری مدد فرما..... میں ڈیڈی کو کیسے روکوں گی.....“

ڈرائنگ روم میں ڈیڈی کے ہمراہ فرزان کو بھی بیٹھے پایا۔ وہ کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ عماد الدین نے بھی عینک آنکھوں پر رکھی ہوئی تھی اور کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔

”آپ نے بلوایا تھا ڈیڈی.....؟“

”ہاں بیٹھو.....“ روحا بیٹھ گئی۔ انہوں نے کچھ توقف کیا پھر کہنے لگے۔

”روحا بیٹا..... میں اپنا آبائی گھر بیچ رہا ہوں۔“

”مگر کیوں ڈیڈی؟“

”اس کے بدلے تمہارے نام کی یہاں زمین خریدنا چاہتا ہوں۔“

”مگر میں اس زمین کا کیا کروں گی؟“

”مستقبل میں جو کچھ بھی چاہو تم کر سکتی ہو۔ اس پر فیکٹری بنالینا۔ چاہو تو گھر بنالینا..... یا کچھ بھی..... دوسرے شہر میں وہ گھر قیمتی ہوتے ہوئے بھی ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔“ باپ کے عجلت بھرے فیصلے پر روحا پہلو بدل کر رہ گئی۔

”اس گھر کو ایسے ہی پڑا رہنے دیں ڈیڈی..... کیونکہ وہ گھر ماما کے نام ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ماما کے نام کی کوئی بھی چیز ہم ان فضول سے فیصلوں میں ختم کریں..... جب تک ہم ہیں وہ گھر ایسے ہی رہے گا۔ ہم وہاں آتے جاتے رہیں گے ڈیڈی اگر آپ کو پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ گھر خالی پڑا ہے تو اسے لاہور کے کسی پُر اعتماد ویلفیئر ادارے کے سپرد کر دیتے ہیں کیونکہ وہ رقبہ اور منزل کے لحاظ سے خاصا گنجائش والا گھر ہے۔ وہاں ویلفیئر اسکول بن سکتا ہے۔ ہاسٹل بن سکتا ہے، کوئی بھی ذیلی ادارہ بن سکتا ہے تاحیات چلنے والا کوئی بھی ایسا نیک عمل جو ماما کے لیے صدقہ جاریہ بن جائے۔“

روحا کے مشورے پر عماد الدین کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں لیکن فرزان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی روحا ہے جو بستر سے پاؤں بھی اتارتی تھی تو باپ سے مشورہ کرتی تھی اور آج باپ کو مشورہ دے رہی تھی وہ بھی اس قدر دو ٹوک انداز میں کہ فرزان کے ہاتھ سے یک دم کروڑوں

آئی۔“ ثنا نے غصے میں فرزان سے فون چھپٹا اور خود میموری چیک کرنے لگی پھر اپنی کال نہ پا کر فون فرزان کی طرف اچھال دیا۔

”مجھے لگا تھا کہ تم نے فون سن کر بند کر دیا ہے۔“

”اپنی دے..... تم نے کہا تھا۔ شاچنگ کے لیے جانا ہے اور ابھی تک تمہیں ٹائم نہیں ملا جبکہ میں نے ساری سیٹنگ بھی مکمل کر لی ہے۔ چند ضروری چیزیں ہیں جو خریدنا باقی ہیں۔“

فرزان کا ذہن ثنا کی بات میں الجھا رہا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ فون روحا نے اٹینڈ کیا ہو اور پھر بعد میں..... لیکن اگر روحا فون اٹینڈ کر لیتی تو کیا مجھ سے پوچھتی نہیں اس کے رویے میں تو میں نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔ ضرور ثنا کو ہی غلط فہمی ہو رہی ہوگی۔“

”ہیلو مسٹر، کہاں کھوئے ہو، معلوم ہے بیوی بہت خوبصورت ہے تمہاری اور تمہیں چاہتی بھی ہے لیکن ہم سے زیادہ نہیں چاہتی ہوگی۔“ ثنا نے فخر سے گردن اکڑائی تو فرزان، ثنا کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا اور ستاتے ہوئے بولا۔

”اس بات کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس.....؟“

”ثبوت..... ثبوت صاف ظاہر ہے جو برے وقت میں کام آتا ہے وہی سچا اور پکا دوست ہوتا ہے۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں لیکن تھوڑا سا برا وقت جھیلنے میں فائدہ تمہارا بھی تو ہوا ہے۔ اتنا زبردست لکڑی اپارٹمنٹ مل گیا تمہیں۔“ ثنا اس کی سوچ پر دل ہی دل میں جل کر خاک ہو گئی۔

”ایک چھوٹی سی رہائش دے کر تم سمجھ رہے ہو کہ تم نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے جبکہ خود کاروبار سے لے کر جائیداد تک کہ خواب دیکھ رہے ہو۔“

”کیا ہوا میری بات بری لگی ہے تمہیں.....؟“

فرزان، ثنا کی خاموشی پر پریشان سا ہو گیا۔

”نہیں، اس میں برا منانے والی کون سی بات ہے..... خاک سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا ہے تم نے مجھے۔“ یہ کہہ کر ثنا کافی بنا نے لگی۔ فرزان اس کی دل

روپیہ نکل گیا۔

”جیتتی رہو بیٹی.....“ عماد الدین خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے لیکن فرزان دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسی دوران ڈرائیور نے اندر آ کر وکیل کے آنے کی اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے ڈیڈی، میں چلتی ہوں۔ آپ وکیل سے بھی مشورہ کر لیں۔“ روحا یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ اب فرزان کے لیے اس میٹنگ میں کوئی چارم نہیں تھا۔

☆☆☆

”مل گئی تمہیں فرصت میرے پاس آنے کی۔“ ثنا بگڑے ہوئے موڈ میں فرزان پر حملہ آور ہوئی۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے فرزان پڑمردہ اور تھکا ہوا تھا۔ اپنی مصروفیات سے ثنا کو آگاہ کرنے لگا۔

”کتنے فون کیے ہیں تمہیں۔ کم از کم فون تو اٹینڈ کر سکتے تھے۔“

”ہاں یار، فون آف تھا۔ مجھے پتا ہی نہ چلا..... ابھی ابھی آن کیا ہے۔“

”بس بس رہے دو..... جان بوجھ کر فون آف کر رکھا تھا تم نے.....!“

”قسم سے یار تم خود دیکھ لو۔ سارا دن سے ایک بھی کال نہیں ملائی۔ فون آف تھا ابھی اوکے کیا ہے۔“

”یوں کہو ناں صبح جو میں نے فون کیا تھا۔ وہ سن کر تم نے فون آف کر دیا تا کہ سارا دن میری آواز سننے کو نہ ملے اور پھر تم آن کرنا ہی بھول گئے۔“

”کیا کہا تم نے..... تم نے صبح فون کیا تھا۔ کس وقت...؟ فرزان کو جھٹکا لگا کیونکہ وہ تو فون کمرے میں بھول گیا تھا پھر بعد میں جا کر فون اٹھایا تو یہ بھی نہ دیکھا کہ آن ہے کہ آف اور جیب میں ڈال کر نکل گیا۔“

”صبح تقریباً گیارہ بجے میں نے تمہیں کال کی تھی۔ تم نے میری کال اٹینڈ کی تھی اور پھر فون کاٹ دیا اور ایسا آف کیا کہ سارا دن وہ بند ہی پڑا رہا۔“

”مگر یار یہاں تو تمہاری کوئی کال نہیں ہے۔ نہ گیارہ بجے نہ ہی دس بجے نہ اس سے پہلے یہ دیکھو۔ ساری کالز پرانی ڈیٹ کی ہیں۔ آج تو کوئی کال ہی نہیں

جوئی میں لگ گیا۔

”آئی ایم سوری غلطی ہو گئی۔ بس تھوڑا ڈپر پریس تھا اس لیے..... تمہیں پتا ہے آج روجا مجھ سے کیا شکایت کر رہی تھی۔“ اس نے روجا کی پریشانی کے بارے میں بتایا پھر خود ہی ہنس پڑا۔

”سچ پوچھو ناں ثنا..... میرا دل ہی نہیں کرتا اس کے قریب جانے کو۔ تمہیں نہیں پتا کہ وہ کتنی خود غرض عورت ہے۔ اس نے مجھے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نہ جانے کیسی مجبوری تھی جو میں اسے..... اس سے جان نہیں چھڑا سکا لیکن اب قدرت میرا ساتھ دے رہی ہے۔ میں اس سے پورا انتقام لوں گا۔ اس کے بے صبرے پن نے مجھے میری ماں کے سامنے ذلیل و خوار کیا تھا۔ اب وہ خود ذلیل و خوار ہو کر رہے گی۔“

فرزان غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ ثنا نے چپ چاپ کافی کا گک اس کی طرف کر دیا اور خود آہستہ آہستہ کافی پینے لگی۔

”اسے ذلیل و خوار کر کے تمہیں کیا ملے گا.....؟“ وہ طنزیہ بولی تو فرزان چونک گیا۔ ”وہ تم سے محبت مانگ رہی ہے، قربت مانگ رہی ہے، تم اسے سب کچھ دوتا کہ اس کا یقین تم پر بڑھتا چلا جائے۔ وہ جتنا تم پر اعتماد کرے گی، تمہارا اتنا ہی فائدہ ہوگا۔ تم اس سے مت بھاگو فرزان اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔“ ثنا کھوئے کھوئے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ درحقیقت اسے اب بھی فرزان کے لفظوں کی چیھن محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

زبین کا فون ارشاد بیگم کے فون پر آیا تھا اور جو کچھ اس نے ارشاد بیگم سے کہا تھا وہ ارشاد بیگم کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ بہت دیر تک تو ارشاد بیگم صم سی بیٹھی رہیں پھر شمع کو بلا کر حیرانی و پریشانی سے بتانے لگیں۔

”مجھے تو یقین ہی نہیں ہوا کہ وہ زبین ہے.....“

”کیا.....؟“ شمع کو دھچکا لگا۔ ”زبین کا فون آیا تھا اور آپ نے ہمیں بتایا نہیں..... نمبر بتائیں کون سا تھا ہم لوگ خود بات کریں گے۔“ شمع اور ظہور غصے میں دکھائی

دے رہے تھے۔

”اس نے کہا ہے کہ وہ اس نمبر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے تعلق کے ساتھ ہی ختم کر کے جا رہی ہے۔“

”کہاں جا رہی ہے وہ.....؟“ شمع اور ظہور ایک ساتھ بولے۔

”وہ لندن چلی گئی ہے۔“

”لندن..... ہاں لندن.....“

”اور اس نے کہا ہے کہ وہ ہم لوگوں کو نہیں جانتی اور نہ ہی زندگی میں کبھی ملنا چاہے گی۔ جس روز میں نے اسے گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی تھی اسی روز گنوار زبین مر گئی تھی۔ ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم اس گنوار زبین کو ڈھونڈنے کی کوشش نہ کریں۔“ ارشاد بیگم کھوئے کھوئے سے انداز میں اپنی اولاد کو بتا رہی تھیں۔

”مگر زبین ہمارے ساتھ ایسا کس طرح کر سکتی ہے۔ اسے اندازہ ہے کہ یہاں کیا طوفان آیا ہوا ہے۔“ ظہور سخت جھنجھلا رہا تھا۔

”ان لوگوں نے ماما کے خلاف ہرچہ کٹوا دیا ہے۔ عدالتی کارروائی کے بغیر اب کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ زبین نے اگر سچائی سامنے نہ کی تو ماما گرفتار ہو جائیں گی۔“ ظہور بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا۔ یک دم ارشاد بیگم کو کچھ ہوا اور وہ کھڑے کھڑے چکرا کر صوفے پر آ گئیں۔ دوسرے ہی پل ظہور اور شمع کی چیخیں نکل گئیں۔

☆☆☆

”بہت شدید فالج کا اٹیک ہوا ہے انہیں، ہماری پوری کوشش ہے کہ انہیں اچھی سے اچھی میڈیسن دے کر بہتر کرنے کی کوشش کریں لیکن ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کی زیادتی کی وجہ سے لگتا یہی ہے کہ جو حصے ڈنچ ہو چکے ہیں۔ وہ اب مشکل سے ہی فعال ہوں گے۔ بہر حال امید سے بہتر تو کچھ نہیں۔ آپ اللہ سے دعا کریں ان کی صحت کے لیے۔ ویسے بھی جدید سائنس نے فزیو تھراپی کے ذریعے فالج کے علاج کو مزید آسان اور مختصر کر دیا ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے لیکن فالج سے ان کا آدھا وجود بالکل مفلوج ہو گیا ہے۔“

سمیرا، صبا، شمع کا رور و کر برا حال تھا۔ ادھر ارشاد بیگم کے دونوں داماد بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ ظہور کے خود ارمان ختم ہو چکے تھے۔

”اتنے کڑے وقت میں حیرت ہو رہی ہے کہ بیٹوں نے آکر نہیں پوچھا۔“ صبا اور سمیرا کے شوہر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

”کوئی پوچھے تب ناں، جب انہیں اطلاع ہو..... غیور بھائی کا تو ہمیں اتنا پتا معلوم نہیں البتہ فرزان کو تو فون کیا جاسکتا تھا۔“ صبا، شمع سے کہہ رہی تھی۔

شمع کیا بتاتی، وہ ہزاروں فون کر چکی تھی لیکن فرزان کا نمبر بالکل ہی بند تھا، لگتا تھا اس نے نمبر بدل لیا تھا۔ سوائے فون نمبر کے کسی کو اس کا اتنا پتا معلوم نہیں تھا۔ کیسا مشکل وقت آن پڑا تھا جن بیٹوں کے لیے ماما پیروں فقیروں کے آستانوں پر ڈیرے ڈال لیا کرتی تھی آج اس کڑے وقت میں وہ ماں سے کتنی دور بیٹھے ہیں اور یہ جانے کن حالوں میں ہیں۔“ شمع روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
روحا پر فرزان کا التفات اور توجہ بڑھتی جا رہی تھی اگر روحا نے فرزان کی فون کال نہ سنی ہوتی تو وہ فرزان کی محبت میں یکسر گم ہو جاتی۔ فون کال کے علاوہ اس نے فرزان کی غیر موجودگی میں اس کی فون میموری بھی چیک کی تھی جس میں بہت ہی رومینک ایس ایم ایس کی بھرمار تھی اور سب ایک ہی نمبر سے تھے اور وہ نمبر ثنا کا تھا۔ نمبر اٹینڈ کر کے اس نے اسے ڈی لیٹ کر دیا تھا تا کہ فرزان کو اپنی چوری پکڑے جانے کا علم نہ ہو سکے۔ فرزان تو بہت مطمئن اور خوش تھا لیکن وہ بہت پریشان اور غیر محفوظ سی ہو گئی تھی۔ بھائی نہیں دیتا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کرے..... سوائے اس کے کہ وہ فرزان کو اپنے گھر سے چلے جانے کا کہہ دے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ فرزان سے کیسے تعلق ختم کر سکتی تھی..... چند دن قبل ہی تو قدرت نے اسے ایک انوکھی نوید سنائی تھی جسے پا کر وہ مسرور بھی تھی اور مغموم بھی..... پھر ڈیڈی نے بھی

فرزان پر مکمل اعتماد کر لیا تھا۔ سبھی کچھ تو فرزان کے سپرد کر چکے تھے۔ اس کے کردار کی باز پرس کے نتائج بہت خوفناک ہو سکتے تھے اور پھر اس کے اثرات ڈیڈی پر کس طرح پڑیں گے۔ وہ سوچتی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کس طرح بتائے ڈیڈی کو..... وہ کسی نقصان کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی مگر وہ یہ بھی تو نہیں جانتی تھی کہ ثنا سے فرزان کا تعلق کس حد تک ہے پھر بھی وہ یہ بات ڈیڈی کو ہرگز نہیں بتائے گی۔ وہ فرزان پر کبھی کچھ ظاہر نہیں کرے گی۔ سارا معاملہ اپنے رب پر چھوڑ دیا تھا۔ ہر لمحہ اس کا دل دعا گورہا۔

”اے شان والے اللہ تو غالب اور زبردست ہے۔ اے پروردگار ہم کمزور ہیں، گناہ گار ہیں۔ خطا کار ہیں۔ تو شان و رحمان والا کریم رب ہے۔ اے معبود ہمارے عقیدے کو، ہماری نیت کو، ہمارے ارادے کو درست رکھ، میرے اللہ کسی بھی آزمائش میں ڈال کر مجھے مت آزمانا کہ میں آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔ میرے یقین کو میرے بھروسے کو خود پہ اور بھی مضبوط کر میرے مالک جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں اور جو کچھ میں سمجھ رہی ہوں اس کو جھٹلا دے۔ مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں کہ برداشت کر سکوں۔ میرے اللہ تو ہی میری مدد فرما اور مجھے بکھرنے سے پہلے تھام لے۔ مجھے ٹوٹنے سے بچالے۔ میرے مالک، میرے معبود میری ہر لمحہ مدد فرما..... اور میری گڑہستی کو بچالے۔ صرف تو ہی میری نادانیوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ ہمیں ہمیشہ سیدھے راستے پر رکھ اور میرے شوہر کو میرے لیے وسیلہ راحت بنا اور مجھے اس کی اطاعت کرنے کی توفیق دے۔“

☆ ☆ ☆

فرزان کی سرگرمیاں جاری و ساری تھیں کہ اچانک شمع کا فون روحا کے موبائل پر آیا۔ روحا چونکہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کال کس کی ہو سکتی ہے، شمع کی آواز سن کر چونک گئی۔ شمع بہت دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ وہ روحا کا حال احوال لینے لگی پھر اس نے ماں کی بیماری کے بارے میں روحا کو بتایا۔ روحا کو شدید دکھ نے آن

گلیوں سے نکل کر لندن کی شفاف اور لمبی سڑکوں پر یوں برف میں گاڑی چلائے گی اور جب وہ گاڑی سے اترے گی تو ملازم اس کا دروازہ کھولے گا اور چھتری لے کر اس کے ساتھ ساتھ چلے گا۔ وہ جھنجلا کر ملازم سے کہے گی۔

”ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ مت رہا کرو۔ دم گھٹتا ہے میرا..... میں گل کر سانس لینا چاہتی ہوں۔“ ملازم اس کے سامنے گھلیا جائے گا اور چھتری بند کرے گا۔ وہ برستی ہوئی برف کی نرم پھوار میں خوشی سے جھومے گی پھر اپنے گلوں اور چشمہ اتار کر برف میں پھینک دے گی۔ اس کے کھلے ہوئے بال اور معصوم حسن کسی کی آنکھوں کو حیرت زدہ کر رہا ہے وہ اس سے نا بلند قدرت کے مناظر میں مگن ہے کہ اچانک وہ وجہہ شخص اس کے نزدیک آتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ وہ جو خوشی سے جھوم رہی تھی یک دم ساکت ہو جاتی ہے۔

اس کی آنکھوں میں پنہاں خوف و حیرت اور چہرے کی معصومیت کیمبرے کی آنکھ میں محفوظ ہو جاتی ہے۔

کٹ کی آواز کے ساتھ ہی پروڈیوسر کی ایکسیلینٹ کی آواز آتی ہے اور پھر اس آواز میں نئی آوازیں مل جاتی ہیں۔

”بہت ہی خوبصورت شارٹ تھا یہ..... بالکل نیچرل۔“ وہ رین کوٹ پر سے برف جھاڑتے ہوئے یونٹ کی طرف بڑھ جاتی ہے لیکن جہانزیب علی وہیں دم بخود سا کھڑا رہ جاتا ہے اس سے قبل اس نے بہت سی ہیر و سنز کے ساتھ کام کیا تھا لیکن جو گداز، جو معصومیت زیب میں دیکھی تھی وہ اس سے بیشتر کہیں نہیں دیکھی تھی۔

یوں تو اس فیلڈ میں یک دم دل ہار جانا معمولی فعل تھا لیکن زیب کی شخصیت معمولی نہیں تھی۔ وہ خود اس ڈرامے کا اوزر تھا۔ میڈم یا سمین شیرازی اور وہ اس ڈرامے کے ڈائریکٹر تھے۔

”بہت ہی چن کر ہیرا ڈھونڈا ہے آپ نے اس

گھیرا وہ ساکت سی رہ گئی۔“
”ماں، اس قدر بیمار ہے اور فرزان یہاں.....“
ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ شمع کہنے لگی۔

”میں مسلسل فرزان کا نمبر ٹرائی کر رہی ہوں لیکن اس سے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں ہوا اگر آپ کے پاس اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہو تو مجھے پلیز بتائیں، ہم غیور پھائی کو تو نہیں ڈھونڈ سکے لیکن فرزان سے تو میرا چند روز قبل تک رابطہ تھا پھر اچانک نہ جانے کیوں اس نے نمبر بند کر دیا۔“ روحا ششدر تھی، کیا بتاتی کہ فرزان تو یہاں زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ شمع کے فون کرنے کا مقصد فرزان کا ہی کانٹیکٹ نمبر لینا تھا..... نہ کہ اسے اطلاع کرنا، روحا سمجھ سکتی تھی۔ صرف اس مجبوری کے تحت انہوں نے ماں کی بیماری کے بارے میں اسے بتایا ہے ورنہ ارشاد بیگم اور ان کی بیٹیاں کسی طرح سے بھی اسے اچھا نہیں سمجھتی تھیں اگر وہ یہ بتا دیتی کہ فرزان یہیں رہ رہا ہے تو نہ جانے ان کے دل پر کیا قیامت ٹوٹتی سو وہ مصلحتاً کہنے لگی۔

”میرے پاس فرزان کا ایک اور کانٹیکٹ نمبر تو ہے لیکن پتا نہیں وہ اب اوکے بھی ہے یا نہیں۔ میں خود رابطہ کر کے دیکھتی ہوں اگر میرا فرزان سے رابطہ ہو گیا تو وہ ڈائریکٹ تم سے بات کر لے گا ورنہ میں تمہیں بتا دوں گی۔“

شمع نے فون بند کر دیا، روحا گم صدم سی بیٹھی رہی۔
”نہ جانے اس وقت فرزان کہاں ہوگا اور میں یہ اطلاع اسے کیسے پہنچاؤں گی۔“ پھر اس نے فرزان کو فون کیا تو فرزان آفس میں تھا۔

”فرزان، تمہارے لیے ایک بری اطلاع ہے۔ ابھی شمع کا فون آیا تھا میرے سیل فون پر، اس نے بتایا ہے کہ تمہاری ماما کو فالج کا شدید اٹیک ہوا ہے اور ان کی حالت نازک ہے۔“ یہ خبر فرزان کے اعصاب پر بجلی کی طرح گری تھی۔

☆☆☆

یہاں کی دنیا بہت ہی عجیب اور مختلف تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ گاؤں کی تنگ

انکار کر دیا تھا۔

”مگر کیوں فرزان.....؟“ روحا کے سوال پر وہ زچ سا ہو گیا تھا۔

”دیکھو روحا، سب سے پہلے تو میں یہ نہیں چاہتا کہ ماما یہ بات فوراً کھلے کہ ہم اکٹھے رہ رہے تھے۔ تم اچھی طرح سے سمجھ سکتی ہو ماما کو یہ بات ضرور تکلیف پہنچائے گی۔ ان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ انہیں مزید شاک دیا جائے اگر میری وجہ سے انہیں کچھ ہو گیا تو میں بہن بھائیوں میں کبھی بھی سیراٹھا کر نہیں جی سکوں گا تم سمجھ رہی ہو ناں روحا۔ میں تمہیں پھر لے جاؤں گا لیکن ابھی فوراً نہیں..... پتا نہیں تمہیں دیکھ کر وہ کیسا محسوس کریں..... ویسے بھی انہیں فاج کا اٹیک ہوا ہے۔ اس بیماری میں لوگ، زندہ ضرور رہتے ہیں لیکن لاش بن کر..... شمع بتا رہی تھی کہ ماما کا سارا چہرہ.....“ پھر فرزان نے الفاظ اندر ہی پی لیے۔ وہ سخت کبیدہ خاطر نظر آ رہا تھا۔

پھر روحا نے مصلحتاً استفسار نہ کیا۔

”میں حالات دیکھ کر تمہیں بلوائوں گا۔“ فرزان نے خدا حافظ کہا اور نکل گیا۔

☆☆☆

راستے بھر وہ شکر کرتا آیا تھا۔ خدا نخواستہ اگر روحا اس کے ساتھ چپک کر آ جاتی تو اس کی دو کوڑی کی عزت رہ جانا تھی۔ نہ جانے اسے وہاں جا کر کیسے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ مختلف اندیشوں اور خدشوں میں گھرا جب گھر پہنچا تو اس کی ساری بہنیں گھر میں ہی موجود تھیں۔ فرزان کو اتنے دن کے بعد گھر میں دیکھ کر اس سے لپٹ گئیں اور رونے لگیں۔

”ماما کو تم پہ بھروسہ بہت تھا فرزان۔ تمہارے یوں غائب ہو جانے پر ماما نے بہت دھچکا سہا ہے۔ دیکھو ماما کس حال میں پہنچ گئی ہیں۔“ شمع رورور کر کہہ رہی تھی۔ یکدم ظہور کہیں سے نکل کر آیا اور غصے میں کہنے لگا۔

”ماما کو اس حال تک پہنچانے والا دراصل یہی شخص ہے۔ آگیا یہ ہماری بے بسی کا تماشا دیکھنے، دیکھو ماما کا کیا حال ہوا ہے۔ دیوالیہ کر کے نکل گئے تھے تم

بار۔“ وہ دور بیٹھی زیب کو دیکھتے ہوئے میڈم شیرازی کے انتخاب کو سراہ رہا تھا۔ میڈم شیرازی نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی پیش دیکھی اور اس کی فطرت کو بھانپتے ہوئے کہنے لگیں۔

”دھیرج جہانزیب صاحب..... آپ کی آنکھیں، بہت کچھ کہہ رہی ہیں۔“ میڈم یا سمین شیرازی کا انداز ٹوکنے والا تھا۔

”میری آنکھیں جو کچھ کہہ رہی ہیں، صحیح کہہ رہی ہیں کیونکہ آنکھیں جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس لڑکی نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”شادی.....؟“ میڈم شیرازی کے ہاتھ میں کافی کاگ کپکپایا تھا۔

”ہاں شادی.....“

”مگر یہ لڑکی شادی شدہ ہے۔“ میڈم شیرازی نے یکدم انکشاف کیا تو جہانزیب علی اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

”شادی شدہ.....؟“ نہیں آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ اس سے دوبارہ پوچھیں۔ یہ جھوٹ بول رہی ہوگی۔“

”اسے بھلا کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ میں بتا رہی ہوں وہ سچ کہہ رہی ہے۔“ جہانزیب کی بے بسی اور بے چینی پورے وجود سے عیاں تھی۔

”آپ اپنے جذبات پر ذرا کنٹرول کریں جہانزیب صاحب۔ ویسے بھی آج کل آپ کے اسکیئنڈلز آسمان کو چھو رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتی آپ کی بے اختیاری یونٹ میں چہ گوئیوں کا سبب بنے۔ ویسے بھی ہم بہت عرصے کے بعد اکٹھے کام کر رہے ہیں۔ آپ کو اپنی نہیں تو میری ہی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔“ میڈم شیرازی، جہانزیب کے سامنے سے اٹھ کر چلی گئی۔ جہانزیب دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔

☆☆☆

اس نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ فرزان کے ہمراہ جانا چاہتی ہے لیکن فرزان نے لے جانے سے صاف

ہمیں..... سڑک پر بیٹھنے کی نوبت آ گئی تھی۔ نہ تم یہ کرتے نہ ماما، دادی اور زمین کا مکان پہنچنے کا سوچتیں۔ لالچ نے مروادیا انہیں اور یہ مصیبت گھر میں آ گئی کہ ماما اس حال پر پہنچ گئیں۔“ ظہور نے یکدم سارا کچا چٹھا کھول کر سامنے رکھ دیا تھا۔

اگر روحا ساتھ ہوتی تو ساری پول کھل جاتی کتنا اچھا کیا اس نے کہ روحا کو ساتھ نہیں لایا۔ کم از کم بھرم تو رہ گیا ناں۔ وہ ماں کے بستر کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ ماں کی حالت پر واقعی دلگرفتہ اور پڑ مردہ تھا۔ ارشاد بیگم نہ بول سکتی تھیں نہ آنکھوں کی حرکت سے اظہار کر سکتی تھیں۔ ان کا آدھا چہرہ ہٹھرا گیا تھا۔

”کیسے ہو گیا یہ سب کچھ.....؟“ وہ ماں کی بے بسی پر ٹپ اٹھا۔ اپنے کیے پر دل ہی دل میں پشیمان بھی تھا اور زرد رنج بھی..... جو کچھ اس نے کیا تھا اس میں ماما کا بھی تو ہاتھ تھا مگر وہ یہ بات کیسے سمجھاتا اس وقت تو سب کو ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے جو کچھ بھی ہوا ہے صرف اور صرف اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ خود اسے بھی یونہی لگ رہا تھا لیکن جب رات کو علیحدگی میں شمع نے سارا غصہ اس کے گوش گزار کیا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”زمین اورٹی وی پر.....“ فرزان کو یقین کرنا محال تھا۔ شمع نے اس کے سامنے کچھ رسالے میگزین ڈال دیے جس میں زمین کے ایڈٹھے.....

”ہاں۔ اب اسے اتنا بولنا آ گیا ہے کہ اس نے ہم سے تعلق ہی توڑ لیا ہے۔ وہ ہم سے ملنا نہیں چاہتی۔ آسمان پر پہنچالی ہیں اس نے اپنی آنکھیں.....“ شمع کو اس کی احسان فراموشی پر رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا۔

”مگر وہ ہے کہاں اس وقت.....؟“

”لندن میں.....“

فرزان کے سر پر ایک اور بم گرا۔

”سنا ہے کسی ڈرامے میں ہیروئن کا کردار ملا ہے

اسے۔“

”ہم سے زیادہ خوش قسمت تو زمین نکلی..... دنوں

میں ہی آسمان کو چھو لیا اس نے۔ دولت..... شہرت..... اسٹیٹس کسی بھی چیز کی کمی تو نہیں رہی اس کے پاس۔“

فرزان دل ہی دل میں اس کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔

”ہماری بلا سے..... وہ لندن میں رہے یا پاکستان میں اسے یہاں آنا پڑے گا۔ ہمارے گلے میں جو پھندا آ رہا ہے صرف اور صرف زمین کی گواہی ہی اسے کھول سکتی ہے.....“ ظہور تنٹنا کر بولا۔

”اور وہ یہاں نہیں آئے گی.....“ فرزان کے

دل کو یقین ہونے لگا۔

”کیونکہ اگر اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے یا

کروایا ہے تو کیا وہ خود آ کر کہے گی کہ میری ماں قاتل

نہیں، میں قاتل ہوں۔ یہ معاملہ کس طرح حل ہوگا۔“

فرزان بری طرح الجھ رہا تھا۔

☆☆☆

جب سے علی زمان نے بیری والے بابا کو قتل کیا

تھا، پورے گاؤں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ

تو شکر تھا کسی کو یہ بتا ہی نہ چلا کہ بابا کو قتل کس نے کیا ہے

ورنہ آسیہ اور بلقیس کا گاؤں میں جینا حرام ہو جاتا۔ علی

زمان، بابا کو مارنے کے بعد گاؤں سے بھاگ گیا تھا۔

وہ کہاں گیا تھا، یہ بھی کسی کو نہیں بتا تھا۔ بلقیس اس کی

زندگی کی رورو کر دعا کیں مانتی رہتی تھی۔

گاؤں میں ہر طرف بیری والے بابا کے قتل کے

قصے سننے میں آ رہے تھے۔

کوئی کہتا تھا ان کے موٹلوں نے انہیں مار دیا۔

کوئی کہتا تھا۔ پڑھائی کر کے بابا کا دماغ پھر گیا

تھا۔ بابا نے خود کو ختم کر لیا۔

کوئی کہتا تھا۔ جنوں نے بابا کو مارا ہے۔ کسی

دوسرے گاؤں میں کسی بہت بڑے پیر سے بابا کی لگتی

تھی۔ شاید ان لوگوں کی سازش ہو۔ غرض جتنے منہ تھے

اتنی ہی باتیں۔ بلقیس سانس دبائے گھر میں دبی بیٹھی

رہی۔

☆☆☆

”سردار ملک صاحب، آپ بات نہیں سمجھ رہے۔“

امریکن ایگنسی نے اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور پورے کیس کی کارروائی وہ اپنے قانون کے مطابق کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان مجرموں کو اپنی جیل میں لے جائیں۔“

”مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہمارا کسی دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا بیٹا عیاش ضرور تھا لیکن مجرم نہیں۔ عیاشیاں جب حد سے بڑھ جائیں تو جرم کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔“

”آپ کو شاید معلوم نہیں۔ آپ کے بیٹے کے ڈیرے سے تین چوری کی موٹر سائیکلیں برآمد ہوئی ہیں اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ قانون کڑی سے کڑی ملائے تو آپ کے بیٹے کے ہاتھ نہیں کھل سکتے۔ حالیہ دہشت گردی کے اسی فیصد واقعات موٹر سائیکل کی سواری سے منسلک ہیں۔ ان واقعات میں بیشتر چوری کی ہی موٹر سائیکلیں ہوتی ہیں پھر آپ نے کہا کہ آپ کا بیٹا اسلحہ رکھنے کا شوقین تھا۔ قانونی طور پر اسلحہ لائسنس کے ہمراہ رکھنے کی اجازت ہے۔ آپ کے بیٹے کے پاس سے بے شمار اسلحہ بغیر لائسنس کے ملا ہے۔ وہ کیا کرتا تھا اس اسلحے کا۔ ہے آپ کے پاس اس بات کا جواب..... کہاں سے آتا تھا اس کے پاس اتنا اسلحہ، مان بھی لیا کہ وہ دو نمبر طریقے سے اسلحہ فروخت کرنے میں ملوث تھا..... تو کیا یہ چھوٹا جرم ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں حکومت نے باقاعدہ اسلحہ ڈیلرز کو لائسنس جاری کیے ہوئے ہیں۔ بغیر لائسنس والے دکاندار سے تو اسلحہ لینا بھی جرم ہے جبکہ وہ خود یہ کام ان لیگل کر رہا تھا۔ حالیہ ملکی حالات ایسے نہیں ہیں سردار ملک صاحب کہ ان باتوں کو فراموش کیا جاسکے۔ میں مان بھی لوں اس بات کو کہ آپ کا بیٹا دہشت گردی کے جرم سے منسلک نہیں ہے لیکن قانون ہرگز ہرگز نہیں مانے گا..... یہ پاکستان ہے..... یہاں کچھ بھی کسی بھی طرح ہو سکتا ہے..... مجرم دھڑلے سے دندناتے بھی پھرتے ہیں اور جیلیں مجرموں سے بھر بھی جاتی ہیں۔ بنا کیے جرم مسلط بھی ہو جاتے ہیں اور مجرم جرم بھی کرتے پھرتے ہیں۔ کیس بہت پیچیدہ شکل اختیار کر گیا ہے۔ سردار صاحب، مجھے افسوس سے

کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ میری اپروچ سے باہر ہے۔ نہ جانے کیوں مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے بیٹے نے یہ جرم نہ کیا ہو۔ کوئی اور جرم کیا ہو۔ جس کی پاداش میں اسے اتنی سخت سزا کاٹنا پڑ رہی ہے۔“ ایس ایس پی کا فون بند ہو گیا اور سردار ملک اکبر تھرا کر رہ گیا۔

”نہیں..... میرا بیٹا..... میرا بیٹا دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ وہ تو شوقین مزاج تھا۔ اسے نت نیا اسلحہ رکھنے کا شوق تھا۔ ہاں وہ عیاش بھی تھا..... لیکن..... لیکن..... وہ دہشت گرد نہیں تھا۔“ سردار ملک اکبر پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا۔

☆☆☆

فرزان کو گئے ہوئے دوسرا ہفتہ ہونے والا تھا۔ روحا نے اس دوران روزانہ ہی ساس کا حال احوال لیا۔ فرزان کیا بتاتا کہ ماں کس حال میں ہے۔ اس سے خود ماں کی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ فالج کے ایک کے بعد انہیں مرگی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لیے انہیں پھر سے ایڈمٹ کروانا پڑا تھا۔ روز بروز ان کی حالت ابتری کا شکار ہو رہی تھی لیکن زندگی کی سائیس نہ جانے کتنی باقی تھیں۔ ساری ہی اولاد ان کی صحت اور زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی ارشادِ حکیم کا چہرہ اس قدر بد صورتی اختیار کر گیا تھا گویا عبرت کا نشان بن گئی ہوں۔

فرزان نے ماں کی تکلیف کو صدمائی طور پر ہی نہیں، عبرتناک طور پر بھی لیا تھا۔ کسی کے ساتھ برا کرنے کا انجام کس قدر برا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنا محاسبہ کرتا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ خود روحا اور اس کے باپ کے ساتھ کتنا بڑا فراڈ کھیل رہا تھا اگر وہ شا کے ہاتھوں پر نہ بھی ناچتا تب بھی روحا اسے سر پر بٹھا کر رکھتی۔ اس کا باپ اسے ہی سب کچھ سونپتا لیکن اب اس کی بددیانتی آڑے آ رہی تھی۔ اس کا دل چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ اس بددیانتی اور لالچ نے اسے اس سے بھی برا وقت دکھانا ہے۔

وہ تو ماما سے بھی برا کر رہا ہے اور برائی کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا..... گویا اس کا انجام ماما سے بھی بدتر ہوگا۔

UrduPhoto.com

خوش تھے۔ ہر ایک کے منہ پر ایک ہی سوال تھا۔ فیکے تو کہاں چلا گیا تھا، کون لوگ تھے وہ جنہوں نے تجھے اغوا کیا تھا۔

سادہ لوح فیکے کو کیا معلوم تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔ ہاں مگر پولیس نے بتایا تھا کہ وہ دہشت گردوں کا گینگ تھا جو لوگوں کو اغوا کر کے انہیں کسی نہ کسی طرح جرائم میں استعمال کرتے تھے اور قسمت سے قدرت نے اسے بچا لیا تھا۔ فیکا سب کو یہی بتا رہا تھا۔

یہ خوشی کی لہر ارشاد بیگم کے گھر تک پہنچی۔ ارشاد بیگم کے گلے سے پھانسی کا پھندا ضرور کھلا تھا لیکن وہ اپانج پن جوآن کا مقدر بن گیا تھا اب اس سے کوئی

اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا۔

ماما کی حالت دیکھ کر روز بروز اس کا یقین بڑھتا جا رہا تھا۔ دنیا مکافات عمل کا نام ہے۔ ماما پر کتنا کڑا وقت آیا تھا کہ اس وقت ان کے کچھ بھی کام نہیں آ رہا تھا۔ نہ تو ماما کے پیر اس وقت ان کے لیے کچھ کر سکتے تھے اور نہ ہی تعویذ گنڈے اور نہ ہی اس دولت میں شفا تھی جو ماما نے سود کے ذریعے اکھٹی کی تھی۔ خود اس کی کوششیں بھی رازگانی کی طرف جارہی تھیں۔

☆☆☆

فیکا نو ماہ کے بعد گھر آیا تو پورے گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پیر علی اور افروز گمشدہ فیکے کو پا کر بہت

قانون بھی نجات نہیں دلا سکتا تھا۔

☆☆☆

”یہ جو میڈم شیرازی ہیں ناں، نت نئے چہرے متعارف کرانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں یہ لڑکیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتی ہیں۔“

”ہاں، کاروبار۔ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں ذرا سنبھل کر رہیے گا۔ ڈرامے کی شوٹنگ کے دوران وہ کسی کنسرٹ کا معاہدہ کر چکی ہیں۔ کہنے کو تو یہ میوزیکل ٹالٹ شوہر ہوتے ہیں لیکن ان میں بڑے بڑے امرا کوئٹہ چننے آتے ہیں اور کوئٹہ ڈالروں میں بکتی ہیں۔“

”مگر مجھے تو میڈم نے کسی کنسرٹ کے بارے میں نہیں بتایا۔“

”وہ بتائیں گی بھی نہیں۔ ان کا طریقہ بھی یہی ہے۔ کہیں گی ہم میوزیکل شو میں جا رہے ہیں جو انڈیا اور پاکستان کے فنکاروں کے درمیان ہے اور پھر وہاں تمہیں لے جا کر کسی سے بھی سودا کر لیں گی۔“ زبین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ تو میڈم شیرازی پر اندھا اعتماد کر چکی تھی۔ اسی اندھے اعتماد کے بل بوتے پر تو وہ یہاں تک آئی تھی۔

”خود انہوں نے مجھے جہانزیب سے زیادہ بے تکلف ہونے سے منع کیا تھا جبکہ جہانزیب خود ان کے متعلق ایسی باتیں کر رہا ہے۔ یا اللہ ان میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط.....“

”مگر میڈم کی تو رپورٹ ابھی باقی ہے، وہ کیسے مجھے کہیں اور.....“ جہانزیب نے اس بات پر زور دار قہقہہ لگایا اور اپنا سگریٹ بجھاتے ہوئے بولا۔

”اس خرید و فروخت کا مطلب صرف چند گھنٹے ہوتا ہے وہ تم سے زیادہ سے زیادہ پرافٹ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔“



(آخری قسط اگلے ماہ انشاء اللہ)



ناولٹ

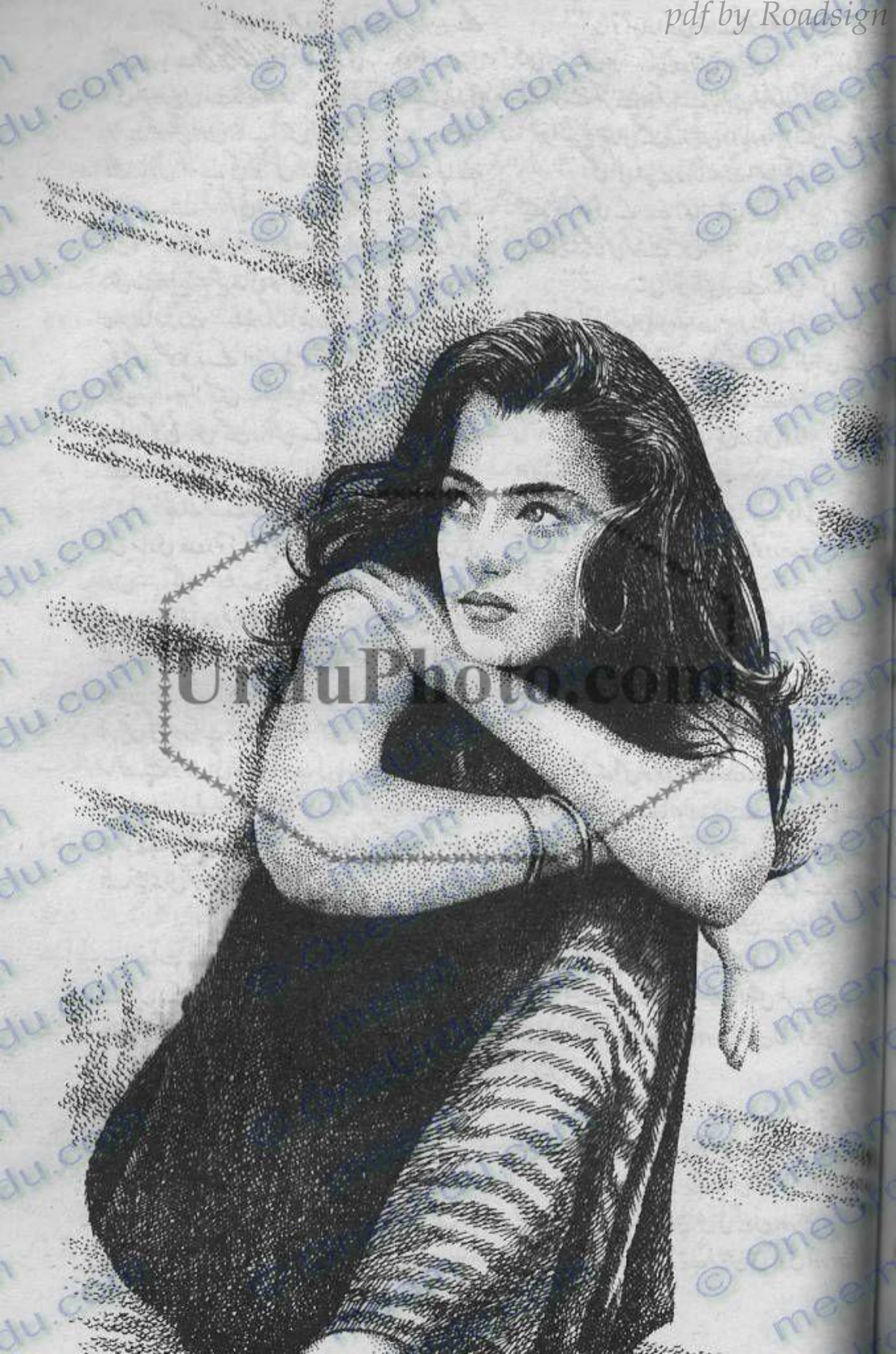
کچی گاگرٹوٹ گئی

میمونہ خورشید علی

آخری قسط

اسے سنائی تھیں جواب بھی فیلڈ سے وابستہ تو تھیں لیکن
پردہ بریاد ہو چکی تھیں..... اور وہ..... وہ تو پہلے ہی
ہو چکی تھی..... اب کس بربادی کی طرف میڈم شیر
اسے لے جانا چاہتی تھیں۔

جہانزیب کی باتوں نے زیب کو بے حد ڈپریشن
کر دیا تھا۔ اتنا ڈپریشن کہ وہ سوچ سوچ کر نہ صرف
ہراساں تھی بلکہ یاسمین شیرازی سے بدگمان بھی ہو رہی
تھی۔ اس جیسی بیبیوں لڑکیوں کی مثالیں جہانزیب نے



”آج تو تمہارا کوئی شوٹ نہیں تھا، صبح سے کمرے میں بستر میں ہو..... کیا بور نہیں ہوئیں تم.....؟“ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے استہزائیہ پوچھ رہی تھیں۔ زمین دوبارہ بستر میں لیٹ گئی۔

”بھئی بھئی ایسے رہنا بہت اچھا لگتا ہے.....“ وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بولی تو میڈم شیرازی چونک گئیں پھر ہنس کر کہنے لگیں۔

”خیر..... میں تو اس لیے آئی تھی کہ ہم لوگ..... تقریباً سارا ہی یونٹ میوزیکل نائٹ شو میں جا رہا ہے۔ اگر تم بھی چلو تو بہت مزہ آئے گا۔“ زمین کے دل کو یکدم کچھ ہوا مگر اس نے خود کو سنبھال لے رکھا۔

”نہیں، آپ لوگ جائیں۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”دیکھ لو، تمہاری مرضی ہے۔ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔“ وہ پھر سے اپنی لپ اسٹک کو درست کرنے میں لگن تھیں۔

زمین کے اندر باہر بھونچال آگیا اور تلخی اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔

”کیسے مواقع.....؟“ یہ تلخی بچے میں بھی عود آئی تھی۔

”ارے بھئی لوگوں سے ملنے کے مواقع.....! پاک ہند کے بڑے بڑے نام اور چہرے دیکھنے کو ملیں گے۔ ایسی محفلوں میں جانے سے کانفرنس آتا ہے، کام کر کے کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ نئے نئے لوگوں سے دوستیاں ہوتی ہیں، راہیں کھلتی ہیں..... اور کون سے مواقع.....“ وہ ٹشو پیپر رکھ کر اس کی طرف مڑ چکی تھیں۔

”نئے نئے لوگ..... میں اچھی طرح سے جانتی ہوں وہ نئے لوگ کون سے ہوتے ہیں۔“ زمین دل کی دلی میں سوچنے لگی۔

”میں نے کہا ناں..... میں نے نہیں جانا تو اس نہیں جانا۔“ وہ یکدم تلخ ہوئی تو میڈم شیرازی ٹھٹک گئیں۔

”خیریت ہے زیب، طبیعت تو ٹھیک تمہاری..... تم اس قدر چڑچڑی سی کیوں ہو رہی ہو..... خود پر میڈم کی توجہ پا کر زیب نزوس سی ہو گئی اور معذرت

”میں نے غلط ہی بھروسہ کیا میڈم پر..... مجھے انہیں ہر بات صحیح صحیح نہیں بتانا چاہیے تھی..... وہ ضرور میری انہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائیں گی..... میں ایک بار اپنی عزت کھو چکی ہوں۔ اب انہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ضرور مجھے پامال کرنے کی کوشش کریں گی..... ٹھیک کہا ہے جہانزیب نے..... کوئی ایسے ہی کسی پر مہربانیاں نہیں کرتا۔ میں کام کر رہی ہوں تو اس کا معاوضہ اور شہرت مجھے ہی مل رہی ہے، میڈم شیرازی کو بھی تو کچھ چاہیے اور وہ یہی دوسرا راستہ ہے..... انڈر گراؤنڈ راستہ..... جو میری شہرت کو بھی محفوظ رکھے اور میڈم بھی مالا مال ہو جائیں۔ نہیں..... ہرگز نہیں.....“ جہانزیب کی باتیں اس کے ارد گرد گونج رہی تھیں۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

”خدا نہ کرے کہ میرے ساتھ اب کچھ غلط ہو..... میں ساری حدود توڑ کر اپنی عزت پامال کرنے نہیں نکلی ہوں..... بلکہ..... عزت کی زندگی جینا چاہتی ہوں..... یا خداوند میری مدد فرماتا.....“ اس نے اضطراری کیفیت میں دعا کی اور بستر میں لیٹ گئی۔ نیند تو کیا آئی تھی، دھیان میڈم شیرازی کی طرف ہی لگا ہوا تھا کہ وہ کب آئیں گی اور کب ساتھ چلنے کا کہیں گی..... اگر وہ واقعی ساتھ چلنے کو کہیں گی تو جہانزیب کی بات صحیح ہوگی..... اور اگر انہوں نے ساتھ چلنے کو نہ کہا تو جہانزیب..... جہانزیب خود غلط ہے..... بس اس کا ذہن صحیح غلط کی یہیں تک نشاندہی کر سکا تھا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب میڈم شیرازی نے اس کے دروازے پر دستک دی..... وہ اٹھنا نہیں چاہتی تھی مگر کسلمندی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

”ہائیں..... یہ کیا تم ابھی سے سو رہی تھیں.....؟“ وہ تیار تھیں اور ان کی تیاری سے لگ رہا تھا کہیں جانے کے موڈ میں ہیں۔

”بس طبیعت صحیح نہیں تھی اس لیے لیٹ گئی تھی۔ ویسے بھی سردی بہت ہے..... بستر میں رہنا اچھا لگ رہا تھا۔“ وہ نظریں چرا کر بولی تو میڈم شیرازی ہنس دیں۔

وہ زبردستی بھی تمہیں لے جانہ سکیں..... سوائے اس حل کے اور تم کسی طرح سے بھی نہیں بچ سکتیں۔“

”کتنا عجیب مشورہ دیا تھا جہانزیب نے..... واقعی میم شیرازی تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں اگر میں بستر میں نہ ہوتی تو شاید وہ میری کسی بات کا یقین بھی نہ کرتیں.....“ اس نے بے چینی سے سوچا اور ٹی وی آن کر لیا۔ اب تو راتوں کو جاگنے اور دن کو سونے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ زبردستی لیٹ جانے سے بھی رات کے پہلے حصے میں نیند نہیں آتی تھی۔ وہ چینلز سرچ کر رہی تھی تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

”اب کون ہو سکتا ہے۔ سب لوگ تو چلے گئے تھے۔“ وہ بستر سے اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے جہانزیب کھڑا تھا اگر وہ خالی ہاتھ ہوتا تو شاید اس کا بے وقت آنا اسے عجیب لگتا۔ اس کے ہاتھ میں گفٹ پیک تھا۔

”یہیں کھڑا رکھیں گی، اندر آنے کو نہیں کہیں گی.....؟“ زیب ڈبل ماسنڈ ہوئی پھر خود پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اندر بلا لیا۔

”میں ڈنر کر کے آرہا تھا، راستے میں آپ کے لیے ایک خاص تحفہ پسند آ گیا وہ خرید لیا۔ دیکھیں آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں۔“ زیب تحفہ لیتے ہوئے ہچکچائی پھر جہانزیب سے لے کر ٹیبل پر رکھ لیا۔

”میرا خیال ہے آپ آرام کر رہی تھیں، میں چلتا ہوں۔“

”ارے نہیں، میں تو ایسے ہی لیٹی تھیں..... نہ نیند آرہی تھی نہ ٹی وی میں دل لگ رہا تھا۔“ زیب نے ایسے ہی کہا تو جہانزیب مسکرا کر بولا۔

”چلیں..... پھر سمجھیں مجھے دل لگانے کے لیے قدرت نے آپ کے پاس بھیج دیا ہے۔“

”آپ گئے نہیں۔ باقی سب لوگ تو چلے گئے۔“

”کہاں.....؟“ جہانزیب جان بوجھ کر انجان بنا۔

”وہی میوزیکل شو میں.....؟“ زیب نے یاد کرانا اپنا فرض سمجھا۔

”مجھے ایسے شوز زیادہ اپیل نہیں کرتے۔“

”سوری میم..... میں نے کہا ناں..... میری طبیعت صحیح نہیں ہے جس کی وجہ سے میرا کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہ رہا اور ویسے بھی اچھا ہوا۔ آج میرا کوئی شوٹ نہیں تھا ورنہ مجھے واقعی پریشانی ہو جاتی۔ میں آرام کر کے خود کو بہتر محسوس کر رہی ہوں.....“ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔ نہ جانے کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ مگر میڈم شیرازی کو تو یہی لگا کہ وہ ان سے کچھ چھپا رہی ہے۔

”عموماً سب کے ساتھ جانا تب کوئی پسند نہیں کرتا جب کسی خاص شخص کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہو۔ ہو سکتا ہے زیب کی کسی سے اپائنٹمنٹ ہو..... مگر اس طرح انجان لوگوں میں زیب کس کے لیے خاص ہو سکتی ہے..... میں نے تو نہیں دیکھا کسی سے اسے گھلے ملتے ہوئے.....“

پھر بھی شاید..... ذرا پوچھ کر تو دیکھوں.....“

”کسی کے ساتھ ڈیٹ تو نہیں رکھی ہوئی۔“ ان کا لہجہ دوستانہ ہی نہیں شرارتی بھی تھا۔ اب تو زیب کو پکا یقین ہو گیا، یہ جو اتنی تحقیق ہو رہی ہے ضرور دال میں کچھ کالا ہی..... ورنہ میرے جیسی معمولی لڑکی کے جانے یا نہ جانے سے انہیں کیوں فرق پڑتا۔ وہ ان سوالوں سے سخت جھنجھلا گئی تھی۔

”میں نے کہا ناں..... کوئی بھی وجہ نہیں ہے..... میں نے نہیں جانا تو بس نہیں جانا۔“ وہ یکدم اتنی روڈ ہوئی کہ میڈم شیرازی مصلحتاً خاموش ہو گئیں۔

”اپنی دے، میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ باقی لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے، میں جا رہی ہوں۔ لگتا ہے تمہاری طبیعت واقعی خراب ہے..... بہتر ہوگا کہ تم سو جاؤ..... ہماری واپسی تو شاید صبح تک ہی ہو۔“ میڈم شیرازی کے نکلنے کے بعد زیب نے گہری پرسکون سانس لی۔

”تو اب آپ ہی بتائیں مجھے..... میں کیسے ان کے اس ظلم سے بچ سکتی ہوں.....“ وہ ہراساں ہو کر جہانزیب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم نہ جانے کا بہانہ کر لینا۔ کوئی بھی ٹھوس بہانہ کہ

جہانزیب نے صوفے سے پشت ٹکا کر ٹانگیں پسار لی تھیں۔
 ”ہم لوگ پاکستان میں آئے دن یہ سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں۔ ہمارے لیے شاید اس لیے اتنی اٹرکیشن نہیں ہے.....“

”ہاں، یہاں کے پاکستانی ایسے اینٹس کے لیے مرے جاتے ہیں شاید وطن یا ہم وطنوں سے محبت۔ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے اپنی ہی بات کو خود ہی کلوز کر دیا تھا۔

”اگر آپ کا موڈ تھا تو آپ چلی جاتیں۔“ وہ یہ کہہ کر موبائل میں جان بوجھ کر مگن ہو گیا تھا۔ جیسے اس موضوع پر ان کے درمیان کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ زیب نظریں چرا گئی۔

”کافی منگوائی ہے میں نے۔ آپ تو بے حد بد لحاظ واقع ہوئی ہیں..... کبھی پانی کا بھی نہیں پوچھتیں۔“ زیب کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

”اصل میں، میں خود چائے کافی نہیں پیتی، اس لیے۔“

”دوسروں سے صلح لینا بھی گوارا نہیں کرتیں.....!“ وہ گویا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ زیب آہستہ سے ہنس کر چپ ہو گئی۔

”ویسے مس زیب، میں نے آج تک آپ کا کوئی انٹرویو نہیں پڑھا..... آئی مین آپ کا بیک گراؤنڈ کیا تھا۔ آپ کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں، شوقیہ آئی ہیں اس فیلڈ میں یا حادثاتی طور پر کبھی بتایا نہیں آپ نے..... میں جاننا چاہتا ہوں۔ آپ اتنا چپ چپ سی کیوں رہتی ہیں، کھوئی کھوئی سی۔ میں نے آج تک اس فیلڈ میں آپ جیسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی جس کی آنکھیں بولتی ہوں اور زبان خاموش ہو۔“ زیب خجالت سے ہنس دی۔

”آپ نے اتنے سارے سوال یکدم ہی پوچھ ڈالے جبکہ آپ کے پہلے ہی سوال میں میرا جواب ہے۔ میں اس فیلڈ میں اچانک آئی اور مصروف ہوتی چلی گئی۔ اس لیے نہ مجھے انٹرویو دینے کا موقع ملا اور نہ ہی میرے اسکیڈلز ہی بنے..... اسی لیے ابھی تک میں وہیں کی وہیں ہی ہوں جیسی میں تھی.....“

”گڈ.....!“ جہانزیب انہماک سے نظر آنے لگا۔ اتنے میں کافی آگئی۔

”لیجیے، میں نے تو دو کپ کافی منگوالی..... اب لگتا ہے مگ مجھے ہی خالی کرنا پڑیں گے۔“

”نہیں..... ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میں آپ کا ساتھ دے سکتی ہوں۔“ زیب نے آگے بڑھ کر کافی کا ایک مگ اٹھالیا۔

”چلیں، آج آپ کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع مل ہی گیا ہے تو یہ بتائیں آپ کے پیرنٹس کیا کرتے ہیں اور آپ کتنے کتنے بہن بھائی ہیں؟“

میڈم شیرازی نے کہا تھا۔ ”آج کے بعد اپنے نجی معاملات کسی سے شیرمت کرنا۔ سمجھ لینا یا سیمین شیرازی آخری عورت تھی جس سے تم نے سب کچھ کہا اور بس۔“ اس نے خاموشی سے کڑوئی کافی کا گھونٹ بھرا اور پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

”میرا خیال ہے جہانزیب صاحب اس موضوع پر نہ ہی گفتگو کریں تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ میں اپنے نجی معاملات کسی سے بھی ڈسکس نہیں کرتی۔“ جہانزیب کو اس کے جواب سے تسلی نہ ہوئی اور مزید بے چینی نے آن گھیرا۔

”میرا مقصد آپ کے نجی معاملات کو ڈسکس کرنا نہیں ہے زیب، میں تو صرف آپ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اگر آپ کو اچھا نہیں لگتا تو چھوڑیں اس قصے کو۔ ہمارے مابین بات چیت کسی اور موضوع پر بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ موضوع بدل رہا تھا لیکن دل بے چین تھا۔ نگاہیں زیب کے چہرے پر گڑی تھیں جو ہنوز پراسرار چہرہ لیے آہستہ آہستہ کافی پی رہی تھی۔

تھوڑی دیر ان کے درمیان خاموشی رہی پھر موسم پر ہلکی پھلکی سی گفتگو ہوئی..... یہ گفتگو یکطرفہ ہی تھی..... زیب کو خاموش پا کر جہانزیب سے رہانہ گیا اور پھر اسی موضوع پر آ گیا۔

”میں تو صرف آپ کے متعلق جاننا چاہتا تھا کیونکہ پونٹ میں، میں نے آپ کے متعلق کچھ عجیب طرح کی چہ گوئیاں سنی ہیں۔“ یہ واحد ایسی بات تھی جس نے زیب

دے گا اور وہ پے در پے گناہ کرتی چلی جائے گی۔ اس کے دل کی کھولن اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔
”ریلیکس مس زیب..... ریلیکس، ہمارے لیے یہ

سب معمولی باتیں ہیں۔ نہ جانے آپ کیوں ڈپریشن ہو رہی ہیں۔ کافی ختم کریں اپنی، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

اس وقت اسے نجات سے بچانے کے لیے واحد یہی حل تھا کہ اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرائی جائے، اس کے ساتھ ہی جہانزیب بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا اور ولیم تیز کر کے سوئچ سننے لگا۔ کافی ٹھنڈی ہو کر اور بھی بد مزہ اور کڑوی ہو گئی تھی پھر بھی نہ جانے اس نے کیسے پی لی۔ بہر حال ان تین چار گھونٹ میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا گویا کڑوی کافی کے گھونٹ نہیں پیے تھے۔ زندگی کے کڑوے سچ کو حلق سے اتارا تھا۔

”ایسی باتیں زیادہ دیر نہیں چھپتیں مس زیب..... جس فیلڈ میں آپ قدم رکھ چکی ہیں۔ وہاں رفیق کم اور رقیب زیادہ ملیں گے۔“ جہانزیب بھانپ چکا تھا کہ یہ زمین کا ویک پوائنٹ ہے، بھی تو گھوم گھوم کر یہیں آ رہا تھا۔ زمین چاہتی تو اسے کمرے سے چلے جانے کا کہہ سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کا دماغ شل سا ہونے لگا تھا۔ خود اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے البتہ جو کچھ جہانزیب کہہ رہا تھا وہ ہر بات کو اسی تناظر میں دیکھ رہی تھی۔

”اور کیا کیا بتایا تھا میم نے میرے متعلق آپ کو.....؟“

”بہت کچھ، چھوڑیں آپ ایسے ہی ڈپریشن ہو جائیں گی۔ ویسے بھی مجھے لگ رہا ہے آپ صرف اسی بات سے ڈپریشن ہو گئی ہیں۔“ وہ ریموٹ ٹیبل پر پھینک کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا زمین کے قریب آ گیا تھا۔ اس وقت زمین کو لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے وجود کو مصلوب کر لیا ہے۔ وہ خود کو بہت تنہا اور زودرنج محسوس کر رہی تھی..... اسے میڈم شیرازی سے یہ امید نہیں تھی لیکن یہاں کیسے کیسے لوگ ہیں..... وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہونے لگے تھے۔ جہانزیب اس کے نزدیک آ گیا اور اس کی دل جوئی

کے چہرے کے رنگ پھیکے کر دیے تھے۔
”کیسی باتیں.....؟“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھنے پر مجبور تھی۔

”ارے..... آپ تو واقعی پریشان ہو گئیں۔ بس کچھ خاص نہیں..... یونہی میں نے کسی سے آپ کے متعلق سنا تھا۔“

”کیا سنا تھا.....؟“ زمین بے چین ہو گئی۔ اب اس کے چہرے کا رنگ زرد ہونے لگا تھا۔

جہانزیب نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی تھی۔

”کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔ کیا مطلب ہے آپ کی اس خاموشی کا؟“ وہ یکدم بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ سوائے یا مین شیرازی کے اس نے تو کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا پھر یونٹ میں چہ گویاں کون کر رہا تھا۔

”ریلیکس مس زیب، ریلیکس..... کچھ خاص نہیں۔ بس یہی کہ آپ شادی شدہ ہیں۔“

زمین کو یکدم دھچکا لگا۔ ”یہاں تک بتایا ہے تو کچھ اور بھی بتایا ہوگا۔“ وہ دل ہی دل میں پریشان ہونے لگی۔

”کس نے بتایا آپ کو.....؟“ وہ جہانزیب سے سوال ضرور کر رہی تھی لیکن اس کا چہرہ اور آنکھیں اس سوال کی سچائی کی تفسیر بنی ہوئی تھیں۔ جہانزیب کو اسے یوں پھنسانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”ظاہر ہے اسی شخص سے پتا چلے گا جو آپ کے قریب ہے یا یوں کہہ لیں جن کے آپ زیادہ قریب ہیں۔ بظاہر تو یونٹ میں آپ کسی سے کام کے علاوہ بات بھی نہیں کرتیں.....“ وہ یہ کہہ کر سگریٹ سلگانے لگا تھا۔

”تو گویا میم شیرازی نے بتایا ہے آپ کو یہ سب کچھ.....؟“ وہ یکدم یا مین شیرازی سے بدظن نظر آنے لگی۔ وہ تو کہتی تھیں کہ اس کا راز اپنے تک ہی رہیں گی۔

اسے کیا پتا تھا کہ اسے ہن بدنام کر رہی ہیں وہ۔ اصل میں تو بیوقوف وہی ہے جو سب کو سچائی بتاتی چلی آ رہی ہے۔ صرف اس لیے کہ اس ہادے میں اس کا استحصال ہوا تھا۔ وہ بے گناہ تھی، خود کو آج تک مظلوم سمجھتی آئی تھی مگر کیا معلوم تھا کہ زمانہ کچھ دے دے کر اسے خود ظالم بنا

کامیابی پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

ابھی ابھی ملازم نے آکر کہا تھا کہ اس سے ملنے کوئی خاتون آئی ہیں۔

”کون..... خاتون..... نام پوچھا ہے ان کا؟“
روحاجو آرام کر رہی تھی تساہل سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”نام تو نہیں بتایا جی انہوں نے اپنا۔ آپ کہیں تو میں پوچھ آتا ہوں؟“

”نہیں رہنے دو“ میں آرہی ہوں۔“ وہ بستر سے اتر گئی پھر ملازم سے کہنے لگی۔

”خانساماں سے کہو، ڈیڈی کا کھانا جلد تیار کر لے..... وہ داؤد انکل کی طرف گئے ہیں، آنے ہی والے ہوں گے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میں کچن میں نہ آ سکوں۔“

”ٹھیک ہے بی بی جی۔“ ملازم پیغام لے کر چلا گیا۔

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔ ایک بے حد باڈرن سی لڑکی صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے براجمان تھی، اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور پرجوش انداز میں اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

”ہائے، میرا نام شنا ہے۔“

”شنا.....“ روحا کے قریب گویا دھماکا سا ہوا۔ اس دھماکے کا شور اتنا تھا کہ روحا، شنا کا ہاتھ چھوڑنا ہی بھول گئی۔

”غالباً آپ مسز فرزان ہیں.....“ شنا کے ہونٹوں

سے فرزان کا نام سن کر کرنٹ سا لگا اور اس نے یکدم شنا کا

ہاتھ چھوڑ دیا۔ شنا نے اس ساری کیفیت کو دلچسپی سے

انجوائے کیا تھا۔

”آپ یہاں کیا کرنے آئی ہیں.....؟“ روحا کا

لہجہ خشک اور انجیبی تھا۔

”آپ کے سوال سے لگتا ہے آپ میرے بارے

میں جانتی ہیں۔“ اس کی ڈھٹائی پر روحا کو غصہ آنا فطری

عمل تھا۔

”اس لیے کہ ایسے رشتے زیادہ دیر چھپ نہیں

کرنے لگا۔

”بے فکر رہو زیب، ان معمولی باتوں سے تمہارے کیریئر پر کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا ہاں البتہ اگر تم نے خود کو مضبوط نہ رکھا تو لوگ تمہیں کک مار کر نکال دیں گے۔“

”تو نکال دیں.....!“ وہ پھٹ پڑی۔ ”میرے

نکل جانے سے کون سا ان چکا چوند روشنیوں میں کمی

ہو جائے گی۔ نکال ہی دیں مجھے تو بہتر ہے۔ میرے لیے

وہی اندھیرا اچھا تھا جہاں سے میں آئی تھی۔ میں ان

روشنیوں سے دور بھاگنا چاہتی ہوں مگر میں جتنا روشنیوں

سے دور بھاگنا چاہتی ہوں یہ مجھے اتنا ہی نزدیک لے

جاتی ہیں۔“ زمین چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ

کر رو پڑی۔ جہاں زیب گھاک شکاری تھا۔ دلجوئی کرنے

اس کے اور نزدیک آ گیا۔

”اصل میں..... میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں مس

زیب، آپ کے دوست نہیں ہیں اور جب انسان کے

دوست نہیں ہوتے ناں..... تو انسان یونہی تنہا محسوس کرتا

ہے۔ جس طرح آپ اس وقت خود کو تنہا محسوس کر رہی ہیں

نہ صرف تنہا بلکہ کمزور بھی..... کون ایسا شخص ہے دنیا میں

جس کی ذات سے..... حادثات و واقعات وابستہ نہ

ہوں۔ آپ ایسا کیوں محسوس کرتی ہیں کہ جو کچھ آپ کے

ساتھ ہوا۔ وہ عجیب تھا، انوکھا تھا، نہ جانے یہاں کیسے کیسے

لوگ پڑے ہیں اور کیسے کیسے راز دہن ہیں مگر کوئی اپنا چہرہ

دیکھ کر یوں پل بھر میں ٹوٹ نہیں جاتا جس طرح آپ نے

کیا.....“ زمین کو جہاں زیب کی باتوں سے ڈھارس سی ملی۔

”ابھی آپ نئی نئی آئی ہیں ناں اس فیلڈ میں اس

لیے آپ کو لگ رہا ہوگا کہ یہ سب چیزیں آپ کے کیریئر کو

متاثر کریں گی مگر میں آپ کو یقین دلاؤں، ایسا کچھ نہیں

ہوگا۔ بس آپ ڈرنا چھوڑ دیں۔ ایک دم بہادر بن

جائیں..... سن رہی ہیں ناں آپ زیب۔“ زیب کو لگ رہا

تھا جیسے کوئی اسے میٹھی میٹھی لوری دے رہا ہے۔ ابھی کچھ

دیر پہلے تو وہ رو رہی تھی اور اب اس کا ذہن اتنا ریلیکس اور

لکا پھلکا ہو گیا تھا کہ اسے آنکھوں میں نیند کا نشہ سا اترتا

محسوس ہونے لگا ابھی اس نے جہاں زیب کے کاندھے پر

رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔ جہاں زیب اپنے پلان کی

سکتے۔“ روحا نے طنز و نفرت سے ثنا کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا، کیسے رشتے.....؟“ ثنا کا اعتماد فوج پکڑ ہو گیا۔

”یہی دو نمبر رشتے۔“ روحا نے اعتماد سے کہا۔ ثنا کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن روحا نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ تمہارا جس سے تعلق ہے، اسی تک تعلق رکھو اور میرے گھر سے ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ۔“

”عجیب اور بہت ہی عجیب عورت ہو تم..... میرا تو خیال تھا تم یوں کہو گی کہ میرے شوہر کی زندگی سے نکل جاؤ.....“ یہ کہہ کر ثنا ہنس دی۔ ”محض گھر سے نکل جانے کی بات ہے تو وہ تو میں چلی جاؤں گی۔ میں تو تمہیں صرف اتنا بتانے آئی تھی جس تعلق کو تم دو نمبر تعلق کہہ رہی ہو۔ وہ ایک قانونی اور مذہبی رشتہ استوار کر گیا ہے۔ فرزان نے نہ صرف مجھ سے شادی کر رکھی ہے بلکہ میں اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی ہوں.....“ روحا کے دماغ میں جیسے کسی نے ہتھوڑا سا مارا تھا۔

”یہ بات تمہیں یقیناً بہت نرالی اور عجیب لگی ہوگی..... تم نے فرزان کے بارے میں یہ افواہ اڑا رکھی تھی ناں کہ وہ مرد نہیں ہے۔ جانتی ہو، ایک مرد اپنے متعلق ایسی بات سن کر کتنا بدظن اور بددل ہو جاتا ہے عورت سے..... تمہاری تو قسمت اچھی ہے کہ اس نے تم سے انتقام نہیں لیا اور تمہیں معاف کر دیا..... شاید اس کے صبر و برداشت کا ہی نتیجہ تھا کہ اسے تم سے نہیں مجھ سے اولاد مل رہی ہے۔ ذرا سوچو، کتنا خوش ہو گا فرزان یہ خوشی پا کر.....“

پھر تمہاری کیا حیثیت رہ جائے گی، یاں کے درجے پر تو میں فائز ہونے جا رہی ہوں۔ فرزان تمہیں کس درجے پر رکھے گا۔ میں تو تمہیں اس خوشخبری کے ساتھ ساتھ اس فکر میں بھی مبتلا کرنے آئی تھی کہ تمہاری یہ دولت بھی فرزان کے کام نہیں آسکی..... چلتی ہوں۔“ ثنا گھر سے نکل گئی۔

روحا چکراتے وجود کو سنبھالتے ہوئے سر تھام کر وہیں بیٹھ گئی، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن اسے ایسی سچائی کا بھی سامنا کرنا پڑے گا اور جب یہ وقت آئے

گاتب وہ کیا کرے گی۔

شنا اور فرزان کی دوستی کو سوائے بے راہ روی کے اور کیا رنگ دے سکتی تھی لیکن..... فرزان نے اس سے شادی کر رکھی ہوگی اس نے سنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ثنا سے شادی کے بعد فرزان اس کے پاس کیا کرنے آیا تھا۔

”کیوں آیا ہے فرزان میرے پاس.....؟“ غصے سے اس کے اندر بھونچال آ رہا تھا۔ شاید فرزان سامنے ہوتا تو وہ اس کا گریبان پکڑ کر ضرور اس سے یہ سوال کرتی..... اسے جھنجھوڑ ڈالتی، اس سے لڑتی..... لیکن اب وہ سامنے نہیں تھا تو اس کے اندر لاوا پھٹ رہا تھا۔ بے بسی میں سوائے آنسو بہانے کے انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ اس وقت اسے بھی خود پر رونا آ رہا تھا۔

..... وہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی اسے آنسو بہاتے ہوئے..... تبھی باہر گاڑی کی آواز آئی تو وہ سٹپٹا گئی۔ ”ڈیڈی نے مجھے روتے دیکھا تو..... وہ ضرور پوچھیں گے کہ میں کیوں رو رہی ہوں اور تب میں کیا بتاؤں گی۔“ وہ دوڑتی ہوئی اوپر چلی گئی اور کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تم از کم یہ تو اطمینان تھا کہ ڈیڈی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر نہیں آئیں گے۔

”مگر یہ بات..... یہ بات میں کیسے اور کب تک چھپا سکتی ہوں اور جب ڈیڈی کو پتا چلے گا..... تب ان کی کیا حالت ہوگی۔ اوہ میرے خدا..... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی فرزان میرے ساتھ اتنا بیڑا دھوکا کرے گا..... ثنا کہہ رہی تھی کہ وہ فرزان کے بچے کی ماں بننے والی ہے..... یہ خوشخبری پا کر فرزان خوشی سے جھوم اٹھے گا..... یہ خوشخبری تو میرے پاس بھی ہے تب فرزان کیا کرے گا۔ خوش ہو گا یا..... میں نے کیوں چھپا کر رکھا اس خبر کو..... ہاں آخر کس وقت کا انتظار تھا مجھے..... جب ثنا بتا دے گی۔ تب بتاؤں گی میں اسے یہ بات..... تب وہ کیا فیصلہ کرے گا۔ فیصلہ تو مجھے کرنا ہے..... فرزان نے نہیں..... میں اس روگ کو نہ تو چھپاؤں گی اور نہ گلے سے لگا کر رکھوں گی..... میں فرزان کو اپنی زندگی سے، اپنی جائداد سے بے دخل کر دوں گی۔ ہاں میں نے سوچ لیا ہے۔ میں بچے کی خاطر کوئی سمجھوتا نہیں کروں گی۔ میں ابھی اور اسی

وقت فرزان سے بات کروں گی، اسے میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔“ تبھی اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملانے لگی۔

فرزان کی آواز سن کر اس کے اندر زہر سا گھل گیا۔ وہ تو سمجھتی تھی صرف اس کی ماں غلط ہے وہی فرزان کے ساتھ اسے ہنستا بستا نہیں دیکھ سکتی..... اکثر فرزان اسے مجبور اور بے بس دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اسے کیا پتا تھا فرزان خود کتنا بڑا فریبی ہے اگر وہ خود اس کے لیے مخلص ہوتا تو حالات یہاں تک پہنچتے ہی کیوں۔

”ہیلو فرزان.....“ وہ بھری بیٹھی تھی لیکن فرزان نہایت زور درنج اور پریشان تھا، فرزان نے جو خبر سنائی تو روحا سب کچھ بھول گئی۔

”روحا..... ماما کومہ میں چلی گئی ہیں..... ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے، ڈاکٹر زکھہ رہے ہیں وہ اس حالت میں دس سال بھی جی سکتی ہیں اور دس منٹ میں ان کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا..... لیکن روحا..... مجھے تو یہ پتا ہے ماما اب کومے میں چلی گئی ہیں وہی واپس آئیں گی۔“ یہ کہتے ہوئے فرزان کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ روحا کے لیے یہ خبر کسی شک سے کم نہیں تھی۔

”تم ماما کو معاف کرو ماما روحا، کومہ میں جانے سے پہلے ماما نے اشارتاً مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا شاید وہ تم سے ملنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے کیے پہ نادم نہیں۔ تم سن رہی ہو ناں روحا..... تم ماما کو معاف کر دو گی ناں.....؟“ روحا کا دل مٹھی میں بند ہونے لگا، اسے لگا جیسے ایک پل اور وہ خاموش رہی تو اس کا دل پھٹ جائے گا وہ پہلے ہی دگر فٹہ تھی۔ اس خبر نے اسے اور بھی زور درنج کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر دونوں کے مابین خاموشی رہی پھر فرزان نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھال کر بولا۔

”ہاں..... تم سناؤ، کیسے فون کیا تھا.....؟“ وہ اب بھی بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔

”میں نے ایک خبر سنانے کے لیے فون کیا تھا تمہیں.....“ روحا کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

”کیسی خبر.....؟“ فرزان پریشان سا ہوا۔

”تم باپ بننے والے ہو فرزان.....“ یہ کہتے ہوئے روحا کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے اس نے دونوں ہونٹوں کو باہم پیوست کر لیا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم روحا.....؟“ فرزان کو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا۔ ایک ننھی سی خوشی کی لہر اس کے من میں گد گدائی تھی۔

”ریلی.....!“ وہ سچائی کی تصدیق کر رہا تھا۔ روحا کا دل چاہا کہ چیخیں مار مار کر روئے۔ فرزان سے پوچھے کہ اس نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔

فرزان ہیلو ہیلو کہتا رہا، روحا نے فون بند کر دیا اور سکے لگی۔

فرزان کے لیے یہ خوشی بہت بڑی تھی لیکن قدرت نے کیسے وقت پہ اسے یہ نوید سنائی تھی۔ اس نے تاسف سے اسپتال کے کارڈور میں کھڑے ہو کر آئی سی یو کی طرف دیکھا اور سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

اتفاق کی بات تھی آج شام ہی ثنا کا فون بھی آ گیا۔ وہ فرزان کو بہت مس کر رہی تھی۔ فرزان نے اسے ماما کے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔ اس کے باوجود وہ بضد تھی کہ وہ جلد از جلد اس سے آکر ملے۔

”میں ان حالات میں ماما کو چھوڑ کر نہیں آسکتا ثنا، تمہیں معلوم بھی ہے کہ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں وہ کومہ میں چلی گئی ہیں فرزان..... تم دن رات بھی ان کے سرہانے بیٹھے رہے تب بھی وہ جب ٹھیک ہوں گی جب خدا چاہے گا اور ان کا واپس ہوش میں آنا کوئی معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔“ کتنی خود غرض لگ رہی تھی اس وقت ثنا سے۔ وہ کچھ چڑسا گیا۔

”میں جانتا ہوں یہ سب کچھ مگر فی الوقت میری ساری فیملی ڈسٹرب ہے۔ میں ان لوگوں کو یہ احساس نہیں دلانا چاہتا کہ اس کھن وقت میں، میں نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا اور پھر..... روحا کو دیکھو، وہ تو ایک دن بھی مجھے بلانے پر مصر نہیں ہوئی اور تم ہو کہ بضد ہو کہ میں ابھی چلا

آؤں۔“ روحا کی مثال دیے جانے پر ثنا چڑ گئی، چیخ کر بولی۔

”تم اپنی بیوی کی مثال نہ ہی دو تو بہتر ہے کیونکہ اسے تو تمہارے بغیر رہنے کی عادت ہے اور یہ عادت تم نے اسے خود ڈال رکھی ہے لیکن میں تو تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ وہ کچھ ٹھنک کر بولی۔ ”آئی مس یو فرزان.....“

”جانتا ہوں میں.....!“ فرزان خفیف سا مسکرایا۔ وہ کیسے ثنا کی سنگت کو فراموش کر سکتا تھا۔ جب سب نے اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا تب ثنا ہی تو تھی جو اس کے قریب تھی اگر ثنا نہ ہوتی تو شاید وہ پاگل ہو چکا ہوتا۔

”میں نے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے فرزان۔ تم صرف ایک دن کے لیے میرے پاس آ جاؤ، صرف ایک دن کے لیے۔“ ایسی کون سی بات تھی جو ثنا صرف ایک دن کے لیے اسے بلا رہی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں کل صبح ہی کوشش کرتا ہوں آنے کی۔“ فرزان کو مجبوراً وعدہ کرنا پڑا۔ جو کچھ ثنائے فرزان کو بتایا، فرزان سن کر دم بخود سا رہ گیا۔ فرزان کے آنے سے قبل ثنا کو لگ رہا تھا کہ فرزان یہ خبر سن کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا لیکن بجائے خوش ہونے کے تفکر کی لکیریں فرزان کے چہرے پر نمایاں تھیں۔

”کیا ہوا فرزان..... تمہیں خوشی نہیں ہوئی..... کتنی بڑی اور انوکھی خوشی دی ہے میں نے تمہیں..... وہ خوشی جو تمہاری بیوی تمہیں چار سالہ رفاقت میں بھی نہیں دے سکی تھی..... وہ اعزاز قدرت نے مجھے بخش دیا۔ اب تو فرزان تمہارے پاس یا قاعدہ جواز بھی ہوگا..... اولاد کا جواز، اولاد کی وجہ سے تمہیں دوسری شادی کرنا پڑی۔ وارث کی ضرورت تھی تمہیں بھی تم نے ایسا کیا۔ دنیا کا کوئی قانون اب تمہیں مجھ سے علیحدہ نہیں کر سکتا فرزان۔“ ثنا جتنا بول رہی تھی فرزان اتنا ہی خاموش تھا۔ وہ جس قدر خوش تھی..... فرزان اتنا ہی گولمگول کی حالت میں تھا۔

”تم خوش نہیں ہو فرزان.....؟“ ثنا کو اچانک

احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہی خوش ہو رہی ہے۔ فرزان گہری سوچ سے چونکا تھا۔

”اب ہم نکاح کر لیں گے فرزان..... بس میں یہی چاہتی ہوں کہ تم جلد از جلد مجھ سے نکاح کر لو۔“ فرزان کی آنکھیں اور گہری ہو گئی۔

”ہاں، وہ تو ٹھیک ہے لیکن..... لیکن ثنا میں تم سے دوسری شادی کر بھی لوں گا تو اس کا ڈھنڈورا تو نہیں پیٹ سکوں گا۔ وہ تو سیکریٹ ہی رہے گی۔“

”اب سیکریٹ رکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ اب تمہیں جواز مل گیا ہے ناں، تم اپنے بچے کی خاطر اپنے رشتے کو منظر عام پر لاؤ گے۔“ ثنا مصر تھی، فرزان زچ ہو گیا۔

”تم سمجھ نہیں رہی ہو ثنا۔ اس طرح ہمارے مسائل میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔ تمہیں یہ ختم کرانا ہوگا۔“ ”کک..... کیا۔“ ثنا کو کرنٹ سا لگا اور وہ فرزان سے دور ہو گئی۔

”آگئے ناں اپنے اسی عامیانہ پن پر..... جانتی تھی میں اس بات کو اس لیے میں نے خود ہی اس کا پرچار کر دیا، خود بتا کر آئی ہوں میں تمہاری بیوی کو۔“ ”کیا.....؟“ فرزان کے سر پر بم پھٹا۔

”ہاں، میں نے خود بتایا ہے تمہاری بیوی کو کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

”یہ تم نے کیا کیا..... ثنا؟“ فرزان کا پچھتاوا سارے چہرے پر پھیل گیا۔ ”تم تو مجھے بار بار یہ سبق دیتی رہی ہو کہ روحا کا اعتماد خراب نہ ہو ورنہ میں کچھ حاصل نہیں کر سکوں گا اور اب جبکہ میں وہیں کا وہیں تھا، تم نے خود ہی سارا پول کھول دیا۔ ابھی تو کچھ ہاتھ میں بھی نہیں آیا تھا اور تم نے سارا گیم ہی خراب کر دیا۔“

”اب کیا ہاتھ میں آنا باقی رہ گیا تھا فرزان.....؟“ سب کچھ تو وہ تمہارے سر تمہیں سوئپ چکے ہیں۔“ ثنا اپنی معلومات اس پر ظاہر کر رہی تھی۔

”سوئپ چکے ہیں تو لے بھی سکتے ہیں۔“ وہ چڑ سا گیا تھا۔

”کیسے.....؟“ ثنا استہزاء سے مسکرائی تھی۔

پھنسا ہوا تھا۔ شانے اس کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

”میں اچھی طرح سے جانتی ہوں..... جو کچھ تمہیں مل چکا ہے اس سے زیادہ اب تمہیں نہیں ملے گا۔ ایک طرح سے روحا سے تم جو کچھ بھی وصول کر چکے ہو اب مجھے اس میں سے حصہ لینا ہے اور وہ تمہیں مجھے دینا پڑے گا۔“

”کیا کہوں گا میں روحا کو..... اور اب میرا ہے ہی کیا کس منہ سے جاؤں گا میں وہاں.....“

”یہ کیا تم نے بزدلوں کی طرح رٹ لگا رکھی ہے، کس منہ سے جاؤں گا، کس منہ سے جاؤں گا۔ اسی منہ سے جاؤ اور کس منہ سے جاؤ گے۔ شوہر ہو تم اس کے ڈریکوں رہے ہو.....“

”ڈر نہیں رہا، غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے، وہ میرے باپ کے گھر میں نہیں رہ رہی۔ اپنے باپ کے گھر میں رہ رہی ہے۔“

”تو تمہیں ڈر ہے کہ وہ تمہیں گھر سے نکال دے گی۔“ شانے گویا اس کا مذاق اڑایا تو فرزان جھنجلا گیا۔

”میں اس بات کی نوبت ہی آنے نہیں دوں گا۔ یہیں سے واپس جا رہا ہوں ماما کے پاس.....“

”تو گویا تم اپنی بیوی کے ہاتھ میں فیصلہ تھا کر جا رہے ہو..... شروع سے ہی ایسے ہو تم..... خود کچھ کر ہی نہیں سکتے..... اب انتظار کرو گے اس کے فون کا..... اس کے رپانس کا..... پھر کوئی قدم اٹھاؤ گے.....“

شانے فرزان کے دل کی بات منہ سے کہی تو فرزان ٹھٹھک گیا۔ شاید اس کا دل بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا تھا۔

”مگر میری ایک بات یاد رکھنا فرزان! وہ تمہیں فون کر کے نہیں بلائے گی.....“

”کیوں.....؟ کیوں نہیں بلائے گی وہ مجھے۔ کیا وہ اس سچائی کی تصدیق نہیں کرے گی جو تم اسے بتا کر آئی ہو.....“

”تو گویا ابھی وہ مخمضے میں ہے..... تمہارے مطابق ابھی وہ تم سے تصدیق کرے گی تبھی اسے سچائی کا یقین آئے گا۔ تو ٹھیک ہے، چلے جاؤ اس کے پاس..... اور اسے اپنی چکنی چوپڑی باتوں سے رام کرو مگر میری بات سن

”تم نہیں سمجھ سکتیں شا، تم نہیں سمجھ سکتیں..... ابھی ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔“ شانے تیکھے چتون سے فرزان کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

”تم ان سب باتوں پر دھیان کیوں دے رہے ہو، تمہیں تو اپنے نام کا دیا جانے پر خوش ہونا چاہیے.....“

”تو کون سا انوکھا کام ہو رہا ہے یہ..... روحا بھی تو ماں بننے والی ہے۔“ فرزان غصے سے پھٹ پڑا تو شا کی سٹی گم ہو گئی۔ اس کی ساری چہک پہک یکدم ہوا ہو گئی۔

”تو گویا یہ بات بھی جو تمہیں خوش ہونے سے روک رہی تھی۔“ وہ دل ہی دل میں جل کلس کر رہ گئی۔

”ٹھیک ہے روحا کی اپنی جگہ ہے اور میری جگہ اپنی..... اب مجھے اپنے اور اپنے بچے کے تحفظ کے لیے تمہارا نام ہی نہیں، تمہاری گارنٹی کی بھی ضرورت ہے۔“

”کیسی گارنٹی.....؟“ فرزان چونکا۔

”جو جائیداد تم اپنے نام کر دیا چکے ہو۔ اس میں سے آدھی میری نام کرنا ہوگی۔“ فرزان اس کی جلد بازی پر خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا اور اسے بہلانے والے انداز میں بولا۔

”ہاں تو اس کی اتنی جلدی بھی کیا ہے، سب کچھ آہستہ آہستہ ہو جائے گا۔“

”مگر اب آہستہ آہستہ ہونے کے لیے وقت نہیں ہے کیونکہ سب کچھ تمہاری بیوی کو ہوتا چل چکا ہے۔ اس لیے مجھے فیصلہ کن موڑ چاہیے۔“

”تو یہ بیوقوفی تم نے کی ہے، میں نے نہیں.....“

فرزان زچ ہو کر چلایا۔ شا اب تک ریلیکس ہو چکی تھی۔

”بیوقوفی کسی نے بھی کی ہو۔ نقصان بیشتر تمہارا ہی ہوگا مسٹر فرزان!“ شانے دل ہی دل میں مکاری سے سوچا تھا۔

”کہیں کا نہیں چھوڑا ہے تم نے مجھے.....“ فرزان سخت برہم تھا۔ ”اتنی ہی جلدی تھی تمہیں تو کم از کم یہ بھی سوچ لیتیں..... منزل پر پہنچنے کے بعد ہم تہی دست رہ گئے تو اتنا لمبا سفر ارگاں ہی جائے گا۔ کس منہ سے جاؤں گا میں اس گھر میں..... کس طرح جھٹلاؤں گا تمہاری سب باتوں کو۔ کس طرح ہوگا سب کچھ؟“ فرزان بری طرح

لو..... تم یہاں سے تب تک نہیں جاؤ گے جب تک تم مجھ سے نکاح نہیں کر لیتے.....“ ثنا کے دو ٹوک فیصلے پر فرزان چکرا ہی تو گیا تھا۔

”دیکھو ثنا..... میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے پھر بھی تمہیں بہت ہی جلدی ہے..... تو تمہیں وہی کرنا ہوگا جیسا میں چاہوں گا۔“ ثنا نے غرا کر فرزان کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔
”میں خود کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“

”تو ٹھیک ہے سوچ لو.....“ فرزان یکسر بے پروا ہو گیا۔

”یہ تم بہت برا کر رہے ہو..... بہت نقصان اٹھاؤ گے تم.....“ ثنا نے فرزان کو دھمکی دی۔

”جتنا نقصان تم میرا کر چکی ہو اب اس سے زیادہ نہیں کر سکتیں۔ روحا کو پتا چل گیا اور اب اس سے زیادہ تم میرا کیا بگاڑو گی۔ اس لیے جیسا میں کہتا ہوں تمہیں وہی کرنا ہوگا کیونکہ بلیک میل ہونے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے جبکہ جلد بازی میں کلہاڑی تم نے اپنے پاؤں پر ماری ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تم سے نکاح کروں تو تم اسے فوراً ختم کراؤ۔“

”میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں فرزان کہ اسے ختم کرا دوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے دونوں ہاتھوں میں لٹور رکھے ہوئے ہیں، سر کڑھائی میں اور انگلیاں گھی میں۔ تمہارے تو وارے نیارے اور میں اس کراپے کے فلیٹ میں ساری عمر تمہیں روحا سے چالیں چلنے کی ترغیبیں بتاتی رہوں..... پاگل نہیں ہوں میں کہ تم اولاد تو روحا سے پیدا کرو گے اور تھکن مجھ سے اتار دو گے۔“

”کیا ہوا، کیا سوچنے لگی ہو.....؟“ فرزان نے اسے گم صم پا کر پوچھا تو وہ بھڑک گئی۔

”مجھے بے وقوف مت بناؤ فرزان..... دراصل حقیقت تو یہ ہے کہ تم مجھ سے نکاح ہی نہیں کرنا چاہتے اگر تم مجھے اپنانے کے لیے مخلص ہوتے تو کبھی اس بچے کو ضائع کرانے کا نہ کہتے..... اب تمہاری نیت میں کھوٹ آ گیا ہے۔ تم نے دوستی کے نام پر مجھے صرف استعمال کیا ہے اور بس.....“ یہ کہہ کر شارو پڑی۔ فرزان چکرا ہی تو گیا۔ اس

سے ہمدردی کرنے لگا۔

”دیکھو ثنا، میں تمہیں ایسا ہرگز نہ کہتا..... اگر تم روحا کے پاس جانے کی بیوقوفی نہ کرتیں، اب تم نے روحا کو سب کچھ بتا کر حالات خود بگاڑ دیے ہیں..... مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا..... کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔ کیا میں روحا کو تم سے زیادہ جاننے لگا تھا..... پھر کیوں کی تم نے یہ جلد بازی..... اب اگر ہمیں ساتھ چلنا ہے تو سنبھل کر چلنا ہوگا۔“ فرزان صرف اسے بہلاوے دے رہا تھا۔

اسے پہلے ہی لگ رہا تھا کہ فرزان بدلتا جا رہا ہے، اس کا جھکاؤ روحا کی طرف بڑھتا جا رہا تھا وہ روحا کو ہی وقت دینے لگا تھا۔ اب اس نے روحا کی برائیاں کرنا بھی کم کر دی تھیں..... نہ جانے کیوں اسے جیسی ہونے لگی تھی..... اسے یوں لگنے لگا تھا کہ روحا ان کے بیچ میں آرہی ہے..... جبکہ وہ خود فرزان اور روحا کے بیچ میں آئی تھی۔ یہ جیسی بڑھتے بڑھتے یکدم بہت بڑھ گئی اور فرزان کی غیر موجودگی میں وہ روحا کے سامنے بھانڈا پھوڑنے چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس امر سے ان دونوں میاں بیوی میں علیحدگی ہو جائے گی اور فرزان باپ بننے کی خوشی میں اسے اپنا لے گا۔ تب وہ فرزان کے دل پر ہی کیا دولت پر بھی راج کرے گی لیکن یہ کیا..... ہوا وہ روحا منحوس بھی ماں بن گئی تھی۔ کب سے چل رہا تھا یہ چکر..... اسے پتا ہی نہ چلا..... اب تو اس کے پاس کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ فرزان کو جیت لیتی..... اب تو وہ فرزان کو بلیک میل بھی نہیں کر سکتی تھی..... اگر روحا کو نہ پتا چلتا تو شاید فرزان ڈرتا رہتا لیکن اب یہ ڈر بھی سامنے آ گیا تھا۔ اب تو کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ فرزان اسے سوچنے کا موقع دے کر جا چکا تھا اور وہ اپنی سوچوں کے گرداب میں خود ہی پھنستی جا رہی تھی۔

”واقعی اس کے پاس تو کوئی ہتھیار ہی نہیں ہے..... کچھ بھی تو نہیں ہے اس کے پاس۔ اب فرزان نہیں وہ تہی دست رہ جائے گی۔ فرزان اسے مکھن میں سے بال کی طرح نکال دے گا۔“ یہ سوچتے سوچتے اسے خود پر ہنسی آ گئی اور پھر وہ پاگلوں کی طرح تمبھے لگانے لگی۔

لیے کہ خود میری اپنی مرضی شامل تھی اس گھناؤنے فعل میں..... کیسے..... کیسے میری مرضی شامل ہوگئی تھی..... وہ بارہا خود کا احتساب کر چکی تھی..... اس کا ضمیر چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

”پہلی بار جب وہ لٹی تھی تو وہ نادان تھی معصوم تھی..... لیکن اب کی بار اسے سب کچھ پتا تھا۔ وہ خود کو بچا سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا..... اب اس نے یہ جرم خود کیا تھا۔ اس کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی تھی، اب اسے حلال اور حرام کی تمیز ہی نہیں رہی تھی۔“

”نہیں.....“ زین نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ ضمیر گواہی دے رہا تھا۔

”ہاں ایسا ہی ہے..... وگرنہ یہ نوبت ہی نہ آتی۔ تمہارا لباس جو ہر دم ہر آنکھ کے لیے دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ کیوں کوئی اپنی بڑھتی ہوئی اشتہا تم پر نہیں مٹائے گا۔“

”نہیں..... میں نے ایسا خود کچھ نہیں کیا.....“ وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”مھنڈ ڈھونگ ہے یہ..... اگر تم پارسا ہو تیں تو یہاں تک ہی کیوں آتیں.....؟“ اس کا ضمیر اسے کوڑے مار رہا تھا۔

”ہاں تم صحیح ہو۔“ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

”پکڑ لینا اب اپنے مجرم کو..... تب تو تم مظلوم بھی تھیں اور کمزور بھی۔ تمہاری سنوائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب تو تم اپنے لیے سب کچھ کر سکتی ہو۔ نوچ سکتی ہو اس کا چہرہ، میڈیا کی مدد کی ہی ضرورت بھی ناں تمہیں، اب لے لینا میڈیا کی مدد۔ راتوں رات مشہور بھی ہو جاؤ گی اور مجرم بھی پکڑا جائے گا۔“ ضمیر اس پر ہنس رہا تھا۔

”میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں..... میں اپنی بدنامی اپنے ہی ہاتھوں سے کیسے پھیل سکتی ہوں۔ ہاں، میں اس جرم میں برابر کی گناہ گار ہوں۔ میں گناہ گار ہی تو تھی تبھی تو یہاں تک آئی۔ میں کس ہوس اور کس لالچ میں یہاں تک آئی تھی..... کیوں آئی تھی میں یہاں تک..... بار بار درندوں کی بھوک کا نشانہ بننے کے لیے۔ یہ عزت کما رہی ہوں میں..... داوی ٹھیک کہتی تھیں جب انسان خود ہی حلال اور حرام کی تمیز بھول جائے..... تو اللہ کا رحم اور فضل

”یہ کیسے سوچ لیا فرزان نے کہ وہ مجھے مکھن میں سے بال کی طرح نکال دے گا۔ میں نے روحا کو بتایا ہے اس کے باپ کو نہیں.....“ یہ خیال آتے ہی ثنا پھر قہقہے لگانے لگی۔

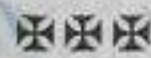
”میں جانتی ہوں، روحا باپ پر جان چھڑکتی ہے اور وہ بڑھا تو بس گنتی کی ہی سانسیں گن رہا ہے۔ روحا ہرگز نہیں چاہے گی کہ اس سچائی کا اس کے باپ کو پتا چلے..... تبھی تو وہ مجھے اپنے گھر سے دفعتاً ہونے کا کہہ رہی تھی۔ مزہ تو اب آئے گا کمائی کرنے میں..... فرزان ہی نہیں، روحا بھی بلیک میل ہوگی اور بہت ہی اچھے طریقے سے.....“ یہ خیال آتے ہی ثنا کہ اعصاب بالکل ریلیکس ہو گئے۔



اس کے اندر اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ روحا کا سامنا کر پاتا۔ بھی وہ روحا سے ملے بغیر واپس آ گیا۔ یہاں حالات اور بھی ناگفتہ تھے..... ماما کی حالت بدترین ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی سننے کو ملی کہ غیور احمد کا انتقال ہو چکا ہے۔

غیور احمد کی تلاش نے ایک نئے زخم کو کرید ڈالا تھا۔ اب تک تو وہ سب بہن بھائی یہی سمجھ رہے تھے کہ غیور ماں سے ایسا ناراض ہو کر نکلا ہے کہ گھر واپس نہیں آیا۔

لیکن جب ارشاد کی حالت زندہ زندوں میں رہی اور نہ مردوں میں تب بہنوں نے بھائی کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور روز اخبار میں اشتہار دیا۔ تب معلوم ہوا کہ اس کے بیوی بچے کس سمپری میں زندگی گزار رہے تھے اور وہ تو گھر سے نکلنے کے چھ ماہ بعد ہی روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ یہ صدمہ سب بہن بھائیوں کے لیے بہت جان لیوا تھا۔ فرزان بھی گہر و جوان بھائی کی موت پر شاکدہ رہ گیا تھا۔



”یہ کیسے ہو گیا..... جہانزیب نے میرے ساتھ..... مگر میں نادان تو نہیں تھی..... کیوں قریب آنے دیا میں نے جہانزیب کو اپنے..... میں اپنے دفاع میں سب کچھ کر سکتی تھی مگر میں نے دفاع کیوں نہیں کیا۔ اس

بہت جان لیوا ہو رہا ہے۔“

”جہانزیب کہہ رہا تھا، اسکرپٹ ریہرسل کی ضرورت نہیں ہے یہاں صرف مناظر شوٹ کرنے ہیں..... اور وہ اس سلسلے میں آیا ہوا ہے..... یہ کام ہو جائے گا تو واپسی کی تیاری کرنی ہے۔“

فون بند کرنے کے بعد یاسمین شیرازی، زمین کو اطلاع دے رہی تھی۔ زمین حق دق سی بیٹھی تھی..... کتنی سہولت سے اس نے رات کی صفائی پیش کی تھی..... کیا اس طرح اس نے اپنی عزت بچالی تھی۔ کیا اسے یقین تھا کہ زیب اس کا راز فاش نہیں کرے گی۔

”چلو زیب..... پھر تم بھی پیکنگ وغیرہ کرلو..... کام تو اب ختم ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ شاپنگ وغیرہ میں وقت لگائیں..... اگر تمہیں بھی شاپنگ کرنی ہو تو ہمارے ساتھ چل لینا.....“ میڈم شیرازی پھر فون پر مصروف دکھائی دے رہی تھیں۔

❖❖❖

روحا کی فون کال دیکھ کر فرزان کا دل یکبارگی دھڑکا۔ نہ جانے روحا اب کیا کہے گی..... لیکن جو کچھ روحا نے کہا۔ فرزان کی سانسیں ہموار ہو گئیں۔

”میں ڈیڈی کے ہمراہ عمرے کی سعادت سے سرفراز ہونے کے لیے جا رہی ہوں فرزان، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”ممممم مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے! فرزان جو بحرمانہ حالت میں تھا، گڑبڑا سا گیا۔

”اور..... تم..... تم ٹھیک تو ہونا..... روحا..... اپنا خیال رکھنا۔“ روحا نے سنی ان سنی کردی اور کہنے لگی۔

”ماما کی طبیعت کیسی ہے؟“ فرزان کو وہ خود سے بہت دور اور اجنبی محسوس ہوئی۔

”ماما کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ ہو سکے تو تم ان کے لیے دعا کرنا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مشکل آسان کر دے۔“

”کیا مطلب.....؟“ روحا چونکی۔

”وہ بہت تکلیف میں ہیں روحا۔ ایسی تکلیف جو ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ صرف نفس چل رہا ہے ان کا اور بس.....“ یہ کہتے ہوئے فرزان کا چہرہ کرب سے لال

رہی اس پر سے اٹھ جاتا ہے اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میں جہانزیب کو بے نقاب بھی کر دوں گی تو کیا۔ میری کھوئی ہوئی عزت تو نہیں آجائے گی اور میرے پاس عزت بھی ہی کہاں..... عزت ہوتی تو میں یہاں ہوتی..... اس سے تو بہتر ہوتا کہ میں میم کے ساتھ چلی جاتی..... ہاں، وہ مجھے بیچ دیتیں اور میں بک جاتی..... تب مجھے پتا تو ہوتا کہ میں اپنی مرضی سے دھندا کرنے لگی ہوں..... ہاں میں دھندا ہی تو کر رہی ہوں.....“ اسے خود سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

❖❖❖

”شدید دھندا اور برف باری کی وجہ سے لگتا ہے آج شوٹنگ نہیں ہو سکتی۔ دو دن تک موسم ایسا ہی رہے گا۔ دو دن تو یونہی ضائع ہو جائیں گے۔“ میڈم یاسمین شیرازی فون پر بات کرتے ہوئے زمین کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

”یہ کیا، لندن میں بس اتنی ہی شوٹنگ تھی۔ باقی مانچسٹر میں ہوگی۔ مجھے یہ پروگرام بہر حال جہانزیب نے نہیں دیا۔ میں اس سے معلوم کرنی ہوں.....“ یاسمین شیرازی نے فون بند کر دیا۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے اب زیب.....؟“ اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ فون پر نمبرز ملانے میں مصروف تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں میم.....“ وہ پڑمزوہ دکھائی دے رہی تھی۔

”ہاں، جہانزیب تم نے بتایا نہیں اور غائب بھی ہو گئے۔ میں صبح سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔“

”کیا..... تم کل رات سے مانچسٹر میں بیٹھے ہو.....“

تو کم از کم مجھے بتاؤ دیتے..... ہاں..... ہاں ٹھیک ہے۔ ہم لوگ فنکشن میں گئے ہوئے تھے لیکن باقی کچھ لوگ تو تھے یہاں، زیب وغیرہ..... تم انہیں ہی بتا دیتے..... تمہاری کسی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی..... اپنی دے..... زیب

سو رہی ہوگی..... ویسے وہ ہمارے ساتھ گئی نہیں تھی..... طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس کی..... پھر ٹیم کو انفارم کروں، تیاری بھی کرنی ہے..... ویسے ہی یہاں لندن میں موسم

بہت ڈسٹرب ہیں۔“ عماد الدین نے گہری سرد آہ کھینچی پھر آہستگی سے بولے۔

”اللہ تعالیٰ ان کی مشکل آسان کرے..... لیکن روحا بیٹی..... دنیا مکافاتِ عمل کا نام ہے۔“ وہ گہرے دکھ اور افسوس سے کہہ رہے تھے۔ اس بات کی تصدیق روحا کا دل بھی کر رہا تھا۔ وہ لوگ ایک ماہ کے ویزے پر گئے تھے اور ابھی انہیں آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ یہ خبر سننے کو ملی کہ فرزان کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر خود فرزان نے دی تھی۔ وہ بہت رنجیدہ تھا، یہ خبر سن کر روحا خود گم صم سی ہو گئی تھی۔

”تم اللہ کے گھر میں ہو روحا اور اللہ کے نزدیک بھی۔ ماما کی مغفرت کی دعا کرنا۔ انہوں نے آخری وقت بہت تکلیف میں گزارا ہے۔“

اس کے بعد فرزان کا فون گا ہے بگا ہے آتا رہا۔ وہ بہت بے قرار تھا، بار بار روحا سے یہی کہتا تھا کہ ہو سکے تو وہ ماما کو معاف کر دے۔ وہ صدماتی حالت میں تھا۔ روحا اسے کیا کہہ سکتی تھی۔

”موت تو برحق ہے فرزان..... کوئی سزا تو نہیں کہ جو انسان دنیا میں غلط ہوں گے موت صرف انہیں ہی آئے گی۔ موت تو ویلیوں اور پیغمبروں کو بھی آئی ہے..... اور یہی اللہ کا نظام ہے۔ تم ایسا بار بار کیوں کہہ رہے ہو کہ میں تمہاری ماما کو معاف کر دوں۔ میں نے انہیں معاف کر دیا تھا اور اب بھی کر رہی ہوں لیکن مجھے یہ بتاؤ میں کوئی فرشتہ یا ولی تو نہیں جس کی بددعا سے تمہاری ماما نے اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔“

”میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا روحا.....!“ فرزان شرمندہ ہو گیا۔

”یہ صرف تمہاری... گلٹ ہے فرزان..... یہ معاملات اللہ رب العزت ہی بہتر جانتے ہیں۔“

”ہاں روحا شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... شاید میں گلٹی فیل..... ماما کے بجائے خود اپنے کردار میں کر رہا ہوں.....“ ثنائے تمہیں جو کچھ بھی بتایا روحا، وہ سب سچ تو تھا لیکن صرف اتنا کہ ثنائے میری زندگی میں تمہارے بعد آئی

”اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے اور وہ ہمیشہ ہمارے لیے اچھا ہی کرتا رہا ہے۔“ روحا کے لفظوں میں نہ جانے کیا تھا کہ فرزان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”میں ان کے لیے دعا کروں گی۔“

”اور میرے لیے بھی دعا کرنا۔“ فرزان تیزی سے بولا تو روحا چپ سی ہو گئی۔

”تم نے پوچھا نہیں کون سی دعا.....؟“ فرزان اپنی نجالت چھپا رہا تھا۔

”میں بھلا ولی ہوں جو میری دعائیں مستجاب ہوں گی۔ میں تو خود گنہگار ہوں۔“ روحا کا لہجہ بوجھل تھا، خفت کے مارے فرزان سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

”جو سکون خوشی اور طمانیت یہاں آ کر میسر آتا ہے دنیا میں کہیں بھی گیا کہیں یہ لطف اور قرار نہ ملا..... ایک بات پوچھوں روحا بیٹی..... یہ اچانک تمہیں اللہ کے گھر آنے کا شوق کیوں ہوا..... حالانکہ تم تو ٹورنٹو جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں ناں پھر تم نے ایسا سر پر اٹھ دیا کہ مجھے بھی پتا نہ چلا کہ ہم لوگ عمرے کی سعادت سے سرفراز ہونے جا رہے ہیں اور سارے... انتظام بالا ہی بالا طے کر لیے..... کم از کم فرزان سے تو مل لیتیں۔“ فرزان کے نام پر اس کے دل میں پھانس سی چھپی تھی..... کیا بتاتی کہ فرزان نے ایسا زخم دیا ہے کہ اس زخم پر مرہم لینے وہ رب کی چوکھٹ پر گر گڑا نے آئی ہے۔

”فرزان اپنی ماں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا ڈیڈی اور پھر کیا فرزان مجھے یہاں آنے سے منع کرتے.....؟“

”ہیں..... میں نے ایسا تو نہیں کہا..... لیکن اس سے پوچھنا تمہارے لیے اچھا ہی تھا۔“

”میری فون پر بات ہوئی تھی فرزان سے، میں نے انہیں بتایا تھا۔“

”اس کے باوجود فرزان نے تمہیں فون نہیں کیا.....“

”میں نے بتایا ناں ڈیڈی وہ اپنی ماما کی وجہ سے

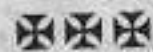
تھی..... لیکن اب..... وہ میری زندگی میں شامل بھی رہے گی..... ایسا نہیں ہوگا۔ میں ثنا کو اپنی زندگی سے نکال چکا ہوں روحاً۔ تم اس بددیانتی کی مجھے خود سزا دے لینا۔ وہ سزا اس سے کم ہوگی جو اللہ کی ناراضی کا سبب بن جاتی ہے۔“
روحاً کو فرزان کی گفتگو پر دکھ ہو رہا تھا۔

”میں تو بس اتنا جانتا ہوں جو اللہ اور بندے کے معاملات ہوتے ہیں، اللہ انہیں تو معاف کر دیتا ہے لیکن جو بندے بندوں پر ظلم و زیادتی یا بددیانتی کرتے ہیں وہ اللہ بھی معاف نہیں کرتا۔“ روحاً کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

ماں کی اچانک بیماری اور موت نے فرزان کو ایک سبق ضرور دیا تھا اور وہ یہ کہ دنیا مکافات عمل کا نام ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنے کردار کی بددیانتی سے خود ہی خوف آ گیا تھا جبکہ روحاً نے تو احتساب بھی نہیں کیا تھا اور وہ خود ہی سارے جرم قبول کر رہا تھا۔ سچائی اور ایمانداری سے..... آنے والی زندگی کا تحفظ دے رہا تھا۔

”دیکھو فرزان، میں یہاں بیٹھ کر تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی، میں تم سے یہی گزارش کروں گی..... اب یا آئندہ ڈیڈی پر بھی یہ معاملات نہ کھلیں..... تمہارے ماں باپ کے بعد تمہارے بہن بھائی تو ہیں..... میرا ڈیڈی کے سوا کوئی نہیں ہے.....“ یہ کہتے ہوئے روحاً کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

فرزان اپنے جرم کا اقرار کر کے خود کو اور بھی بڑا مجرم محسوس کر رہا تھا..... روحاً نے کتنے احسان کیے تھے اس پر۔ اس کے جرم کی کوئی سزا نہ دے کر اس پر ایک اور بڑا احسان کر دیا تھا۔ یکدم کتنی عظیم ہو گئی تھی وہ اور وہ کتنا گھٹیا اور کمتر... آج اس نے دل سے عہد کیا تھا کہ وہ ہر حال میں ثنا سے پیچھا چھڑائے گا اور روحاً کو مکمل گریہ ستی کا سکون اور تحفظ عطا کرے گا۔ یہی سوچ اس کی باقی ماندہ زندگی کی خوشیوں کی ضامن ہوگی۔



وہ اللہ کو بھول گیا تھا اور جو اللہ کو بھول جاتا ہے، اللہ بھی اسے بھلا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ بچگانہ نمازی علی زمان..... جب ہر کامیابی اور ناکامی کو پیروں، فقیروں سے مشروط کرنے لگا تو اس نے صرف ناکامی ہی دیکھی..... وہ جتنا ناکام ہوتا گیا اتنا ہی اس دلدل میں دھنستا گیا۔ شاید ان ناکامیوں سے پروردگار اسے سبق سکھا رہا تھا۔ سیدھے راستے پر چلنے کا سبق لیکن وہ اس سبق کو بھول کر نئے سبق یاد کرنے میں لگ گیا۔ گویا مشیت ایزدی سے منکر ہونے لگا تھا۔

نمازیں تو دور کی بات وہ اپنا دین ہی بھول گیا تھا پھر کیوں نہ منہ کے بل گرتا..... جب گرا..... تب بھی نہ سنبھلا اور انتقام کی آگ لے کر سر پٹ دوڑنے لگا۔ وہ یہ کیوں بھول گیا تھا جو کچھ بھی کائنات میں ہو رہا ہے وہ رب کائنات کی مرضی سے ہو رہا ہے پھر اس نے اپنی مرضی کو اللہ کی رضا میں کیوں شامل نہ کیا اور یکے بعد دیگرے ان معبودوں کو قتل کرنے پر تل گیا..... جن کے پیچھے اس نے اپنے حقیقی معبود کو بھلا دیا تھا۔ اس آزمائش میں ایک بار بھی اس نے اپنے رب سے مدد نہیں مانگی اور سارے فیصلے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ پیری والے بابا کو قتل کر کے تو وہ بھاگ گیا تھا اور بچ بھی گیا تھا لیکن جب اس نے ایک اور عامل کو مارنے کی کوشش کی تو اس کے مریدوں نے علی زمان کو موقع پر ہی پکڑ لیا۔ علی زمان پاگلوں کی طرف چلا رہا تھا۔

”دھوکا ہے..... دغا ہے..... جھوٹ ہے۔“ یونہی چلاتے چلاتے لوگ اسے تھانے لے گئے، پولیس اہلکاروں نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ چند دن وہ حوالات میں پڑا رہا پھر پولیس والوں نے اسے چھوڑ دیا۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر صوفی درویش بابا پر پڑی۔

”اصل میں سارے فساد کی جڑ تو یہی جھوٹا عامل ہے۔“ سوچ سوچ کر اس کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں پھر اس نے چادر میں خود کو چھپا کر درویش بابا کے پاس جانا شروع کر دیا اور ایک روز موقع پا کر درویش بابا کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ زخم اتنا گہرا تھا کہ درویش بابا موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ جب وہ مر گیا تو وہاں کہرام مچ گیا، لوگوں نے رنگے ہاتھوں علی زمان کو پکڑ لیا۔ علی زمان درویش بابا کو مارنے کے بعد خود حیران تھا۔

”یہ درویش بابا نہیں تھا کوئی اور تھا..... مجھے تو درویش بابا کو مارنا تھا۔ مجھے چھوڑ دو میں نے اسے مارنا ہے۔“ یہاں تک کہ وہ جیل میں چلا گیا لیکن اس کا پاگل پن ختم نہ ہوا..... اس کا ہیجان بڑھتا جا رہا تھا، لگتا تھا وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اسے گھر کی، ماں، بہن کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس کے سر پر ایک ہی جنون سوار تھا، صوفی درویش بابا کو مارنے کا جنون..... اس جنون نے اس کے سارے حواس معطل کر دیے تھے..... ادھر بلقیسے کا رورو کر برا حال ہو گیا تھا، بیٹے کا کچھ پتا ہی نہ چلا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ آسیہ کی شادی کے بعد بلقیسے درباروں پر آستانوں پر بیٹے کو جا جا کر ڈھونڈنے لگی تھی..... شاید وہ کہیں بیٹھا مل جائے۔ کسی پیروں کی دعا سے مل جائے۔

اس کھوج میں بلقیسے کو علی زمان کے اصل ٹھکانے کا پتا چلا۔ وہ جیل میں تھا، برے حالات سے دوچار..... اس کی حالت دیکھ کر بلقیس ترپ اٹھی..... لیکن علی زمان پر ایسی دیوانگی غالب آ چکی تھی کہ اس نے ماں کو نہ پہچانا..... بس یہی کہتا رہتا۔

”دھوکا ہے..... جھوٹ ہے..... دعا ہے.....“ اس غم نے بلقیس کو دودھری آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ دن رات پیٹے کے لیے دعائیں مانگتی رہی اور بارگاہ الہی میں گر گزرائی رہتی..... اسے رب کی ذات سے امید تھی ایک نہ ایک دن اس کا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔



تین سال کے بعد زمین جب گاؤں آئی تو گاؤں بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا یہاں..... ہاں مگر وہ ضرور بدل گئی تھی۔ اس کے لمبے بال جدید کٹنگ میں ڈھل چکے تھے۔ چہرہ حسین تو پہلے ہی تھا لیکن بیوشنر کی ماہرانہ صلاحیتوں نے اس کے حسن کو اور بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ کپڑا بھی جدید تراش خراش کا اور قیمتی پہناوا بن گیا تھا..... اوچی ہیل میں اسے بڑے سہاؤ سے چلنا آ گیا تھا۔ بول چال میں بھی زمین آسمان کا فرق آ گیا تھا لیکن اس کا دل آج بھی اتنا ہی سادہ اور معصوم تھا جتنا وہ یہاں ہوتا تھا۔

جب اس نے اس فیلڈ کو چھوڑنے کی بات کی تھی تو

میڈم شیرازی بھونچکا رہ گئی تھیں۔ اس کے دو ٹوک فیصلے پر انہیں ہچکائی ہی نہ دیا تھا کہ اس سونے کی چڑیا کو کیسے روکیں مگر اب اس نے رکنا نہیں تھا۔ یہ راستہ اور ان راستوں سے ہو کر جانے والی منزل اس کی نہیں تھی۔

”بہت پچھتاؤ گی تم..... بالکل عروج کے وقت تم اپنا کیریئر چھوڑ کر جا رہی ہو پھر ایسا موقع اور چانس نہیں ملے گا تمہیں زیب۔ لوگ خواب دیکھتے ہیں ایسی شہرت کے اور تمہیں تو راتوں رات شہرت، دولت سبھی کچھ مل گیا ہے۔“ اتنا سب کچھ سننے کے بعد اس نے بس یہی کہا تھا۔

”یہ دنیا میرے لیے نہیں ہے میم..... میں جہاں سے آئی تھی، وہیں جا رہی ہوں۔“

”کیا.....؟ واٹ نان سینس۔ تم اب گاؤں میں جا کر رہو گی۔ اب لوگ تمہیں پہچاننے لگے ہیں۔ میڈیا تمہارا جینا حرام کر دے گا۔ کیوں لوگوں کے ہاتھ میں اپنا تماشا دے کر جا رہی ہو.....“ میڈم شیرازی اب اسے ڈرانے پر اتر آئی تھیں۔

”میڈیا میرا تماشا کیوں بنائے گا۔ میں کیا لے کر جا رہی ہوں کسی کا۔ جتنی میری کمٹمنٹ تھی میں نے وہ ساری پوری کر دی ہے اور لوگ میرا جینا حرام کیوں کریں گے۔ کیا میں عام انسان نہیں ہوں، کیا مجھے جینے کا حق نہیں ہے۔“ میڈم شیرازی جزبہ ہو کر رہ گئیں، ظاہر ہے وہ مرغی ہاتھ سے نکل رہی تھی جو سونے کے انڈے دے رہی تھی۔ اس نے میڈم شیرازی کے تیور دیکھ لیے تھے اور محسوس کر چکی تھی۔ ضرور یہ عورت اس کا اسکیٹڈل بنا کر اس کا جینا حرام کرے گی۔ تبھی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ نقاب سے چہرہ ڈھانپ لے گی اور کبھی بھی اس دنیا میں بے نقاب ہو کر نہیں آئے گی اور یہی اس کی نجات ہو سکتی تھی۔

جب اس نے گاؤں میں قدم رکھا تو اس کی نگاہیں ایک ہی شخص کو ڈھونڈ رہی تھیں جو اتنی بڑی دنیا میں صرف اس کا اپنا تھا۔ اس کے دل کو ایسا یقین کیوں تھا کہ فیکا اب بھی اس کی راہ تک رہا ہوگا۔ میم نے کہا تھا۔

”اتنے پرستاروں اور چاہنے والوں کو چھوڑ کر تم اس گنوار کے ساتھ زندگی بتاؤ گی۔“ تب اسے ان لفظوں پر

”میں اب تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں نے بہت گناہ کیے ہیں فیکے۔ میں تیری گناہ گار ہوں۔ مجھے تو اپنے ہاتھوں سے مار دے..... دادی نے تجھ سے میری شادی دھوکے میں کرائی تھی..... ملکوں نے میری عزت.....“ یہ کہہ کر زبین پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور پھر اس نے فیکے کو گاؤں سے لے کر لندن تک کی ساری کہانی سنا ڈالی..... دادی کے مرنے کا فیکے کو گہرا رنج ہوا تھا۔ سب کچھ کہہ دینے کے بعد زبین جیسے نڈھال سی ہو گئی اور بہت دیر کی خاموشی کے بعد کہنے لگی۔

”میں چاہتی تو خود کو ختم بھی کر سکتی تھی فیکے مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ کوئی طاقت تھی ایسی جس نے مجھے سب کچھ چھوڑ کر تیری طرف پلٹ آنے کو کہا اور میں سب کچھ چھوڑ کر تیرے پاس چلی آئی۔“

فیکے نے خود سال بھر قید تنہائی کاٹی تھی اور اب اسے سمجھ میں آیا تھا اسے اغوا کرانے والا کون تھا۔ وہی ملک جس نے زبین کی عزت تار تار کی تھی..... گویا وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ وہ اس سے کیا بدلہ لے گا۔ قدرت ملکوں سے احتساب کر رہی تھی، اسے پتا لگا تھا اسے اغوا کرنے والے مجرم تو بہت بڑی جیل میں چلے گئے ہیں ایسی جگہ جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ مجرم کو سزا ضرور ملتی ہے..... گاؤں سے لے کر لندن تک جو کچھ بھی ہوا اس میں معصوم زبین کا کیا قصور تھا۔ صرف اتنا کہ وہ بہت حسین بھی فیکے نے جھک کر اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھالیا۔ زبین، فیکے کے مد مقابل کھڑی تھی۔

”میں نے سنا تھا تو بہت بڑی اداکار بن گئی ہے۔ مجھے لگتا تھا تو اب کبھی واپس نہیں آئے گی..... تو بہت بلندی پر چلی گئی تھی زبین..... تو نہ بھی آتی تو کیا تھا..... مگر تو آ گئی، کیا میں سمجھوں صرف تو میرے لیے آئی ہے۔ میری محبت تجھے بھیج لائی ہے..... یا کوئی اور وجہ بھی ایسی جس نے پھر سے تجھے اور مجھے ملا دیا“ فیکے نے گہرا سوال کیا تھا اس سے۔ زبین نے نظریں نہیں چرائیں اور فیکے کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

”میں بہت مشہور ہو گئی تھی فیکے، لوگ مجھے پہچاننے لگے تھے۔ اس پہچان نے مجھے بہت تنہا کر دیا تھا۔ میں دنیا

ہنسی آئی تھی اور اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔
”میرے کتنے بھی چاہنے والے ہو جائیں مگر اس گنوار جیسا مجھے چاہنے والا ایک بھی نہیں ہوگا۔“ میڈم شیرازی نے گویا اس کے گمان کا مذاق اڑایا تھا۔
”اپنے بارے میں ساری حقیقت بتانا اسے..... تب دیکھنا اس کی چاہت کو.....“

”ہاں، میں اپنے بارے میں فیکے کو سب کچھ بتاؤں گی اور یہ بھی کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں میری نیت اور ارادہ شامل نہیں تھا۔ میں زندگی کے پیچیدوں سے نہ جانے کتنی دور چلی گئی تھی۔ ہاں میں اسے سب کچھ بتاؤں گی اور اس کا حق ہے۔ مجھے چاہے جو بھی سزا دے..... مجھے سزا دے یا اپنائے اس کی مرضی اور میری قسمت پر منحصر ہے۔ وہ میرا شوہر ہے اور میری محبت کا پہلا دعویدار..... اگر وہ مجھے نہیں بھی اپنائے گا تب بھی میں اسے سب کچھ بتا کر خود پر سے بوجھ ختم کروں گی تاکہ قیامت کے روز سرخ رو ہو سکوں۔“

وہ سوچوں کی یلغار میں بہتی گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی گلیاں عبور کرتی چلی آ رہی تھی۔ وہ یہ رائے بھولی ہی نہیں تھی تبھی تو بے دھیانی میں بھی وہیں پہنچ گئی تھی جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنے آبائی گھر کے سامنے کھڑی تھی پھر اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ اسے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ دروازہ کیوں کھلا تھا۔ وہ لوگ تو کھلا ہی چھوڑ کر گئے تھے۔

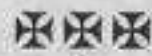
وہ اندر صحن میں داخل ہوئی تو دنگ رہ گئی۔ فیکا اندر چار پائی پر بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ کس دھیان میں تھا، اس نے دیکھا ہی نہیں برقع میں ملبوس خاتون اس کے نزدیک آ گئی ہے اور پھر اس نے سامنے جا کر نقاب پلٹ دیا۔ فیکا اچھل کر چار پائی سے کھڑا ہو گیا۔ زبین رو رہی تھی۔
”میں زبین ہوں فیکے..... تیری زبین۔“ اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ فیکے کے قدموں میں بیٹھ گئی۔
”مجھے معاف کر دے فیکے.....!“ وہ رو رہی تھی۔

فیکا جیسے ہوش میں آ گیا۔ جو کچھ بھی تھا سب حقیقت تھا۔ دھوکا نہیں تھا، اس کے چہرے پر عجیب سی چمک آئی اور گزر گئی۔

کی بھیڑ میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ میں جی رہی تھی مگر دل سے نہیں..... کس کے لیے میں اس دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔ اس پوری دنیا میں صرف تو ہی تھا میرا اپنا..... میرا سچا سا گھر ہے شاید یہ تیری محبت ہی تھی فیکے..... تیری محبت مجھے بچ لائی۔ نکل آئی میں اس دلدل سے..... جہاں سے چاہنے کے باوجود بھی کوئی نکل نہیں سکتا اور نہ صرف تیری محبت تھی اور دادی کی تربیت..... جس نے کبھی بھی مجھے اس ماحول میں خوش ہونے نہیں دیا۔ دو سال میں اس فیلڈ میں رہی لیکن میرے دل پر بوجھ ہی رہتا تھا، سب کچھ اجنبی اجنبی ہی لگتا تھا۔ میں اپنے پن کی تلاش میں واپس تیرے پاس آ گئی فیکے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ فیکے کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ آئے اور گزر گئے اور وہ زمین کو شانوں سے تھام کر بولا۔

”یہ محبت چیز ہی ایسی ہے زمین..... میں بھی تو تیری یاد میں یہاں آنگن میں ہی آکر بیٹھا کرتا تھا، بھر اور بھر جانی نے بہت کہا کہ میں دوسری شادی کر لوں پر میرا دل ہی نہ مانا۔ آخر کار انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ تجھے ملنا تھا ناں مجھ سے، اس لیے میں نے اس گھر کو تیری یادوں سے سجائے رکھا۔ اب تو آ گئی ہی تو..... تو خود اس گھر کو بسالے گی۔“

زمین نے ہنستے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس ہنسی میں اس کے اشک بھی شامل تھے۔ فیکے نے محبت سے اس کے آنسو پونچھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔



روحا کے آنگن میں یکے بعد دیگرے دو ننھے پھول کھل چکے تھے۔ ایک بیٹا ایک بیٹی..... روحا ان نعمتوں پر جتنا بھی شکر کرتی کم تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ فرزان کی محبت اور توجہ نے اسے اور بھی نکھار دیا تھا۔ ایسی گریہ ستی کا سکون جس کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی، اسے میسر آ گئی تھی۔ آج پیچھے مڑ کر دیکھتی تو اپنی جلد بازی اور غلطیوں پر ندامت بھی ہوتی تھی..... لیکن پھر اس نے اس راستے کو اختیار کیا جس سے نہ صرف اس کی مشکلات آسان ہوئیں بلکہ اسے زندگی جینے کا ڈھنگ بھی آ گیا تھا۔

جب انسان اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لے تو اس کے سارے بیڑے پار ہو جاتے ہیں۔ اس کڑے

امتحان میں اس نے سچے اور حقیقی معبود کا سہارا لیا تھا۔ اس سہارے نے نہ صرف اس کی زندگی سہل کی تھی بلکہ ان معبودوں سے بھی اسے بچا لیا تھا جو بے راہ روی اور گمراہی کے راستے پر لے جاتے ہیں۔ کمزور اور کچے عقائد ہی دراصل ہماری مشکلات اور پریشانیوں کا نتیجہ ہیں ناکہ ان کا دائمی حل۔ وہ تو ہم پرستی کا شکار نہیں تھی بھی اس گھڑے میں گرنے سے بچ گئی جو اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔ روحا نے اللہ سے مدد مانگی تو نہ صرف اللہ نے اس کے حوصلے کو بلند کیا بلکہ اسے اس خوف سے چھٹکارا بھی دلا دیا جس کا وہ بچپن سے شکار تھی۔ باپ کی جدائی کا خوف، سب کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی میراث ہے۔ انسان اس پر حق جما کر صرف وقت ضائع کرتا ہے..... ہم سے بہتر اللہ ہمارے لیے خوب جانتا ہے۔ وہ جائے نماز تہ کر کے اٹھی تو فرزان نے اسے شانوں سے تھام لیا۔

”مجھے بہت بڑی آزمائش سے نکالا ہے روحا تم نے اگر تم صبر اور برداشت سے کام نہ لیتیں تو ہماری گریہ ستی اجڑ چکی ہوتی۔ تمہیں نچا دکھانے کی ضد میں، میں ثنا کے جال میں اس قدر پھنس چکا تھا کہ مجھے نہیں لگتا تھا کہ کبھی نکل پاؤں گا اور پھر وہ ڈیڈی کو سب کچھ بتانے پر مصر ہو گئی..... تو مجھے لگتا تھا کہ ڈیڈی اس صدمے کو ایک سیکنڈ بھی سہہ نہیں پائیں گے اور تب میں تمہیں کیا منہ دکھاؤں گا۔“ روحا اس بات پر ہلکا سا مسکرائی اور کہنے لگی۔

”تم نے اس کا منہ بند کرنے کی کتنی کوشش کی، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”پھر بھی وہ باز نہیں آئی اور اس نے ڈیڈی کو بتا ہی دیا۔“ فرزان نے گہری سرد آہ کھینچی۔

روحا کہنے لگی۔ ”میں کہاں بھول سکتی ہوں وہ وقت تب مجھے لگا تھا بس اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے لیکن فرزان ڈیڈی نے ہم دونوں کو کس طرح سمجھایا تھا..... تمہیں یاد ہے۔ میں ہی کیا تم بھی حیران رہ گئے تھے۔ ایک طرح سے ثنا نے اچھا ہی کیا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتی تو آج تک مجھے بلیک میل کر رہی ہوتی۔“

”اور میں اسے کچھ بھی کہاں سے دیتا..... میں تمہاری امانت میں خیانت نہیں کر سکتا تھا۔“

”شاید ڈیڈی نے تمہارے اندر کی اسی سچائی کو پرکھ لیا تھا تبھی تو انہوں نے اس واقعے کو دل پر نہیں لیا تھا۔ تب انہوں نے کتنی اچھی بات کہی تھی۔ اپنی زندگی کو کسی ٹرین کے مانند سمجھنا یہ لڑکی فحش اسٹیشن کی طرح تمہاری زندگی میں آئی اور تم نے اسے پیچھے چھوڑ دیا۔“

”انہوں نے بالکل صحیح کہا تھا اگر ہم اس واقعے کو دل سے لگا لیتے تو آج ایک ساتھ آگے نہ آتے اور تمہیں ایک بات بتاؤں، دولت کی خاطر اس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے مگر ایسا کچھ بھی نہیں تھا اگر اس کے پاس یہ ہتھیار ہوتا تو وہ میرا پیچھا کبھی نہ چھوڑتی۔ میرے اللہ نے مجھے لاکھ لاکھ بچا لیا۔ شاید میری سچی توبہ بروقت آڑے آگئی تھی کہ میرے رب نے مجھے آزمائش سے بچا لیا۔“

فرزان نے سکون کی سانس لی پھر کرب سے بولا۔

”یہ سب کچھ ماما کے حادثے کی وجہ سے ہوا..... ماما کے حادثے نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔“ وہ کچھ دیر مغموم سا رہا پھر کہنے لگا۔ ”تمہیں یاد ہے ناں، پرسوں ماما کی برسی ہے، جمع آگیا کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم لوگ جلدی پہنچنے کی کوشش کریں تو تم پکینگ وغیرہ کر لینا، ہم وہاں کچھ دن رکیں گے۔“ روحا کچھ دیر کے لیے چپ سی ہوئی پھر کہنے لگی۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے فرزان۔ ماما کی برسی تو تم لوگ ہر سال مناتے ہی ہو لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ فرزان چونک سا گیا۔

”ماما کا جو ذاتی جمع شدہ پیسہ ہے تم اسے ماما کے ایصالِ ثواب کی مد میں کسی غریب مسکین کی مدد کے لیے کیوں خرچ نہیں کر دیتے۔“ فرزان کچھ بولنا چاہتا تھا، روحا نے بولنے سے پہلے منع کر دیا۔

”میری بات کا غلط مطلب نہ لینا فرزان..... تم ابھی طرح سے جانتے ہو کہ وہ پیسہ کیسا ہے اگر وہ تمہارے بہن بھائیوں کے پاس رہا تو فتنہ بن جائے گا اور اللہ کے فضل و کرم سے بھی صاحبِ حیثیت ہیں سوائے غیور بھائی کے بچوں کے۔“

”تمہارا مطلب ہے اس پیسے سے ان یتیم بچوں کی مدد کر دی جائے.....؟“

”ہاں بالکل اور رہ گئی شمع آپا تو ان کی ذمے داری ہم لے لیں گے۔ جب تک ان کے بچے کسی قابل نہیں ہو جاتے۔“

فرزان نے مجھب سا ہو کر روحا کی طرف دیکھا اور اسے خود سے قریب کر لیا۔ اب زندگی میں کوئی تھکن، کوئی بوجھ باقی نہیں رہا تھا۔

ختم شد